R.N.47

The Jamhoor
—ALIGARH.

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷

شاہد حق و صداقت ہیں مضامین بلند
دُرۃ التاج صحافت ہے، بیان جمہور
شاہد شروانی

سہ روزہ جمہور علی گڈھ

قیمت دو روپے
تاریخ اجراء ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۵۰ ع
یوم جمہوریت

قیمت
فی پرچہ ۲ دو آنے

مدیر اعزازی
محمد عمر خاں ثمر

صدر یار جنگ نمبر

نمبر ۲۵

۲۶ ستمبر سنہ ۱۹۵۱ ع مطابق ۲۳ ذوالحجۃ الحرام سنہ ۱۳۷۰ ھجری — بدھ

جلد ۲

نواب صدر یار جنگ بہادر ڈاکٹر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم
رئیس و بانئی کتب خانہ حبیب گنج ضلع علی گڈھ و سابق صدر الصدور مملکت حیدر آباد (دکن)
(سنہ ۱۹۴۹ ع)

ہے جہان حسن خود آرا کی تری حیرت میں
رشک صد آئینہ حسرت ہے یہ صورت تیری

حسرت شروانی

دہ روزہ جمہور علی گڑھ

صدر یار جنگ نمبر

۱۳۷۰ھ

۱۹۵۱ء

ترتیب دینے والے

محمد ریاض الرحمن خاں شروانی ایم اے

احمد عبدالشاہد خاں شروانی

قیمت
عہ
دو روپے

نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم (بعمر ۵۰ سال)

بائیں سے دائیں:—
(بہ موقعہ ورود امام الہند بہ حبیب منزل— فروری سنہ ۱۹۴۹ء)
(۱) مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی (۲) نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم
(۳) حاجی ملا احمد داؤد نواب صاحب مرحوم (۴) امام الہند مولانا
ابوالکلام آزاد (۵) چودھری محمد شعیب خاں رئیس سہاور ضلع ایٹہ
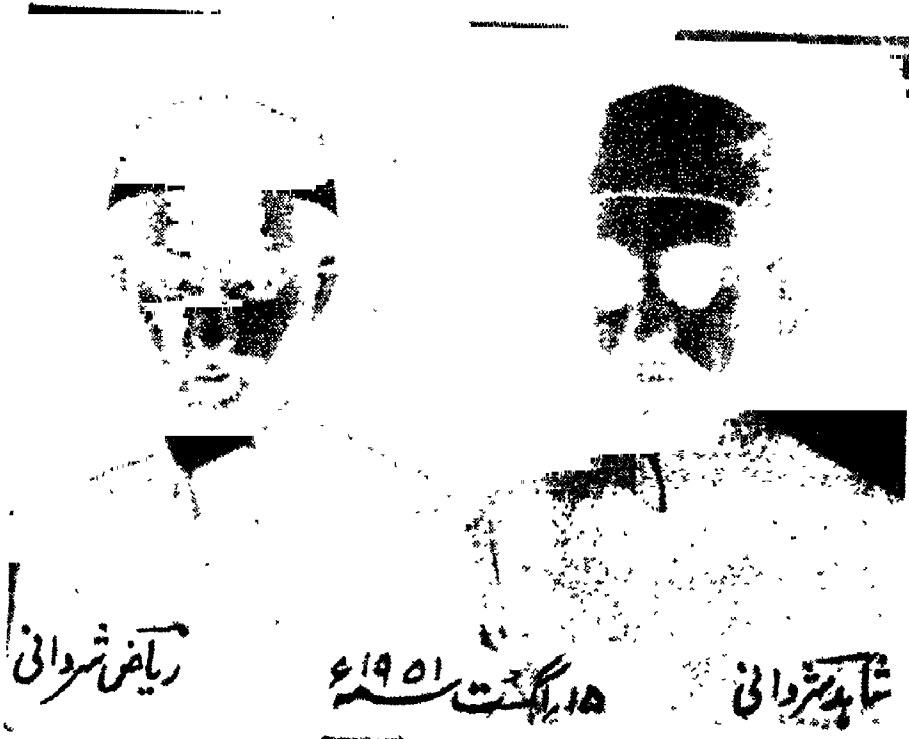
«صدر یار جنگ نمبر» کے ترتیب دینے والے

جمہور

جلد ۲ | ۲۶ ستمبر ۱۹۵۱ء | نمبر ۲۵

عظمتِ رفتہ کی آخری یادگار

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں
(اقبالؒ)

دنیا سرائے فانی ہے۔ اس میں کسی کو قرار و ثبات نہیں البتہ
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!
یکے بعد دیگرے سب تو یہاں سے کوچ کر جاتے ہیں۔
آج وہ کل ہماری باری ہے!
تو پھر کسی سے جدا ہو جانے پر ماتم سرائی اور نوحہ گری کی ضرورت کیا ہے خصوصاً جبکہ جدا ہونے والا کوئی پیر نود سالہ پیر مرد ہو جس نے کئی چمن بھی آتے جاتے دیکھے ہوں۔ مگر قوموں کی تاریخ میں "نود سالہ پیر مرد" کبھی کبھی ایسے بھی گزرے ہیں جن پر جوانوں سے زیادہ ماتم سرا ہونا پڑتا ہے۔ روز بروز زمانے کے سانچے ایسی شخصیتوں کو نہیں ڈھالا کرتے۔ مدتوں نرگس روتی اور "حیات" مستعد سر دھنتی ہے تب جا کر چمن میں کسی "دیدہ ور" اور بزمِ عشق میں "دانائے راز" کا ظہور ہوتا ہے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم بھی کچھ ایسے ہی پیر مرد تھے جنہوں نے اپنے گرد و پیش سے الگ اپنے لئے ایک نئی شاہراہ تجویز کر کے بڑی حد تک اپنی زندگی قابلِ تقلید اور لائق اتباع بنائی تھی۔ انہوں نے تقریباً پون صدی تک علمی، ادبی، تاریخی، مذہبی، اور اصلاحی خدمات انجام دی تھیں جنہیں بھلا دینا بڑی احسان ناشناسی تھی۔

میرے ساتھ مرحوم کو جو تعلقِ خاطر تھا اس کا تقاضا تھا کہ جذبۂ امتنان و تشکر کے ماتحت اپنی بساط کے مطابق کوئی یادگار قائم کروں۔ اسی خیال کے پیشِ نظر ادارۂ جمہور سے (جس نے مرحوم کی یاد کو کسی نہ کسی نوعیت سے برابر تازہ رکھا تھا) "صدر یار جنگ نمبر" نکالنے کے بارے میں سلسلہ جنبانی کی۔ ادارہ نے نہ صرف پذیرائی کی بلکہ اس نمبر کے لئے ایسی ہمت افزا باتیں بھی سنائیں جس کے لئے ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔

اس کے دو مرحلے سامنے تھے۔ ایک مستند مواد کی فراہمی، دوسرا فراہمیٔ رقم۔

پہلا مرحلہ یوں طے ہوا کہ عزیزی ریاض الرحمن خاں شروانی ایم۔ اے رفیقِ ادارہ [illegible] مرحوم سے اظہارِ خیال کیا گیا تو موصوف نے میری توقع سے زیادہ [illegible] کے پیشِ نظر پورے پورے تعاون کا یقین دلایا اور میں شکر گزار ہوں کہ آخر تک برابر ہاتھ بٹایا۔ اور تقریباً ایک ماہ تک حبیب منزل (میرس روڈ) سے ہر روز دفتر جمہور میں آتے اور ہر قسم کی معاونت کرتے رہے۔

دوسرا مرحلہ فراہمیٔ رقم کا تھا۔ اس کے لئے خاندان کے صاحبِ ثروت نوجوانوں کا اجتماع کیا جس میں نواب صاحب مرحوم کی شخصیت اور "صدر یار جنگ نمبر" کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔ شرکاء مجلس نے بڑی گرمجوشی سے عطیات کے وعدے کئے جو بڑی حد تک پورے بھی کر دئے۔ ان میں نواب رحمت اللہ خاں شروانی خلف الصدق نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب شروانی مرحوم (رئیسِ بھیکم پور) نے خصوصیت کے ساتھ بڑی دلچسپی لی۔ اس درمیان میں جب بھی اور جہاں بھی ملے "صدر یار جنگ نمبر" کا تقاضا ضرور کیا اور عطیات میں بھی اپنے والد ماجد کی طرح سب سے فائق ہی رہے۔

بڑی ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں مولوی محمد عبید الرحمن خاں صاحب شروانی ایم۔ ایل۔ اے، مولوی عبد الوحید خاں صاحب (برادر نسبتی نواب صاحب مرحوم) اور مولوی معین الدین صاحب ناظم کتب خانہ حبیب گنج کا شکریہ ادا نہ کروں۔ ان بزرگوں نے مختلف نوعیتوں سے بڑی مدد پہنچائی۔ اگر ان حضرات کا تعاون نہ ہوتا تو اپنی روز مرہ کی سیاسی، جماعتی اور معاشی مشغولیتوں کی بنا پر میں ایسا نمبر بھی نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔

اسی طرح ان تمام مضامین نگاروں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری استدعا پر ایک بار کی یاد دہانی پر اپنے وعدے پورے کر دئے۔ خصوصیت کے ساتھ آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر ترقیات صوبہ بہار کا خصوصیت سے بھی شکریہ ادا کروں کم ہے موصوف نے بے انتہا مشغولیت اور ناسازیٔ مزاج کے باوجود بستر علالت سے مضمون لکھ کر ارسال فرمایا جسے مضامین کے سلسلے میں سب سے پہلے جگہ دی جا رہی ہے۔ موصوف بار بار خطوں اور تاروں کے ذریعے تاخیر پر معذرت بھی کرتے رہے اور تھوڑا سا موقع ملنے پر کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجنے کا برابر وعدہ فرماتے رہے۔

اس موقع پر پھر اپنے ان چند گرامی قدر بزرگوں سے شکوہ بھی ہے جنہوں نے مضامین بھیجنے کا وعدہ بھی زبانی و تحریری طور پر کر لیا اور پھر یہ زحمت یاد دہانیوں پر بھی زحمتِ جواب تک گوارا نہ کی۔ یہ بے اعتنائی کم از کم ان کی شایانِ شان نہ تھی!!

مسٹر ریاض الرحمن خاں شروانی نے "پہلی نظر" کے عنوان سے مضامین مندرجہ پر تبصرہ کر کے بڑی ضروری خدمت انجام دی ہے۔ یہ تبصرہ بجائے خود ایک مستقل مضمون ہے۔

نواب صاحب مرحوم کی وفات کو ۱۶ اگست ۱۹۵۱ء کو پورا ایک سال ہوتا تھا خیال تھا کہ ۱۶ اگست ۱۹۵۱ء کو جمہور کا "صدر یار جنگ نمبر" نکال کر پہلی برسی منائی جائے جس کا اعلان بھی کر دیا گیا مگر بعض موانع ایسے رہے کہ دوسری مقررہ تاریخ ۲۶ اگست ۱۹۵۱ء پر بھی اس کے نکالنے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اب یہ وفات سے ۱۳ ماہ پانچ روز کے بعد نکل رہا ہے۔

کاغذ کی گرانی، طباعت کی دشواری اور مالی مشکلات و ناسازگار حالات کے باوجود جیسا کچھ نکل سکا وہ ناظرین کرام کے سامنے ہے۔

آخر میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نمبر کو پڑھنے کے بعد یہ نہ سمجھا جائے کہ نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم کا تعلق فرشتوں کی جماعت سے تھا اور ان میں زندگی کی کوئی کمزوری ہی نہ تھی۔ نہیں ان میں کمزوریاں تھیں اور بعض قابلِ توجہ بھی مگر حدِ اعتدال سے متجاوز نہ تھیں۔ پھر ہمارے لئے "اذکروا موتاکم بالخیر" کا بھی حکم موجود ہے۔ دوسرے یہ "صدر یار جنگ نمبر" مرحوم کی سوانح حیات نہیں ہے جس میں ہر خوبی و خرابی کا ذکر ضروری ہے۔ اس سلسلے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ خوبیاں بہت زیادہ اور خرابیاں بہت کم تھیں۔ اور وہ خوبیاں منتہائے کمال کو پہنچی ہوئیں اور خامیاں حدِ اعتدال سے غیر متجاوز۔

اس دور میں ایسی ہستیاں بھی اب کہاں پیدا ہوتی ہیں مرحوم کی وفات کے بعد ۲۶ اگست ۱۹۵۰ء کے جمہور میں "علمی دنیا کا عظیم حادثہ" کے زیرِ عنوان میں نے نوحۂ تعزیت سپردِ قلم کیا تھا اس کے آخری جملے دہرا کر یہ سطریں ختم کرتا ہوں:

آہ! آج یہ جامع الصفات ہستی ہم میں نہیں رہی، رونا اس کا نہیں ہے کہ نواب صاحب ہم میں نہیں رہے بلکہ رونا اس کا ہے کہ اب وہ دور و ماحول ہی مدت ہوئی ختم ہو چکا جس کی نواب صاحب پیداوار تھے۔

نواب صاحب کے ساتھ مشرقی تہذیب و تاریخ کا ایک باب بند ہو گیا۔ وہ سر سید کے رفیق، علامہ شبلی کے جلیس اور محسن الملک و وقار الملک کے شریکِ کار اور اس دورِ گزشتہ کی آخری یادگار تھے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

نیازمند

محمد عبد الشاہد خاں شروانی
زاویۂ علمیہ محمد علی روڈ علی گڑھ

سرِ کل معاصرین ایک ایسی ہستی
محمود زماں بہ زین و دین
چوں از وقت بہ باغِ خلد سال رحلت
[illegible] ۔ ۱۳۶۹ھ

بشاہد شروانی

خیال تھا اُن میں خانصاحب بھی تھے۔ مولوی حبیب اللہ خانصاحب کے مضمون سے نواب صاحب مرحوم کے انتظامِ ریاست اور تعلق یونیورسٹی پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز اولوالعزمی اور فراخ دلی کا پتہ چلتا ہے۔

خان بہادر شیخ عبداللہ کے ہم اس لئے سب سے زیادہ شکر گزار ہیں کہ آپ نے اس نمبر کے لئے سب سے پہلے مضمون ارسال کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اور اس طرح نواب صاحب مرحوم کا حق رفاقت ادا کیا۔ شیخ صاحب نے اپنے مضمون میں نواب صاحب مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے سرسری بحث کی ہے۔ اور کتاب خانے کے علی گڑھ منتقل کئے جانے پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ علی گڑھ منتقل ہو جانے کی صورت میں کتاب خانے کی افادیت بہت بڑھ جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کتاب خانے کی صحیح نگرانی اور حفاظت کا سوال بھی کم اہم نہیں ہے۔

مولانا اکرام اللہ خاں ندوی کا مضمون سب سے طویل ہے۔ اکرام اللہ خاں صاحب کو نواب صاحب مرحوم کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور مرحوم کی زندگی کے اتنے زیادہ پہلو اُن کے پیش نظر تھے کہ شاید ان کے لئے اس سے مختصر مضمون لکھنا ممکن بھی نہیں تھا۔ اکرام اللہ خاں صاحب نے مضمون عقیدت سے لکھا ہے اور نواب صاحب مرحوم کے بعض ایسے کارناموں کو اجاگر کیا ہے جن کا تذکرہ اشد ضروری تھا۔ اس مضمون کا وہ حصہ خصوصاً مفید اور دلچسپ ہے جس میں نواب صاحب مرحوم کے تعلق ندوۃ العلماء سے بحث کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تعلق پر کافی نہیں لکھا جا سکا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے بھی ہم انتہائی شکر گزار ہیں کہ موصوف نے ہماری صرف ایک دفعہ کی درخواست پر مضمون لکھکر ارسال فرما دیا۔ آپ کی ساری زندگی جس بے لوث خدمت خلق اور مجاہدانہ مستعد مزاجی میں گزری ہے اس کے پیش نظر ہمیں آپ سے توقع بھی یہی تھی۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ مولانا لدھیانوی بھی اسی سال فریضہ حج سے سبکدوش ہوئے جس سال نواب صاحب مرحوم کو یہ شرف حاصل ہوا۔ اس مضمون میں مولانا موصوف نے نواب صاحب مرحوم کے سفر حج ہی کے بعض واقعات قلم بند فرمائے ہیں۔ اور اس طرح نواب صاحب مرحوم کی زندگی کا یہ گوشہ بھی کسی حد تک ہماری نظروں کے سامنے آگیا ہے۔ مولانا موصوف نے قاری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کے حالاتِ زندگی بھی قلم بند کر دیئے ہیں۔ قاری صاحب مرحوم نے ایک دفعہ حبیب گنج میں رمضان المبارک میں قرآن شریف سنایا تھا۔

ڈپٹی محمد عباس خاں شروانی کو بجا طور پر شروانی خاندان کا مورخ کہا جا سکتا ہے۔ اور اس معاملے میں وہ اپنے نامور ہم نام بزرگ کے صحیح خلف ہیں۔ جنھوں نے عہد اکبر شاہی میں شروانی خاندان کے حالات میں "تحفۂ اکبر شاہی" تالیف فرمایا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے بھی اس خاندان کے حالات ایک کتاب میں جمع کئے ہیں لیکن افسوس ہے کہ مالی دشواریوں کی وجہ سے ابھی تک اس کتاب کی طباعت کی نوبت نہیں آئی ہے۔ خاندان کے اہل خیر حضرات کو اس طرف توجہ کرکے اس علمی کام کی تکمیل میں ڈپٹی صاحب موصوف کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔ اور دنیا کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرانا چاہئے۔ پیش نظر مضمون میں بھی ڈپٹی صاحب نے شروانی خاندان کے تاریخی حالات ہی مختصر طور پر تحریر فرمائے ہیں۔ اس مضمون سے اندازہ ہو سکے گا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ کسی زمانے میں ترقی کے کن منازل تک پہنچ چکا تھا۔ مضمون کے آخر میں ڈپٹی صاحب نے خاندان کے نسبتاً زمانہ حال کے چند اکابر کے نام گنوائے ہیں۔ اور مختصراً ان کی خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ اگر اس ضمن میں فخر خاندان تصدق احمد خانصاحب شروانی مرحوم، جناب نثار احمد خاں شروانی، پروفیسر محمد ہارون خاں شروانی اور محترمہ زاہدہ خلیق الزماں شروانیہ مرحوم کے نام اور لے دیئے جاتے تو یہ فہرست مکمل ہو جاتی۔

عبدالصبور خاں صاحب شروانی کا تعلق شروانی خاندان کی نئی نسل سے ہے۔ موصوف نے "بھیکن پور کی دو صد سالہ مختصر تاریخ" لکھکر بڑا کام کیا ہے۔ اس "تاریخ" کے مطالعے سے اس پس منظر کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ جس کی پیداوار نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم تھے اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے کہ وہ روایات بجائے خود کتنی شاندار تھیں جنھیں نواب صاحب مرحوم نے نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اُن کے حسن اور تابناکی میں اپنے زندگی بھر کے کارناموں سے اضافہ بھی کیا۔ عبدالصبور خاں صاحب خود ان اسلاف کے خلف اور جانشین ہیں جن کے حالات انہوں نے اس مضمون میں لکھے ہیں۔ غالباً اسی لئے انہوں نے بالعموم اپنے بزرگوں کی زندگی کے تابناک پہلوؤں ہی سے بحث کی ہے اور اگر کہیں ان کی بعض خامیوں کا ذکر کرنا بھی پڑا ہے تو صرف اشارہ کنایہ ہی پر اکتفا کی ہے۔ مجھے اس سلسلے میں ادب سے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ بزرگ بھی باوجود تمام صفات حمیدہ کے وجود انسان تھے، فرشتے نہیں تھے اور پھر ان کا تعلق ایک ایسے نظام سے تھا جس سے وابستہ رہ کر خامیوں سے اپنا دامن بچانا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے بہت سی خوبیوں کے ساتھ ان میں بعض خامیاں بھی تھیں ان خامیوں کے آثار ہمیں خصوصاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے متعلق ان بزرگوں کے طرز عمل میں ملتے ہیں۔ عبدالصبور خانصاحب نے اپنے مضمون کے شروع میں بعض ایسے بزرگوں کا حوالہ دیا ہے جن کے تفصیلی حالات اس مضمون میں وہ نہیں لکھ سکے ہیں۔ اس فہرست میں حاجی عبدالشکور خاں صاحب مرحوم کے دو نامور بیٹوں [illegible] خانصاحب مرحوم اور مولوی خلیل الرحمٰن خانصاحب مرحوم کے ناموں کا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ اول الذکر نے صرف ۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ لیکن اس چھوٹی سی عمر ہی میں اپنی انتظامی لیاقت اور حسن کارکردگی کے لئے کافی مشہور ہو گئے تھے۔ ثانی الذکر کی عمر ۵۷ سال ہوئی اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اُن مقدس روایات کو زندہ کئے رہے جن کے لئے ان کے آباؤ اجداد مشہور تھے یعنی فراخ دلی، سیر چشمی، مہمان نوازی اور غربا پروری وغیرہ۔ اس لحاظ سے مرحوم کو خاتمۃ الباب بھی کہا جا سکتا ہے۔

مولوی عبدالشاہد خاں صاحب شروانی بھی ہمارے خاندان کی نئی نسل ہی کے ایک ہونہار فرد ہیں۔ آپ ان معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جو خاندانی روایات کے بخلاف ہمیشہ جادۂ حریت پر گامزن رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کو علمی و ادبی ذوق سے بھی حصۂ وافر ملا ہے، خصوصاً مؤلف "باغی ہندوستان" کی حیثیت سے آپ ہند اور پاکستان کے علمی حلقوں میں کافی متعارف ہیں۔ شاہد صاحب کو نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم کی ذات سے جو تعلق رہا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے ۱۹۴۵ء میں مرحوم "شروانی کلب" کے سالانہ اجلاس میں نواب صاحب مرحوم سے متعلق ایک طویل مقالہ پڑھا تھا جو جنوری ۱۹۴۶ء میں "مصنف" علی گڑھ میں شائع ہوا نیز "کاروانِ خیال" اور "کاروانِ حسرت" کے مقدموں میں آپ نواب صاحب مرحوم کے بارے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ "جمہور" کا یہ نمبر بھی سب سے زیادہ آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ پیش نظر مضمون میں شاہد صاحب نے نواب صاحب مرحوم کی ذات ستودہ صفات کے بارے میں اپنے جذبات عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے شروانی خاندان کی تاریخ کے بعض اہم پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ آپ نے اس خاندان کی مختلف شاخوں کے شجرے مہیا کرنے اور انہیں ترتیب دینے میں بہت کاوش سے کام لیا ہے۔

شروانی خاندان کے بزرگوں کو اپنی نسل کے "تحفظ" کا خیال ہمیشہ بہت رہا اور اسی لئے انہوں نے بالعموم برادری سے باہر رشتہ داریاں قائم نہیں کیں۔ لیکن ہر کلیے کی طرح یہ کلیہ بھی استثنیٰ سے خالی نہیں اور سہاور ضلع ایٹہ کے تبنی پٹھانوں سے شروانیوں کے شادی بیاہ کے مراسم زمانۂ قدیم ہی میں قائم ہو گئے۔ جنھوں نے اس حد تک استحکام حاصل کر لیا کہ کچھ ہی عرصہ بعد تبنی اور شروانی ایک ہی برادری کے افراد شمار کئے جانے لگے۔ چودھری عبدالواجد خانصاحب (جو تبنی خاندان کے ایک تعلیم یافتہ بزرگ ہیں) نے ہماری درخواست پر اپنے خاندان کے حالات اس نمبر کے لئے تحریر فرمائے ہیں جو شکریہ کے ساتھ شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس خاندان کے بزرگوں کی نمایاں خصوصیات دینداری، تقویٰ اور خدا ترسی رہی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی زد میں یہ خاندان پوری طرح آیا تھا جس کے تفصیلی حالات پیش نظر مضمون میں شامل ہیں۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم کو سہاور کے لوگوں سے ہمیشہ خصوصی تعلق رہا۔ چودھری نور اللہ خانصاحب مرحوم اور چودھری عبدالحمید خانصاحب مرحوم (جن کی وفات نواب صاحب کی کوٹھی "حبیب منزل" علی گڑھ ہی میں ہوئی تھی) کی وفات پر موصوف نے مضامین تعزیت بھی تحریر فرمائے تھے جو شائع ہو چکے ہیں۔ چودھری عبدالواجد خانصاحب نے اپنے مضمون میں بعض بحث طلب مسائل بھی چھیڑے ہیں جن کے متعلق کچھ عرض کرنے کا میرا منصب نہیں ہے۔

مولوی [illegible] تعلق کتاب خانہ حبیب گنج سے بحیثیت ناظم کے کم و بیش چوتھائی صدی پرانا ہے اور موصوف کی نگاہ کتاب خانہ مذکور کے باب میں [illegible] بہت وسیع اور گہری ہے [illegible] اس کتاب خانے کی بعض نادر کتابوں سے

پہلی نظر

(ریاض الرحمٰن خاں شروانی ایم۔ اے)

اخبار "جمہور" علی گڑھ کا "صدر یار جنگ نمبر" پیشِ خدمت ہے۔ ہم نے پوری پوری کوشش کی ہے کہ اس نمبر میں نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم مغفور کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اُن سے قریبی تعلق رکھنے والے زیادہ سے زیادہ بزرگوں کے خیالات و جذبات جمع کریں۔ ہمیں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، اس کا فیصلہ ناظرین پر ہے۔ ہم اُن بزرگوں کے صمیمِ قلب سے شکرگزار ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر توجہ فرما کر اپنے رشحاتِ قلم سے نوازا۔ اُن کے اشتراکِ عمل کے بغیر ہماری کوششیں ہرگز بار آور نہیں ہوسکتی تھیں۔

نواب صاحب مرحوم کی وفات پر ہند اور پاکستان کے مختلف گوشوں سے جو پیغاماتِ تعزیت موصول ہوئے اُن سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ یہ حادثہ صرف نواب صاحب مرحوم کے اعزہ اور اہلِ خاندان ہی کے لئے باعثِ ملال نہیں تھا بلکہ اس غم میں ہمارے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ شریک تھے۔ یہ احساس بجائے خود ہمارے لئے بڑی حد تک باعثِ سکون تھا۔ اس نمبر میں بعض چیدہ چیدہ پیغاماتِ تعزیت شائع کئے جا رہے ہیں تاکہ ناظرین کو اندازہ ہوسکے کہ نواب صاحب مرحوم کے حادثۂ وفات کو ملک و قوم نے کس طرح محسوس کیا۔ اور اس کو کن کن الفاظ میں اظہارِ خیال کیا۔ ان میں بعض ایسے بزرگوں کے پیامِ تعزیت شامل ہیں جن کا شمار مختلف حیثیتوں سے مشاہیرِ ملت میں ہوتا ہے۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، [illegible] حیدرآباد، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، نواب اسمٰعیل یار جنگ، نواب محمد اسمٰعیل خاں، ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہم۔ بعض بزرگوں نے خاص اس نمبر کے لئے پیغامات مرحمت فرمائے ہیں۔ ان پیغامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے اکابر کی نگاہ میں نواب صاحب مرحوم کا مقام کتنا بلند تھا۔ مولانا سید حسین احمد مدنی کی ذاتِ گرامی محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ عالمِ متبحر اور عظیم سیاسی رہنما دونوں اعتبار سے اُن کی شخصیت یگانۂ روزگار ہے۔ موصوف نے نواب صاحب کا ذکر جس عقیدت سے کیا ہے اس سے جہاں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ نواب صاحب کا پایہ ان کی نگاہ میں کیا تھا وہاں خود مولانا مدنی کی تواضع اور شکستِ نفس کا احساس بھی ہوتا ہے۔ نواب صاحب چھتاری ہمارے صوبہ کے انتہائی [illegible] ہیں۔ موصوف کے پیغام سے اس [illegible] کے دو مشہور قدیم خاندانوں کے باہمی روابط کا اندازہ ہوتا ہے۔ نثار احمد خاں صاحب شروانی ہمارے خاندان کے اکابر میں خصوصی درجے کے مالک ہیں۔ ان کا پیغام اس امر کا شاہد ہے کہ نواب صاحب مرحوم کو خود اپنے اہلِ خاندان کس نظر سے دیکھتے تھے اور نواب صاحب نے اس خاندان کے بقا و ترقی کے لئے کیا خدمات انجام دی تھیں۔ قاضی عبدالغفار صاحب اردو زبان کے نامور ادیب و انشاء پرداز ہیں۔ انھوں نے اپنے پیغام میں بزمِ رفتہ کی اس آخری شمع کے گل ہوجانے پر اپنے دلی تاثرات کا اظہار کیا ہے اور نواب صاحب مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے سلسلے میں مفید مشورہ دیا ہے۔ مولانا عبدالعزیز میمن سے عربی ادب کے طالب [illegible] واقف ہیں۔ موصوف کا پیغام قدرتی طور پر نواب صاحب مرحوم کے عربی ذوق سے متعلق ہے اور [illegible]

کہ نواب صاحب مرحوم [illegible] اپنے معاصرین کی نگاہ [illegible] تھے جیسے موت کے [illegible] نواب صاحب مرحوم کی [illegible] سے متعلق [illegible] زیادہ [illegible] مولانا شبلی نعمانی، مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد اور ڈاکٹر اقبال [illegible] علم و ادب [illegible] شبلی، خواجہ [illegible] اکبر الہ آبادی نے [illegible] نواب صاحب [illegible] امیر مینائی نے ان کی [illegible] ڈاکٹر اقبال نے [illegible] دیا ہے اور مولانا آزاد نے جذباتِ خلوص و محبت کا اظہار کیا ہے۔ مولانا آزاد کے آخری مکتوبِ گرامی اور اعلیٰحضرت نظام کے ایک قطعۂ فارسی کا عکس بھی اس نمبر کی زینت ہے۔

مضامین کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ شروع میں وہ مضامین شائع کئے گئے ہیں جو خاص اس نمبر کے لئے لکھے گئے ہیں۔ آخر میں بعض وہ مضامین شائع کردیئے ہیں جو پہلے کہیں اور چھپ چکے ہیں لیکن ان کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ انھیں دوبارہ اس نمبر کی زینت بنایا جارہا ہے۔ اس ذیل میں ہمیں مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے اس مضمون کی عدمِ اشاعت کا افسوس ہے جو "معارف" اعظم گڑھ کے "شروانی نمبر" میں شائع ہوا تھا۔ چونکہ مولانا گیلانی نے اس نمبر کے لئے علیحدہ مضمون تحریر فرمانے کا وعدہ کیا تھا اس لئے ہم آخر وقت تک ان کے مضمون کے منتظر رہے اور "معارف" والے مضمون کی نقل نہ کرا سکے۔

ڈاکٹر سید محمود ہمارے ملک کے ان نامور فرزندوں میں سے ہیں جنھیں اگر ایک طرف سیاسی دنیا میں "مقامِ محمود" کی تخت نشینی کا فخر حاصل ہے تو دوسری طرف بارگاہِ علم و ادب میں بھی ان کا مقام صدر میں ہے۔ ہم موصوف کے انتہائی شکرگزار ہیں کہ باوجود گوناگوں مصروفیات اور ناسازئ مزاج کے ہماری درخواست پر اس نمبر کے لئے مضمون تحریر فرماکر ہماری عزت افزائی فرمائی۔ موصوف نے اپنے مضمون میں نواب صاحب مرحوم کی ملازمت، وضعداری اور شرافت و مروت کا تذکرہ کیا ہے اور بجا طور پر اس بات پر اظہارِ ملال کیا ہے کہ اب وہ سانچے ہی باقی نہیں رہے جن میں ان جیسے لوگ ڈھلا کرتے تھے۔ خواب کا واقعہ خاص طور پر [illegible] اور نواب صاحب کے ساتھ [illegible] "صاحبِ دل" ہونے کی شہرت [illegible]۔

مولانا ضیاء احمد بدایونی ہمارے ملک کے لائق ترین اساتذہ میں سے ہیں۔ آپ بحیثیت نقاد بھی کافی شہرت کے مالک ہیں۔ آپ نے اپنے گراں قدر مضمون میں نہ صرف نواب صاحب مرحوم کی شخصیت سے متعلق ذاتی تاثرات کا اظہار فرمایا ہے بلکہ مرحوم کے فارسی کلام پر تبصرہ فرماکر ایک بڑی کمی پوری کی ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ ایسے مضامین بہت کم لکھے گئے ہیں جن میں نواب صاحب مرحوم کے علمی و ادبی کارناموں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں خصوصاً مرحوم کی نثر نگاری پر بہت کچھ لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ مولانا ضیاء احمد کا تبصرہ اگرچہ مختصر ہے لیکن جچا تلا اور منصفانہ ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی "دارالمصنفین" اعظم گڑھ کے ارکان کی صالح جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور اس جماعت میں ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں آپ اچھی طرح متعارف ہیں۔ آپ کا مضمون نواب صاحب مرحوم کی علم پروری اور معارف نوازی سے متعلق ہے اور اس طرح مرحوم کی شخصیت کے ایک خاص پہلو سے بحث کرتا ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی شخصیت کا یہ پہلو دوسرے پہلوؤں پر کس طرح حاوی تھا۔

پروفیسر محمد ہارون خاں شروانی سابق صدر شعبۂ سیاسیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ملک کے انگریزی پڑھے لکھے لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ علاوہ ایک فاضل استاذ ہونے کے متعدد قابلِ قدر کتابوں کے مصنف و مولف بھی ہیں۔ پروفیسر شروانی نے "چہار منظر" لکھ کر نواب صاحب مرحوم کی حیدرآبادی زندگی کی نقاب کشائی فرمائی ہے۔ حیدرآباد کا زمانۂ قیام نواب صاحب مرحوم کی زندگی میں بہت اہم گزرا ہے۔ اس مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم کے مشاغل حیدرآباد میں کیسے گوناگوں تھے اور وہاں انھوں نے اپنا وقت کیسی نیک نامی اور ہردلعزیزی کے ساتھ گزارا۔ ضرورت ہے کہ نواب صاحب مرحوم کے حیدرآباد کے تعلق پر ابھی اور بھی لکھا جائے۔

مولانا بدرالدین علوی تنہا بزرگ ہیں جنھوں نے نواب صاحب سے متعلق دو علیحدہ علیحدہ مضمون تحریر فرمائے۔ اس سے آپ کے تعلقِ خاطر کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو مولانا موصوف کو نواب صاحب مرحوم سے تھا۔ نواب صاحب مرحوم کے آخر زمانۂ حیات میں مولانا علوی کو مرحوم سے خاصہ قرب رہا۔ اسی لئے پیشِ نظر مضمون میں انھوں نے وہ واقعات سپردِ قلم فرمائے ہیں جو نواب صاحب مرحوم اپنی مجالس میں اکثر بیان فرمایا کرتے تھے۔ ان واقعات کو محفوظ کرکے مولانا علوی نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ مولانا مفتی عبداللطیف صاحب کے خطبے نے اس مضمون کی افادیت میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ مفتی صاحب قبلہ نواب صاحب مرحوم کے ہم سبق رہے ہیں۔ اور اس طرح موصوف کا علاقہ نواب صاحب مرحوم سے بہت قدیم ہے۔

خان بہادر مولوی حبیب اللہ خاں ہمارے خاص شکریہ کے مستحق ہیں اس لئے کہ آپ نے باوجود کبرسنی اور علالتِ طبع کے مضمون لکھوانے کی زحمت گوارا فرمائی۔ خانصاحب موصوف کے تعلقات بھی نواب صاحب مرحوم سے بہت قدیم تھے۔ اور مرض الموت میں نواب صاحب مرحوم کو اپنے جن چند احباب و اعزہ کا خاص طور پر

متعلق اپنے خیالات قلم بند فرمائے ہیں۔ جو دلچسپ اور مفید ہیں۔ اگر گوہری صاحب اس مضمون کو اور زیادہ جامع بنا دیتے تو اس کی افادیت بہت بڑھ جاتی۔

شائع شدہ مضامین میں زیادہ تر مضامین "معارف" اعظم گڑھ سے نقل کئے گئے ہیں۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم کا رابطہ "دار المصنفین" اور "معارف" سے بہت گہرا تھا۔ وہ "دار المصنفین" کے صدر نشین اور "معارف" کے مستقل مضمون نگار تھے۔ اسی تعلق کی بنا پر ادارۂ "معارف" نے اپنی سابقہ روایات سے ہٹ کر اپنے جنوری کا دسمبر ۱۹۵۰ء کا شمارہ مرحوم کی یاد میں نکالا جب نواب صاحب کی رحلت کے فوراً بعد ادارۂ "جمہور" نے "صدر یار جنگ نمبر" نکالنے کا فیصلہ کیا تو ادارۂ "معارف" کی طرف سے خواہش کی گئی کہ "جمہور" کا خصوصی نمبر "معارف" کے خصوصی نمبر کے بعد نکلے۔ ادارۂ "جمہور" نے بڑی خوش دلی سے اس خواہش کا احترام کیا اس لئے کہ "معارف" کا حق فائق تھا۔ جو مضامین "معارف" سے نقل کئے گئے ہیں ان میں شاہ معین الدین احمد ندوی کا اداریہ "آخری شمع" "معارف" کے ستمبر ۱۹۵۰ء کے شمارے سے لیا گیا ہے۔ باقی سب مضامین "خاص نمبر" سے لئے گئے ہیں۔ شاہ معین الدین صاحب نے اپنے دورِ ادارت میں "معارف" کی سابقہ علمی و ثقافتی روایات کو پوری طرح قائم رکھا ہے۔ اور اس کے لئے وہ اربابِ نظر کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ "آخری شمع" چونکہ اداریہ ہے اس لئے قدرتاً مختصر ہے۔ لیکن بڑی حد تک جامع اور نواب صاحب مرحوم کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں پر حاوی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے جانشین اور خود اسلامی ہند کے اکابر فضلاء میں سے ہیں۔ نواب صاحب مرحوم "جانشین شبلی" کی حیثیت سے آپ کا خاص خیال فرماتے تھے۔ اور آپ بھی نواب صاحب کا وہی احترام ملحوظ رکھتے تھے جو استاد کے حبیب لبیب اور رفیقِ خاص کا رکھنا چاہئے۔ پیشِ نظر مضمون میں بھی اس تعلقِ خاص کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ غالباً کبرسنی اور ناسازگار حالات کی وجہ سے اس مضمون میں بعض واقعاتی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ خصوصاً مولانا ابو الکلام آزاد کے سفرِ عراق سے متعلق۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے جو اس سلسلے میں مضمون پڑھنے کے مطالعہ سے پیدا ہو سکتی تھی مولوی [illegible]

مرزا محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی کا مضمون شائع کیا جا رہا ہے جو اس سے پہلے "برہان" دہلی کے اپریل ۱۹۵۱ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ شہاب صاحب نے یہ مضمون لکھنے میں دقتِ نظر اور توازنِ فکر کا ثبوت دیا ہے۔ اور ایک بڑی کمی پوری کی ہے۔

مولانا عبد الماجد دریا بادی مدیر صدق (جدید) اردو زبان کے صاحبِ طرز ادیب ہونے کی حیثیت سے معروفِ روزگار ہیں۔ مشرقی تہذیب کے علم بردار اور اسلامی روایات کے پرستار ہونے کی وجہ سے آپ نواب صاحب مرحوم سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ پیشِ نظر مضمون میں بھی اس عقیدت کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر افروز ہیں۔ مولانا دریا بادی کے دل آویز طرزِ نگارش [illegible] مخصوص بہت کی بنا پر ان کا یہ مضمون باقی تمام مضامین سے ممتاز نظر آتا ہے۔ مضمون کے آخر میں مولانا دریا بادی نے نواب صاحب مرحوم کی اور خود اپنی اُن کاوشوں کا ذکر کیا ہے جو ان دونوں بزرگوں نے سجاد علی انصاری مرحوم کی تصنیف لطیف "محشرِ خیال" کو مسلم یونیورسٹی کے ایم اے (اردو) کے نصاب سے خارج کرانے میں صرف کی تھیں اور اس سلسلے میں "محشرِ خیال" میں ظاہر کئے گئے عقائد اور اس کی ادبی قدر و قیمت پر بھی نواب صاحب مرحوم کے اور اپنے خیالات نقل کئے ہیں جہاں تک "محشرِ خیال" میں ظاہر کئے گئے مخصوص عقائد کا تعلق ہے۔ مجھے ان دونوں بزرگوں کی رائے سے بڑی حد تک اتفاق ہے لیکن جہاں تک اس کی ادبی قدر و قیمت کا تعلق ہے میں نہایت ادب کے ساتھ جرأت اختلاف کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں سجاد علی انصاری مرحوم کے طرزِ تحریر میں بڑا خلوص، بڑی توانائی اور بڑی رعنائی تھی وہ اُس طرزِ تحریر کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے۔ رعنائیِ خیال، بے باکیِ فکر اور حسنِ نگارش کے اعتبار سے ہماری زبان کے ادیبوں میں ان کے مقابلے میں تنہا مہدی افادی مرحوم کا نام اور لیا جا سکتا ہے۔ "محشرِ خیال" رنگینیِ بیان کے لحاظ سے اردو ادب کا غیر فانی شاہکار ہے۔ سید معین الدین شاہجہان پوری مرحوم حیدر آباد کے تعلق کے دوران میں نواب صاحب مرحوم کے مہتمم پیشی رہے تھے بعد میں میرے انگریزی کے استاد بھی رہے اس لئے میں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم کی قوتِ مشاہدہ بہت گہری تھی۔ اور وہ اپنی رائے

کے معاملے میں بہت شدید تھے۔ اس لئے ان کا یہ مضمون نواب صاحب مرحوم کے کمالات کے متعلق ایک ایسے شخص کی شہادت ہے جو کھرے کھوٹے کی پہچان بھی رکھتا تھا اور اپنے حقیقی جذبات کے انکشاف میں بے باک بھی تھا۔ مرحوم کا خلوص اسی سے ظاہر ہے کہ انھوں نے وصیت کی تھی کہ ان کا یہ مضمون اُن کے انتقال کے بعد شائع ہو۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کی اشاعت کی نوبت صرف ان ہی کے انتقال کے بعد نہیں آئی بلکہ اُس وقت آئی جب نواب صاحب بھی رحلت فرما چکے۔

سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے "دار المصنفین" کے رفقاء کی مجلس میں ان کا اضافہ بہت بیش قیمت اور قابلِ قدر ہے۔ ہم نے ان کے مضمون کے صرف اُس حصے کو نقل کیا ہے جو نواب صاحب مرحوم کے علمی و ادبی کارناموں سے متعلق ہے۔ سید صاحب موصوف نے نواب صاحب مرحوم کی تصانیف کی بڑی مکمل فہرست مہیا کی ہے اور مختصر طور پر اُن کے موضوعات بھی بیان کر دیئے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر موصوف نواب صاحب کی بعض اہم تصانیف پر باقاعدہ تنقید لکھ کر شائع کرا دیں۔

مسٹر مالک رام ایم اے علمی و ادبی مذاق کے حامل اور ہمارے مشترکہ تمدن کے سچے نمائندے ہیں "غالبیات" کے ذوق میں تو وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے اس دورِ تعصب و تنگ نظری میں اُن جیسے لوگ مغتنمات میں سے ہیں۔ یہ ان کا "غالبیات" ہی کا ذوق تھا جو اُن کی نواب صاحب مرحوم سے شناسائی کا وسیلہ بنا۔ ان کا گراں قدر مضمون ہم نے "آج کل" دہلی کے اگست ۱۹۵۱ء کے شمارے سے نقل کیا ہے۔ ہم حکومت ہند کے پبلیکیشنز ڈویژن کے شکر گزار ہیں کہ اُس نے ہمیں اس مضمون کی نقل کی اجازت دی۔ جناب عرش ملسیانی نائب مدیر "آج کل" بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ جن کی اعانت سے ہمیں حصولِ اجازت میں آسانی ہو گئی۔ مالک رام صاحب نے "جمہور" کے "صدر یار جنگ نمبر" کے لئے اپنے مضمون میں اضافہ کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا لیکن افسوس ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا موصوف نے مضمون محنت سے لکھا ہے۔ اور نواب صاحب مرحوم کی سیرت کے بعض گوشے بہت خوبصورتی سے اُجاگر کئے ہیں۔ خصوصاً جہاں نواب صاحب کی کتابیں دکھانے کی کیفیت بیان کی ہے۔ وہاں واقعہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ اُس عبارت کو پڑھ کر وہ منظر آنکھوں میں گھوم جاتا ہے جب نواب صاحب مرحوم کسی باذوق مہمان کو اپنے نادر و نایاب کتاب خانے کی بعض معرکۃ الآرا کتابیں نہایت ذوق و شوق سے دکھاتے تھے اور اُس کی داد سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

سید الطاف علی بریلوی بی اے عرصۂ دراز تک آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ انہیں نواب صاحب مرحوم سے بہت عقیدت تھی۔ اور نواب صاحب بھی ان کا کافی خیال کرتے تھے۔ آج کل سید صاحب موصوف آل پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری ہیں اور کراچی سے آپ نے کانفرنس کا آرگن "العلم" جاری کیا ہے۔ "العلم" کے پہلے ہی شمارے میں الطاف علی صاحب نے نواب صاحب مرحوم کے خطوط بنام ڈاکٹر مولوی عبد الحق شائع کئے ہیں خطوط کسی شخص کے جذبات و واردات کے سچے عکاس ہوتے ہیں اور ان میں تصنع بالکل نہیں ہوتا اس لئے کسی ادیب کے ادبی سرمایہ میں اُن کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نواب صاحب مرحوم کے پیشِ نظر مکاتیب سے بھی اُس تعلقِ خاطر کا اندازہ ہوتا ہے جو نواب صاحب کو ڈاکٹر مولوی عبد الحق سے تھا۔ نواب صاحب کے اندازِ نگارش کی خصوصیات ایجاز و اختصار، سادگی و برجستگی اور زورِ بیان بھی ان خطوط سے کسی حد تک واضح ہو جاتی ہیں۔

آخر میں "مقالاتِ شروانی" سے "تبرکات" کے زیرِ عنوان نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم کے بعض وہ مضامین نقل کر دیئے گئے ہیں جن سے کسی نہ کسی طور پر نواب صاحب کی اپنی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ان مضامین میں خاص طور پر وہ مضامین قابلِ مطالعہ ہیں جن کا تعلق "کتاب خانۂ حبیب گنج" سے ہے ان سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ نواب صاحب مرحوم نے کتاب خانہ کس ذوق و شوق سے جمع کیا تھا اور انھیں اس سے کتنا شغف تھا۔ اس میں شبہ نہیں ہے یہ کتاب خانہ نواب صاحب مرحوم کے زندگی بھر کے متعدد کارناموں میں سب سے اہم اور سب سے شاندار کارنامہ ہے اور اس کا خود آنمرحوم کو بھی پورا احساس تھا۔ وہ مضامین بھی بہت مفید اور دلچسپ ہیں جن میں اپنے پیر و مرشد اور اساتذۂ کرام کا ذکر کیا ہے۔ ان مضامین میں جوشِ عقیدت

۱۴

(عکس تحریر) امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد وزیر معارف حکومت ہند کا نواب صاحب مرحوم کے نام آخری خط

۲۲ مئی

EDUCATION MINISTER,
INDIA

صدیق مکرم نامہ گرامی کے لیے شکریہ۔ تشنا ما[illegible]
کہ یہ کسی تقریب کی احتیاج نہ تھی۔ آپکی ملاقات
نے نواب وقارالملک مرحوم کی یاد تازہ کردی اور
پینتالیس برس پیشتر کی گزری ہوئی دنیا پھر ایک مرتبہ
سامنے آگئی۔ سوچتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے
جیسے وہ دنیا ہندوستان کی دنیا نہ تھی۔ کوئی دوسرا
ملک تھا جسکا نام و نشان بھی اب باقی نہ رہا

کجا تا دکھائم احلام

میں تشنا[illegible] کے لیے جو کچھ کرسکتا ہوں
ضرور کروں گا۔ ملا صاحب کو سلام شوق والسلام علیکم
ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام

صدر الصدور مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

قطعۂ عید

عید است و نوبہار و نگار رم بکام دل
ساقی بیا بدہ مے عشرت بجام دل
از صبر و اضطراب چہ پرسم کہ دادہ است
در دست اختیار نگاہت زمام دل

(عکس تحریر، ہز اکزالٹڈ ہائنس میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع سابق نظام حال راج پرمکھ مملکت حیدرآباد دکن (بہ موقعہ عید الفطر ۱۳۷۱ھ)

کی فراوانی ہے۔ حصۂ نظم کو بھی جاندار
اور اثر آفرین بنانے کی ہم نے امکانی
کوشش کی ہے۔ مولانا اقبال سہیل کا
قصیدۂ فارسی نواب صاحب مرحوم کے
ورودِ اعظم گڈھ کے موقع پر پڑھا
گیا تھا۔ اس قصیدے کا ذکر مولانا
اکرام اللہ خاں ندوی کے مضمون میں
ملتا ہے۔ قصیدے کے مطالعہ سے
پتہ چلتا ہے کہ علامہ شبلی مرحوم سے
تعلق رکھنے والے حضرات نواب
صاحب مرحوم کو کس نظر سے دیکھتے
تھے۔ جناب یحییٰ اعظمی خوش گو شاعر
ہیں۔ آپ کی نظم تعزیت اس سے قبل
"معارف" میں شائع ہو چکی ہے یہ
نظم بھی نواب صاحب مرحوم کے علامہ
شبلی مرحوم کے ساتھ تعلق ہی کو پیش نظر
رکھکر لکھی گئی ہے۔ جناب اختر زندانی کا
مرثیہ بھی اس سے قبل "الجمعیۃ" و "جمہور"
میں چھپ چکا ہے۔ یہ مرثیہ اختر صاحب
کے دلی جذبات کی نشان دہی کرتا ہے۔
عبدالصبور خاں صاحب عارف شروانی
اور غلام جیلانی خانصاحب اعجاز شروانی
کی ماتمی نظمیں ان جذبات و احساسات
کی عکاسی کرتی ہیں جو شروانی خاندان
کی نئی نسل نے اپنے اس قابل فخر و
مباہات بزرگ، اسلاف کرام کی آخری
عظیم یادگار کی موت پر اپنے قلب کی
گہرائیوں میں محسوس کئے۔ یہ جذبات
تنہا عارف صاحب اور اعجاز صاحب
کے نہیں ہیں بلکہ شروانی خاندان کی پوری
موجودہ نسل کے ہیں۔ اس حادثۂ فاجعہ
پر ہم میں سے ہر شخص نے یہ محسوس کیا
تھا کہ ؎

وا در یغا لٹ گئی دولت مرے اجداد کی
گردشِ گردوں نے یہ نعمت بھی کی برباد کی

محترمہ ایم بی شروانیہ مالکۂ اخبار
"جمہور" نے "نواب صدر یار جنگ مرحوم
کے ذاتی حالات" مرتب کرکے بڑی کمی
پوری کردی۔ اس توجہ فرمائی نے
اس خاص نمبر میں صنف لطیف کی
نمائندگی بھی بڑی حد تک کرلی ہے۔
نواب صاحب مرحوم کی منظومات
سے بھی جا بجا صفحات مزین کئے گئے
ہیں۔ "کاروانِ حسرت" اور "بوستانِ حسرت"
کے نام سے موصوف کے اردو اور
فارسی دواوین شائع ہو چکے ہیں۔ یہ
حصۂ منظومات انھیں سے لیا گیا ہے
ان غزلوں، نظموں اور قطعات
وغیرہ سے مرحوم کے ذوقِ شعر و شاعری
کا بھی صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دیکھا کرتا۔ میری نظر میں ایک گذری دنیا کا نقشہ پھیلا ہوتا تھا۔ میں ان کی بزم وسبک عالمانہ اور ادیبانہ باتوں میں عہدِ رفتہ کی وہ آوازیں سنتا تھا۔ جواب خاموش ہیں۔ علامہ شروانی بہت کچھ اپنے ساتھ لے گئے۔ بہت کچھ جس پر ہمارے آباؤ اجداد کی تہذیب ناز کرتی تھی۔

ہم اپنی محرومی کا جتنا بھی ماتم کریں کم ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ مرحوم کے جانشین ان کے علم و فضل کی دنیا کو جس کی مادی صورت وہ بیش بہا کتب خانہ ہے جو انھوں نے چھوڑا ہے۔ اس طرح ان کی یادگار بنا دیتے کہ ہم جب اس علمی خزانے کے اندر قدم رکھتے تو ہمیں ہر قدم پر اس محترم شخصیت کے علم و فضل و اخلاق کی پرچھائیاں متحرک نظر آتیں۔!

ایک بے عمل اور مردہ قوم بہت جلد اپنے بڑوں کو بھول جایا کرتی ہے۔ اس بے حسی کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے جرأت نہیں ہوتی کہ یہ کہوں کہ مرحوم کے شایانِ شان کوئی یادگار قائم کی جائے۔

یادگاریں قائم کرنے کا چرچہ چند ہی روز ہوا کرتا ہے۔ اور پھر سب بھول جاتے ہیں لیکن اگر اتنا ہی ہو جائے کہ اپنی جو یادگار وہ خود اس دنیا میں چھوڑ گئے ہیں اسے اس طرح قائم رکھا جا سکے کہ اس سے علم کے پیاسوں کی پیاس بجھتی رہے۔ تو میں کہونگا کہ وہ اس یادگار کے توسط سے ہزاروں اور لاکھوں اربابِ ذوق کے دلوں میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

(قاضی) محمد عبد الغفار (جنرل سکریٹری کل ہند انجمن ترقی اردو علی گڑھ)

نواب صاحب مرحوم اپنی گوناگوں خصوصیات اور مختلف حیثیات میں ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ مسلم یونیورسٹی سے آپ کا تعلق بہت پرانا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر ہمارے رفیق کی جدائی کا جتنا بھی ہمیں غم ہو کم ہے لیکن یہ غم ایسا ہے جس میں مسرت بھی پنہاں ہے۔ ہمیں ان کی یاد اپنی شخصیت بنانے میں مدد دیتی رہے گی۔

مرحوم نے اپنے ماحول کے خلاف اپنے لئے ایک راہ متعین کی اور اس پر چل پڑے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ان کی شخصیت دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بن گئی۔ انھوں نے اپنے لئے ایک راہ تجویز کر لی تھی۔ لیکن دوسروں کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔ بلکہ ہر ممکن مدد پہونچاتے تھے۔

(ڈاکٹر) ذاکر حسین خاں
وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم اور میرے والد حبیب اللہ صاحب مرحوم و مغفور پیر بھائی تھے دونوں حضرت شاہ مولانا فضلِ رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، مرحوم نے ہمیشہ اس نسبت کو ملحوظ رکھا۔ اور ابتداء جو تعلق و نسبت مجھ سے قائم ہوئی۔ اُسے آخر تک نبایا۔

دار العلوم دیوبند سے بھی مرحوم کو اچھا خاصا تعلق تھا۔ اور مملکت حیدرآباد کے صدر الصدور امورِ شرعیہ کے ہونے کے بعد تو یہ تعلق اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ مختلف مواقع پر دیوبند پہونچ کر وہاں کے تعلیمی، انتظامی اور اصلاحی امور بچشم خود دیکھا۔ اور ضروری امور پر مشورے دیتے رہے۔

اگرچہ میرا ان سے بہت کم ملنا ہوتا۔ لیکن جب بھی ملاقات ہوئی بڑی گرمجوشی اور عنایت مربیانہ سے ملتے رہے۔

اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ اور ان کی مذہبی اور علمی خدمات کی بنا پر مرحوم کو اپنی رحمت و رضوان سے مالا مال کرے۔ آمین

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ
(شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہٗ)

غمِ ہجراں
(بہ طرح خواجہ حافظ شیرازی)

اے نسیمِ سحر آرامگہِ یار کجاست
منزلِ آں مہِ عاشق کُش عیار کجاست

روزِ من گشتہ سیہ جلوۂ دلدار کجاست
سینہ خوں گشتہ زغم مرہمِ دیدار کجاست

فصلِ گل رفت و دلم غنچۂ نشگفتہ ہنوز
آں بہارِ ارم و نازشِ گلزار کجاست

خار خارِ غمِ ہجراں بدلم غارت گست!
اے نسیمِ سحری آں گلِ بیخار کجاست

بادِ جاں بخش و چمن خرم و دیدہ نورفشاں
ساقیِ ماہ وش و ساغرِ سرشار کجاست

[illegible] سرمستی [illegible] دل خانۂ خمار کجاست

(رحمت شیروانی)

پیغامات

نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم مغفور کے بزرگانہ عنایات میرے ساتھ ایسے تھے کہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں میں سے مجھے بھی تصور فرماتے تھے۔ تو بے جا نہ ہوگا۔ نواب صاحب مرحوم و مغفور پرانی تہذیب و تمدن کے ایک بہترین نمونہ تھے۔ اور علوم مشرقیہ میں ان کا تبحر مسلّم تھا۔ میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ نواب صاحب مرحوم کی زندگی کے کسی پہلو پر قلم اٹھانے کی جرأت کر سکوں اس واسطے میں معافی چاہتا ہوں۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو میرے اس عریضہ کو آپ شائع کرا سکتے ہیں۔

(سعید الملک نواب کرنل ڈاکٹر حافظ) احمد سعید (خاں صاحب) آف چھتاری

نواب صاحب مرحوم و مغفور کی روشن خیالی، دور بینی کا نتیجہ ہے کہ شروانی خاندان کے چند افراد کیلئے ترقی کے میدان کھل گئے اور ہم اس قابل ہوئے کہ اس وطن کی معزز ہستیوں کے مجمع میں سر اونچا رکھ کر شریک ہو سکیں۔ ہم اسی باغ کے چند پودے ہیں کہ جو نواب صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں نہایت خوش اسلوبی سے لگایا تھا۔

نواب صاحب مرحوم و مغفور کی ادبی زندگی کے متعلق کچھ کہنا میرے لئے چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ جو کچھ ان کی ادبی خدمات ہیں ان کے متعلق مولانا ابو الکلام آزاد۔ علامہ شبلی اور مولوی عبدالحق جیسے اونچے پایہ کے ادیبوں نے کافی لکھا ہے اور انکے ادبی شہپارے برسہا برس تک دنیا میں روشنی پھیلانے کا کام دیتے رہیں گے۔

نواب صاحب مرحوم و مغفور ان چند ہستیوں میں سے تھے جن کے کارنامے ان کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیں گے۔ اور ان کا شمار دنیا کی امر ہستیوں میں رہے گا۔

(جناب) نثار احمد (خانصاحب شروانی ایم ایل اے سابق وزیر زراعت صوبہ یو۔ پی۔ حال مینجنگ ڈائرکٹر یونی تبوگر تیکری

هيهات لا يأتي الزمان بمثله ان الزمان بمثله لبخيل

مرحوم کی علم دوستی کے افسانے ۱۹۱۰ء ہی سے سن رہا تھا۔ گرسنہ ۲۵ء میں حبیب گنج جاکر آپکا کتب خانہ دیکھا۔ فلما التقينا صغر الخبر الخبر۔

آپ نے میرے مضامین معارف (ابن رشیق وابو العلاء) دیکھ لئے تھے۔ اس لئے انتہائی اخلاق سے ملے [illegible] اور انہوں نے عربی نوادر کے متعلق میرے مشورے معلوم کئے۔ جسکے بعد میں نے زیادات شعر المتنبی اور الاقتیار شائع کئے میرا علی گڑھ کا ۲۵ سال قیام و تعلق آپ کی نظر انتخاب کا رہین ہے۔ ہر ملاقات میں آپ انتہائی خلوص کا اظہار فرماتے اردو فارسی کے ماہر و ناظم ہونیکے علاوہ آپ کو علوم دین و تاریخ سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ زندگی نہایت پاکیزہ اور معمولات منتظم تھے آپ پختہ عزم ہونے کے علاوہ بے مدرکان درج تھے آپکی اخلاق کا نور آپکی معاشرت، سیاسی آرا و دینی مسلک وغیرہ میں صاف نمایاں تھا۔ میرے استاد الشیخ حسین بن محسن الانصاری (شیخ خلیل عرب کے جد امجد) کو حبیب گنج بلاکر حدیث کی سند لی یا یوں کہئے ایک اثری علامہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ ادھر ندوہ و دیوبند کی حمایہ اصلاحات میں آپ کی مساعی حسنہ کو بڑا دخل تھا۔ نیز علماء بریلی بھی آپ کے محاسن ریز یا کے دلدادہ تھے کہ!

تیغ زہر گوشۂ یافتم

لقد صار قلبي قابلاً كل صورة فمرعى لغزلان ودير لرهبان

آپکے فنائی العلم ہونیکا زندہ مثال آپکا کتبخانہ ہے جسکو آپنے نصف صدی کی کدو کاوش اور صرف زر کثیر کے بعد جمع کیا۔ گویا طلیبیہ گنج مخفی ہے علیگڈھ و قاہرہ اور اپنے کتبخانہ میں احمد تیمور پاشا نے بیٹھے میں ایک ایک کتاب کو کیٹلاک کر رہے ہیں یا یوں کہئے اس نعم السلف کے حقیقی نعم الخلف (سپوت) ہی اوراق پارینہ کا آئینہ دار بنا رہ گیا ہے۔ مگر یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ وہ تو اپنا اندوختہ اپنی قومی حکومت کے دار الکتب کو سونپ کر اس دنیائے فانی سے خوش خوش چل بسے تھے مگر یہاں یہ مواقع میسر نہ آئے ہر ملاقات میں آپکا یہی سوال ہوتا کہ گذشتہ عرصہ میں کون کونسی تازہ مخطوطات دیکھیں کیا کتابیں چھپیں، اور آپنے خود کیا تصنیف کی۔ ہر قدیم نسخہ کو سینے سے لگاتے بمقتضائے الحكمة ضالة المؤمن فحيثما وجدها فهو اولى بها۔ اور پھر!

حالے چنداد دم جاں خریدم بحمد اللہ عجب ارزاں خریدم

اس گنج شائگان کے حصول سے ایک خاص تسکین کام ودہن لذت اندوز رہتا اور یہ سے فرماتے [illegible]

لا يدرك الواصف المطري خصائصه وان يكن صادقا في كل ما وصفا

یہ خصائص انیسویں صدی کے نصف آخر کے باقیات الصالحات کی برکات تھے ورنہ اب تو!

شد آں مرغ کو بیضہ زریں نہاد زمانہ دگرگوں آئیں نہاد

ہمارے رو سیاہ کو اگر کچھ نچ رہے ہوں۔ اس غنز باشی سے کیا دو سطر دو لبالب تو الٹ گئی۔ آنکھیں اب یہ جلوے کیا دیکھیں گی۔!

تغمده الله بغفرانه واسكنه بحبوحة جنانه ويرحم الله عبدا قال آمينا

(علامہ) میمن عبدالعزیز (سابق صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

یوں تو اہل نظر ہمیشہ ہی ماتم کریں گے۔ کہ قدیم تہذیب کے اس آخری دور میں علم و فضل کی وہ شمع بھی جس کا نام حبیب الرحمن خاں شروانی تھا۔ گل ہو گئی۔ لیکن ان کے علم و فضل سے قطع نظر جس پر تبصرہ کرنے کا میں اہل نہیں ہوں۔ مجھے تو مرحوم سب سے زیادہ اس لئے یاد آتے ہیں۔ کہ ان کی شخصیت ہماری قدیم تہذیب و اخلاق کی پاکیزگی کا ایک دلنواز نمونہ تھی۔ دلی اور لکھنؤ کے اجڑ جانے کے بعد تہذیب و اخلاق کی قدیم محفلیں ختم ہو چکیں۔ لیکن ان محفلوں کی دو چار یادگاریں کہیں کہیں شرفاء کے قدیم خاندانوں کے گوشوں میں اب بھی باقی تھیں۔ وہ سب بھی اب تو تقریباً ختم ہو گئی ہیں۔ اسی تہذیب کے نگار خانے میں صدر یار جنگ کی زندگی کا وہ دلنواز نقش بھی افروز تھا۔ جس کو آخر کار موت کے بے پناہ ہاتھ نے مٹا دیا۔ میں تو جب کبھی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ تو جب تک ان کے پاس بیٹھا رہتا اپنے خوش مذاق بزرگوں کی قدیم محفلوں کی پرچھائیاں

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

(آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر ترقیات صوبہ بہار)

نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کی موت نے ہم سے ایک ایسی شخصیت کو جدا کر دیا جس کا مثل اب اس دور ابتلا میں پھر پیدا ہونے کی امید نہیں۔ جس سانچہ میں آپ جیسے لوگ ڈھلا کرتے تھے اب وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا۔

وہ شرافت۔ وہ مروت۔ وہ وضعداری وہ علمیت جو اُن میں پائی جاتی تھی اب مفقود ہو رہی ہے۔

پرانی تہذیب و کلچر کے وہ ایک بے مثال نمونہ تھے۔ آج نئے سانچوں نے ڈھلے ہوئے ڈگری یافتہ حضرات سے ان جیسے بزرگوں کا مقابلہ کرنا ہی بیکار ہے۔ اُن میں ظرافت تھا۔ اُن میں اپنے رنگ کی پختگی تھی۔ ان میں محبت و خلوص تھا۔ اُن میں علمی تبحر تھا۔ ان میں زندگی کا اعلیٰ مقصد تھا۔ اب نئے سانچے ایسی خوبیوں کے انسان کو ڈھالتے ہی نہیں۔

جب میں علی گڑھ میں اسکول کے نیچے درجوں میں پڑھتا تھا اس وقت مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کو کالج میں دیکھا کرتا اور ان کی تعریفیں سنا کرتا۔ وہ اپنی علمیت و شرافت کے لئے مشہور تھے۔ کبھی کبھی وہ کسی اخلاقی یا مذہبی موضوع پر لیکچر دیا کرتے اور ہم طلبا ان کے لیکچر کو سنتے۔ اُس وقت مجھے کبھی اُن سے بات چیت کرنے کا موقعہ نہ ملا لیکن انکو دیکھکر ان کی نیکی و شرافت کا ایک گہرا اثر میرے دل پر اسی وقت سے پیدا ہوا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ دو ایک بار نواب محسن الملک مرحوم سے بھی ان کے علمی تبحر اور ان کی نیکی و شرافت کی تعریفیں سنی تھیں۔

اسی زمانہ میں ایک بار میں اپنے مرحوم دوست تصدق احمد خاں شروانی کے ساتھ بھیکم پور و حبیب گنج گیا تھا اور نواب صاحب کا کتب خانہ سرسری طور پر دیکھا تھا۔ اور وہاں نواب صاحب سے ملاقات ہوئی تھی لیکن اُس کی تفصیل یاد اب ذہن میں محفوظ نہیں رہی۔

۱۹۱۲ء میں جب میں یورپ سے لوٹا تو حبیب گنج نواب صدر یار جنگ کا کتب خانہ دیکھنے کے لئے خاص طور پر گیا۔ انگلستان اور جرمنی میں میں نے کچھ ریسرچ ہندوستان کی تاریخ پر کیا تھا اور کچھ نئے تاریخی مواد حاصل کرنے کے شوق میں حبیب گنج گیا۔ میرے علمی شوق کو دیکھ کر نواب صاحب پر بڑا اثر ہوا اور اُس وقت سے میرے ان کے ذاتی تعلقات شروع ہوئے۔ مجھے حبیب گنج میں انہوں نے دو تین دن تک اپنا مہمان رکھا اور سارا وقت میرے ساتھ اپنے نایاب کتب خانہ کو دکھلانے اور ایک ایک کتاب کے متعلق تفصیلی حالات بیان کرنے میں صرف کیا۔ اُن ملاقات کا لطف مجھے اب تک یاد ہے۔ اُس وقت سے نواب صاحب کی بے شمار خوبیوں کا مجھ پر انکشاف ہونا شروع ہوا۔

حبیب گنج سے لوٹتے وقت جب میں بھیکم پور سے گذرا تو نواب مزمل اللہ خاں نے میری گاڑی رکوائی اور مجھے طلب کیا۔ میری حاضری پر خفگی و شکایت کا اظہار کیا کہ میں بغیر اُن سے ملے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ وہ پھر تو انتہائی اصرار کے ساتھ مجھے اپنا مہمان رکھا اور بڑے خلوص و شفقت کا اظہار کیا۔ اس واقعہ کا ذکر میں نے پرانے بزرگوں کے خلوص و محبت و وضعداری کے ثبوت میں کیا ہے۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

نواب صدر یار جنگ سے میرے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے اور مختلف علمی مباحث پر خط و کتابت ہوتی رہی۔ کبھی کبھی میں اُن سے کوئی علمی نکتہ رجوع کرتا اور وہ کمال مہربانی سے اُس کا جواب دیتے۔ افسوس ہے کہ وہ سارے خطوط باقی نہ رہے۔ اُن کے کچھ خطوط میرے پاس اب تک موجود ہیں لیکن باوجود تلاش کے نہ مل سکے ورنہ جمہور کے "صدر یار جنگ نمبر" کے لئے وہ بہت دلچسپی کا باعث ہوتے۔

۱۹۲۱ء کے ترک موالات کے دور میں جب پہلی بار میں جیل گیا تو میرے پاس نواب صاحب کی تصانیف میں "ذکر حبیب" اور "سیرت صدیق" تھی۔ شاید اگست یا ستمبر ۱۹۲۲ء کا زمانہ تھا جبکہ یونان و ترکوں میں فیصلہ کن جنگ ہو رہی تھی لیکن جیل میں مجھے اخبار بند تھا۔ ملاقات و خط و کتابت بھی بند تھی۔ لڑائی کے حالات معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جیل کے سپاہیوں نے چوری سے اخبار لاکر مجھے دینا چاہا لیکن میں نے اس طرح اخبار منگوانا پسند نہ کیا۔ طبیعت بہت بے چین و پریشان تھی۔ اُس حالت میں میں نے سیرت صدیق پڑھی اور اُس کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ خاصکر جبکہ غار حرا میں آں حضرتؐ نے حضرت صدیقؓ سے فرمایا لاتحزن ان اللہ معنا۔

اسی پریشانی کی حالت میں کمبل پر عشا کی نماز کے بعد سو گیا۔ خواب میں آنحضرت صلعم کو یہ فرماتے ہوئے دیکھا۔ لا تھنوا ولا تحزنوا ان اللہ معنا۔ اس کے بعد میرے دل کو پوری تسکین ہو گئی اور تین چار دن کے بعد جیل کے افسروں سے سُنا کہ ترکوں کو پوری فتح حاصل ہوئی۔ خدا کا شکر بجا لایا۔

جیل ہی سے میں نے نواب صاحب کو یہ قصہ لکھا پھر تو مجھ پر نواب صاحب کی توجہ کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ صرف صاحب علم نہ تھے بلکہ صاحب دل بھی تھے۔ جس خلوص و عقیدت سے انہوں نے سیرت صدیق لکھی تھی میں نے اس واقعہ کو اسی پر محمول کیا۔

۱۹۳۷ء میں بہار کی کانگریس وزارت کے زمانہ میں انہوں نے مولانا فضیل احمد مرحوم، مولانا ... مرحوم اور سید الطاف علی کو میرے پاس بھیجا اور ایک نہایت پر خلوص خط لکھا اور مجھ سے یہ خواہش کی کہ میں مسلم تعلیمی کانفرنس کا اجلاس پٹنہ میں منعقد کراؤں۔ اور لکھا کہ مجھے اس کی بڑی تمنا ہے۔ اس تمنا اور خواہش کی وجہ غالباً یہ تھی کہ تیس چالیس سال پیشتر پٹنہ میں ندوہ کا اجلاس ہوا تھا اور اسوقت پٹنہ کے بزرگوں نے جس علمی ذوق کا ثبوت دیا تھا اور جس طرح جلسہ کو کامیاب بنایا تھا نواب صاحب مرحوم کو غلط فہمی ہوئی کہ پٹنہ کے حالات اب بھی ویسی ہی ہوں گے۔ لیکن پٹنہ کیا سارا ملک بدل چکا تھا۔ مسلمانوں میں اس وقت مسلم لیگ کی سیاست کا زور دورہ تھا اور مفید اور کارآمد شئے بھی پروپیگنڈا کا جزو بنکر رہ گئی تھی۔ میں نے پہلے مسٹر سید عبدالعزیز مرحوم سے اس امر میں مشورہ کیا اور اُن سے درخواست کی کہ استقبالیہ کمیٹی کے صدر وہ بنیں لیکن اس وقت وہ الکشن کے نتیجہ کے باعث بہت مایوس تھے اور ہر چیز سے علحدہ ہو چکے تھے انہوں نے قطعی انکار کیا۔ پھر میں نے اپنے مکان پر معتبر حضرات کا ایک جلسہ کیا اور استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل کی اور مسلم لیگ ہی کے حضرات کو صدر و سکریٹری وغیرہ بنایا۔ کام کرنے کے لئے کچھ روپیہ جمع کر کے میں نے کمیٹی کے حوالہ کیا۔ اس وقت حالات کچھ ایسے سازگار تھے اور میرا بہت اثر تھا۔ میں نے امید کی تھی کہ ہندو راجاؤں مثلاً مہاراجہ دربھنگہ، مہاراجہ ہتوا وغیرہ سے اور دیگر ہندو مل مالکوں سے مسلم کانفرنس کے لئے ایک لاکھ روپیہ جمع کر سکوں گا اور شاید کچھ مستقل امداد بھی دلوا سکوں لیکن سیاست اور اس کی غلط فہمیوں کا برا ہو کہ اُس نے یہ کام ہونے نہ دیا۔

"علی گڑھ کی سازش" نے ایک خبر مشہور کرائی کہ میں اس میں اس لئے حصہ لے رہا ہوں کہ کانفرنس کا صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کو بنایا جاوے اور اس طرح مسلم کانفرنس کو مسلم لیگی اثر سے نکالکر کانگریسی اثر میں لایا جائے۔ نہ تو ڈاکٹر ذاکر حسین کو صدر ہونے کی خواہش تھی اور نہ مجھے اس کا وہم و گمان تھا اس کا ذکر بھی نہ تھا۔ لیکن اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ مسلم لیگی حلقہ میں ایک سنسنی پھیل گئی اور فوراً ایک جلسہ بلایا گیا اور جلسہ پٹنہ سٹی میں بلایا گیا تاکہ میں وہاں پہنچ نہ سکوں لیکن جب میں پہونچا تو بے ضابطہ طور پر جلسہ نے کثرت آرا سے فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا اور میرے پہونچنے پر ضابطہ کے ساتھ فیصلہ ہوا کہ کانفرنس کا اجلاس چار پانچ مہینوں کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ میں نے اصرار کیا کہ اس کی کوئی وجہ نہیں۔ نواب صدر یار جنگ کے خطوط بھی دکھلائے کہ ان کو جلسہ کے انعقاد کی جلدی ہے لیکن کون سنتا ہے۔ جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔

جب مہینوں کے بعد جلسہ کیا گیا تو نہایت معمولی اور غیر موثر اجلاس ہوا اور اُس میں خوب بے عنوانیاں اور بدعنوانیاں برتی گئیں۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم اور مولانا احمد سعید صاحب کی اچھی خاصی درگت بنائی گئی۔ پٹنہ کی اس تہذیب و متانت کا جس کے شوق میں نواب صاحب نے پٹنہ میں کانفرنس کا اجلاس کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی خوب خوب مضحکہ اُڑا۔ کہنے کی جو بات ہے وہ یہ تھی اور جس کے کہنے کے لئے یہ سارا قصہ یہاں لکھا گیا۔ اس موقعہ پر نواب صدر یار جنگ نے جو آخری تقریر کی وہ یادگار رہیگی۔ مجھے امید ہے کہ وہ تقریر ضرور قلم بند کی گئی ہوگی اور کارروائی کے ساتھ چھپی بھی ہوگی۔ انہوں نے جس متانت۔ سنجیدگی۔ تہذیب و شستگی کے ساتھ اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا وہ قابل دید تھا۔ جلسہ میں ایک سماں بندھ گیا تھا اور سناٹا چھا گیا تھا۔ انہوں نے پرانے اور نئے پٹنہ کا موازنہ کیا۔ انہوں نے ندوہ کے قابل یادگار جلسہ

پیغامات تعزیت

جو نواب صدر یار جنگ بہادر کے خلف اکبر مولوی محمد عبید الرحمٰن خاں صاحب شروانی، بیگم صاحبہ محترمہ اور دیگر افراد خاندان کے نام موصول ہوئے۔ ان میں سے چند مخصوص درج ذیل ہیں۔

تار

امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزاد وزیر معارف حکومت ہند

افسوسناک خبر سنکر انتہائی صدمہ ہوا۔ آپ کے ساتھ اور مرحوم کے دیگر افراد خاندان کے ساتھ میری دلی تعزیت۔

پیشی سکریٹری ہز اگزالٹڈ ہائینس نظام حیدر آباد

آپ کے والد کی رحلت کی خبر سنکر اعلیٰحضرت کو افسوس ہوا۔ وہ مرحوم کے خاندان کے ساتھ اظہار ہمدردی فرماتے ہیں۔

مولانا محمد حفظ الرحمٰن ممبر پارلیمنٹ ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء ہند

صدر یار جنگ کی افسوسناک وفات علمی و دینی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مجھے اور میری جماعت کو سخت صدمہ ہوا۔

پروفیسر محمد ہارون خاں شروانی صدر شعبہ سیاسیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد

چچا صاحب کی وفات میرے لئے عظیم ذاتی سانحہ ہے۔ خدا مرحوم کو مغفرت نصیب فرمائے۔

بیگم حبیب اللہ صاحبہ، لکھنؤ

سخت صدمہ ہوا۔ دلی تعزیت قبول کیجئے۔

نواب صاحب و بیگم صاحبہ ریاست دوجانہ مقیم حال لاہور

مہربانی کر کے اپنے قابل عزت والد کی افسوسناک رحلت پر ہماری طرف سے دلی تعزیت قبول کیجئے۔

نواب علی یاور جنگ بہادر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد

براہ مہربانی یونیورسٹی، دائرۃ المعارف اور میری اپنی طرف سے گہری تعزیت قبول کیجئے۔ اپنے نامور شوہر کی وفات پر۔

مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند

میں اور پورا دار العلوم مولانا کی وفات کے سانحہ میں آپ کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

خطوط

مولانا محمد حفظ الرحمٰن۔ ایم۔ پی

مرحوم ملک و ملت کا ایک قیمتی سرمایہ اور علمی زندہ یادگار تھے۔ انکی وفات نے ہمارے اکابر کی صف میں ایک خلا پیدا کر دیا ہے۔ اور علم و ادب کو سخت نقصان پہنچا ہے۔

سید محمد احمد کاظمی۔ ایم۔ پی

مرحوم کی ذات مسلمان قوم کے لئے ہی نہیں بلکہ ملک کے لئے ایک مایہ ناز ہستی تھی۔ ان کی وفات اگرچہ آپ کے لئے ذاتی طور پر ایک سخت سانحہ ہے۔ لیکن اس میں آپ کا شریک تمام قوم ہے۔

نواب محمد اسمٰعیل خاں ایم۔ پی

نواب صاحب مرحوم کے اٹھ جانے سے ہماری صفوں میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ شاید کبھی نہیں بھر سکے گا۔ مرحوم ایک بڑی ممتاز اور یگانہ ہستی کے مالک تھے۔ پرانی روایات اور علم و ادب کے اسلامی ذوق کی آخری یادگاروں میں سے تھے۔

سید غلام بھیک نیرنگ ایم سی اے (پاکستان)

الیا لوگ جامع محاسن انسان آئے دن پیدا نہیں ہوتا۔۔۔۔ ان کی عنایتیں اور ان کے محاسن یاد آ رہے ہیں اور دل بھر بھر آتا ہے۔ مگر سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔

مولانا محفوظ الرحمٰن نامی سابق پارلیمنٹری سکریٹری صوبہ یو۔ پی

پاس بیٹھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس دور کے نہیں بلکہ چند صدی پہلے کے کسی بزرگ، پیکر علم و عمل مجسمہ شرافت و وقار کی صحبت میں بیٹھا ہوں افسوس کہ سلف کی یادگار بھی پنہاں ہو گئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

سر محمد یامین خاں سابق ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی)

میرے وہ مربی تھے۔ اور بزرگ تھے اور ان کے احسانات میرے اوپر تھے۔ لیکن وہ اس زمانہ کی یادگار بھی تھے۔ جن لوگوں نے اپنی زندگی قوم کی فلاح کے واسطے وقف کر دی تھی۔ اور اپنے کیرکٹر اور کوششوں سے قوم کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا تھا۔

نواب ناظر یار جنگ بہادر۔ حیدر آباد دکن

گو علامہ نواب صاحب مرحوم مغفور نے عمر طبعی پا کر اس دار فانی سے ملک جاودانی کو رحلت کی لیکن غالباً فطرت انسانی کے تحت جسقدر زیادہ دیرینہ تعلقات کسی بزرگ ہستی سے ہو جاتے ہیں۔ اتنا ہی زیادہ جدائی کا صدمہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبد الحق صدر انجمن ترقی اردو پاکستان

نواب صاحب مرحوم اسلامی تہذیب و علم کی یادگار تھے۔ ان کی رحلت ایک قومی صدمہ ہے۔ اب ایسے بزرگ ہماری قوم میں نظر نہیں آئیں گے۔

مولانا عبد الماجد دریابادی مدیر صدق لکھنؤ

جس وقت کا دھڑکا تھا۔ وہ وقت آ گیا آخر۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مغفور بیتاب اک سے خط سے کہ جمعہ کا دن نصیب ہوا۔ اور بندہ مومن کی کبرسنی خود ایک دلیل مغفرت ہے۔ آپ کے تو والد ماجد ہی تھے۔ آپ کو تسلی صدمہ عظیم ہو ہے باقی وہ مرحوم اپنی وفات سے یتیم خدا معلوم کتنی اسلامی تحریکوں اور اداروں کو کر گئے!

مولانا عبد المجید سالک مدیر "انقلاب" لاہور

ہائیں، کیا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن شروانی رفیق اعلیٰ سے جا ملے؟۔۔۔۔ علم و ادب کا ایک مینار ٹوٹ گیا۔ ایک آفتاب غروب ہو گیا۔ ہماری تہذیب و ثقافت کی آخری یادگاریں رخصت ہوتی جا رہی ہیں۔ چند سال کے بعد اس کے اصلی اور نقلی نام لیواؤں کا نام و نشان ڈھونڈھے سے نہ ملے گا ایسی باوضع ہستیوں کو اب کہاں ڈھونڈیں۔ جو علم دین۔ تقویٰ، سیر ستر گار، ادب، شعر اور خدمت ملت کی جامع ہوں۔

خواجہ غلام السیدین اسسٹنٹ مشیر تعلیم حکومت ہند

علم و حکمت، شرافت اور مسلمانوں کی تہذیب کے جو سلسلے ہماری تہذیب کے بنانے والے تھے۔ ان کی بہت کم روشن یادگاریں ملک میں باقی رہ گئی تھیں۔ اب یہ بھی چراغ گل ہو گیا۔

مسٹر ٹانک رام منسٹر لیگیشن آف انڈیا بغداد (عراق)

اس قحط الرجال کے دور میں ایسی جامع اور ہمہ گیر ہستیاں کہاں ملتی ہیں۔۔۔۔۔ انھوں نے اپنی عمر بسر کی اور ملک و ملت اور علم و فضل کی نمایاں اور دیرپا خدمات انجام دیں۔ دین ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔۔۔۔۔ وہ بھی ان کے درجات بلند کرے ان پر فضل و کرم کا سلوک کرے۔ اور اپنی عنایتوں میں رکھے اور رحمت میں انھیں جگہ دے۔ آمین ۔ الحمد للہ آمین آمین یارب العالمین

ڈاکٹر عبد الستار صدیقی سابق صدر شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی!

نواب صاحب کی موت کوئی معمولی موت نہیں اس کا ماتم کرنے والے صرف آپ اور میں نہیں۔ ساری قوم اور ملک ہے۔ اور آپ کے اس سخت وقت میں ہمدردی کرنے والے لاکھوں مسلمان اور بہت سے غیر مسلم بھی ہیں۔ یہ بات آپ کے قلب کی تقویت کے لئے ایسی بڑی بات ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں۔

ملک عبد القیوم صاحب پرنسپل لا کالج لاہور

آنمرحوم عہد سر سید کی یادگار تھے۔ آپ علمی شغف، دینی تقویٰ۔ اور جب ملک و ملت ایسی چیزیں ہیں جس سے نہ صرف آنمرحوم کا نام بلکہ خاندان شروانیہ کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا۔

ڈاکٹر مولوی عبد العلی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ!

نواب صاحب مرحوم کی ذات گرامی سے ندوۃ العلماء کو جو بیش بہا مدد ملتی رہی۔ افسوس ہے کہ ندوۃ العلماء اس سے محروم ہو گیا۔ بانیان ندوۃ العلماء میں ایک آپ ہی کی ذات گرامی باقی رہ گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔ افسوس ہے کہ یہ گرانمایہ ہستی باقی نہیں رہی۔۔۔۔۔

نواب صاحب مرحوم دینداری اور زہد و تقویٰ کا ایک مرقع تھے۔ آپ کے اخلاق کریمانہ، آپ کا علم و فضل۔ آپ کی روایات، یہ سب باتیں ایسی تھیں جو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

مولانا مسعود علی ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ

دار المصنفین کو اپنے عظیم ترین سرپرست کی افسوسناک وفات کی خبر سنکر سخت صدمہ ہوا۔ مرحوم کی وفات اس ادارہ کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔

خان بہادر پروفیسر عبد المجید قریشی سابق صدر شعبہ ریاضی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ حال مقیم مغربی پاکستان

علم و ادب، شرافت، مروت، وضعداری اور دینداری جو کہ زمانہ کساد بازاری کی وجہ سے کہیں کہیں گوشوں میں دبکے ہوئے تھے ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں۔ نواب صاحب مرحوم مغفور کی رحلت ایک عالم کی موت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان کی شفقتوں کی یاد اب انھیں تنہا کئے ہے۔

جناب ایم۔ ایس۔ سنگھل ریٹائرڈ ممبر بورڈ آف ریوینیو یو۔ پی و سابق چیف سکریٹری راجستھان

اس زمانے میں آنمرحوم جیسے مہذب اور وضعدار لوگ شاذ ہیں۔ پرانے زمانے میں حاکموں اور کسانوں میں جو باپ اور اولاد جیسے تعلقات ہوا کرتے تھے وہ اس صدی کے شروع میں داستان پارینہ بن گئے تھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آنمرحوم کا طرز عمل اپنی رعایا کے ساتھ ہمیشہ باپ جیسا ہی رہا۔ اور ان کی رعایا بھی ان کے ساتھ اولاد جیسا پر محبت برتاؤ کرتی رہی۔۔۔۔۔۔۔ ہم ان جیسی مقدس شخصیت کی کمی اس دنیا میں ہمیشہ محسوس کرتے رہیں گے۔

کی موت ہے۔۔۔۔۔۔ ان کی شفقتوں کی یاد اب انھیں تنہا کئے ہے

تاثرات و تبصرات

(مولانا ضیاء احمد ایم۔ اے بدایونی)

نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم و مغفور کو دیکھنے کا بہت زیادہ قریب سے اور زیادہ دیر تک موقع نہیں ملا۔ اس کی بڑی وجہ تو کم فرصتی کہ اپنے ذاتی مشاغل سے وقت نہیں ملتا۔ دوسری اپنی نا اہلی کہ روشناس خلق ہونے کے لئے جس "سلیقے" کی ضرورت ہے میں اس سے محروم ہوں۔ تیسری وجہ میری عزلت پسندی ہے۔ (اسکو خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے) کہ طبیعت فطرۃً "کش مکش ردو قبول" سے گریز کرتی ہے۔

جنوں بہ عزم غم فتیلہ تی سوز د ۔۔۔ بہ ہیئت کاری داغ جگر چہ کار مرا

طالب علمی کے زمانے میں ان کی متعدد تصانیف مثلاً علمائے سلف وغیرہ پڑھنے کا اتفاق ہوا جس سے طبیعت متاثر ہوئی۔ اور غائبانہ یک گونہ وابستگی پیدا ہو گئی۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں ریسرچ کے بعد جب میں ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی میں بسلسلۂ ملازمت داخل ہوا۔ تو تذکرہ ان کے تذکروں سے گونج رہی تھی۔ اشتیاق دید نے اکثر دامن دل کھینچا۔ مگر وجوہ بالا مانع رہیں۔ آخر حسن اتفاق سے ایک موقع نکل آیا ۲۷ء یا ۲۸ء تھا۔ یونیورسٹی اسٹریچی ہال میں سیرت کا جلسہ تھا۔ اور نواب صاحب کی تقریر کا اعلان۔ ذکر حبیب اور بعد ذکر حبیب کے مولف (مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی) کی زبانی۔ نور علیٰ نور۔ ارادت کے قدموں سے حاضر ہوا۔ اور عقیدت کے کانوں سے سنا۔ ابتدائی تقریروں کے بعد دیکھا۔ کہ نواب صاحب بیان کے لئے کھڑے ہوئے۔ ایک بلند بالا وجیہ انسان۔ باوقار اور جاذب نظر۔ آواز زیادہ بلند نہ تھی لیکن صاف سمجھ میں آ رہی تھی۔ لہجے کا وہ عالم جو میدانوں میں بہنے والی ندی کا ہوتا ہے۔ نہ کہ اس نالے کا سا شور جو پہاڑوں کی بلندی سے نشیب کی طرف گرے۔ بیان نہایت واضح اور مدلل تھا۔ اور پوری قدرت کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے جاری رہا۔ نواب صاحب کوئی مشہور خطیب نہ تھے۔ تاہم ان کی وسعت نظر اور قوت بیان میں کوئی شبہ نہیں۔

غرض یہ پہلا تاثر (impression) تھا جو مجھ پر ہوا۔ اس کے کچھ دنوں بعد بدایوں میں ان کی آمد ہوئی۔ یہ تشریف آوری صدر الصدور امور مذہبی مملکت دکن کی حیثیت سے مدرسہ قادریہ بدایوں کی گرانٹ کا منجانب سرکار نظام اعلان کرنے کے لئے ہوئی تھی۔ اس زمانے کے اور آج کے بدایوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ درحقیقت ۱۹۴۷ء کے بعد سے وہاں کے مسلمان جن صبر آزما حالات سے گذر رہے ہیں۔ ان کا بیان نہایت حوصلہ شکن ہے۔

پرسد سبب بیخودی از مہر دل از بیم ۔۔۔ در عذر جنوں غلغلہ و گفتار ندانم

مختصر یہ کہ مسلمانان بدایوں نے نواب صاحب کی شایان شان پذیرائی کی! اور ایک بڑے جلوس کے ساتھ ان کی کار فرودگاہ پر پہونچی۔ اور دو روز تک عام اجتماعات اور مخصوص مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا چونکہ مجھے مدرسہ قادریہ اور مدرسہ شمس العلوم بدایوں سے ایک عقیدت مند اور نیز اولڈ بوائے ہونے کی نسبت حاصل تھی۔ اس لئے میں بھی مدعو تھا۔ میرا تعارف کرایا گیا۔ اور اصرار کیا گیا کہ اپنی نظمیں (قطعات تاریخ اسلام جو "نذر سلف" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں) سناؤں۔ چنانچہ تعمیل کی گئی۔ اور نواب صاحب نے دل کھول کر داد دی۔ ان کی آمد کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ تھا۔ کہ انھوں نے اپنی سعی و اثر سے اس موقع پر بدایوں کے دو مقتدر عالموں کو (جن میں باہم کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی) گلے ملوا دیا اور صلح کرا دی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ علی گڑھ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ حاضری اپنی مرتبہ شرح دیوان مومن پر مقدمہ لکھنے کی استدعا کے سلسلے میں تھی۔ اس زمانہ میں حبیب منزل "تیار نہیں ہوئی تھی۔ اور نواب صاحب اپنی کوٹھی واقع بنا دیوی میں تشریف فرما تھے۔ صدر میں خود اور گرد اگرد متعدد اصحاب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ مجھ سے پرسش حال فرمائی۔ اور عرض مطلب پر غالباً ناسازئ مزاج کا عذر کیا۔ تاہم مسودہ دیکھنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ میں مسودہ چھوڑ آیا۔ چند روز کے بعد مسودہ ملا۔ معلوم ہوا کہ موصوف نے اس کو بالاستیعاب ملاحظہ کیا تھا۔ اکثر جگہ تحسین کے طور پر صاد بنا دیا تھا۔ اور بجز ایک جملے کے کوئی ترمیم نہ فرمائی تھی۔ جب کتاب شائع ہوئی تو ایک نسخہ ان کی خدمت میں بھی ارسال کیا۔ جس پر ذیل کا مکتوب گرامی صادر ہوا۔

"ایک ادبی خدمت عمدہ صورت میں ادا ہو گئی۔ حکیم مومن خاں ادب اردو کے رکن رکین اور بزم سخن میں صدر نشین ہیں۔ ان کے کلام کا اس صفائی۔ صحت اور خوبی سے شائع کرنا سارے اہل ذوق کی منت گذاری کا باعث ہوگا۔ جزاک اللہ تعالے۔ کسی مستشرق کا قول آپ نے نقل کیا ہے۔ اس دیوان کو دیکھکر وہ رائے واپس لے لگا۔"

دیوان مومن کے کسی قدیم نسخے کی جستجو میں ایک بار حبیب گنج کا سفر کیا۔ فارسی کے ایک پرانے قصیدہ نگار ادیب صابر کے کلام کی تلاش بھی منظور تھی۔ نواب صاحب کمال عنایات و مدارات سے پیش آئے۔ اور نہایت خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے اپنے کتب خانے سے استفادے کی اجازت دی۔ بلکہ خود بہت کتابوں کی سیر کرائی۔ حبیب گنج کی شاندار گڑھی میں متعدد نفیس و وسیع عمارتیں ہیں انھیں میں سے ایک یہ کتب خانہ ہے جس میں عربی فارسی۔ اردو کی بیش بہا نوادر اور مخطوطات اور مطبوعات موجود ہیں۔ وہاں مومن کا کوئی قابل ذکر نسخہ تو دستیاب نہ ہوا۔ البتہ ادیب صابر کا کلام مل گیا۔ جس کو جناب ممدوح کے حکم سے میری خاطر نقل کرا دیا گیا۔ نواب صاحب نے اپنی بعض تصانیف بھی مجھے عطا کیں۔

قیام حبیب گنج کے دوران میں ایک لطیفہ سنئے۔ میرے قریب میں ایک سرحدی مولوی صاحب بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ نواب صاحب کے پیر بھائی تھے۔ سال کے سال حبیب گنج آتے۔ اور اپنی مقررہ رقم وصول کر کے جاتے۔ انھوں نے یہ دریافت کر کے کہ میں فارسی کا استاد ہوں میرا امتحان لینا شروع کیا۔ اور مجھ سے ردیف وغیرہ کے اشعار کے مطالب پوچھنے لگے۔ میں عمداً نہایت مسکین بنا ہوا کسی انقباض یا تکدر کے بغیر مناسب جواب دیتا اور دل ہی دل میں ان کی ذہنیت سے لطف لیتا رہا۔ اکبر مرحوم کے الفاظ میں دراصل ان کے نزدیک "الفت اللہ" کی چنداں اہمیت نہ تھی۔ جتنی کہ تنخواہ کی۔ چنانچہ وہ یہی پوچھ بیٹھے۔ اور مجھے بتانا پڑا۔ اس کے بعد تو تیور سے بیٹھے۔ بولے جارے نے میرا امتحان لیا ہو۔ بلکہ اس نے اس تپاک و احترام سے پیش آئے کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ غریب شروع میں یہ سمجھے کہ یہ بھی تماشائے اہل کرم دیکھنے آئے ہیں۔ گو فقروں کا بھیس نہ سہی۔ شاید اسی لئے وہ بات بات میں میرے اکھاڑنے کی کوشش کرتے تھے اس کے کئی سال کے بعد پھر حبیب گنج کیلئے شد رحال کا قصد کیا۔ میں نے طالب آملی کا دیوان لٹن لائبریری علی گڑھ کے جس نسخے سے اپنے لئے نقل کرایا تھا۔ وہ حاشیے پر اکثر جگہ کٹا ہوا تھا۔ اس لئے نواب صاحب کو مراسلہ لکھا۔ انھوں نے بہ کمال عنایت اپنا نسخہ لائبریری کے توسط سے روانہ فرما دیا۔ اور تحریراً ارشاد کیا۔ کہ ایک دوسرا قدیم تر دستنبو تر نسخہ یہاں موجود ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ خود آیئے اور فائدہ اٹھایئے میں نے خط کے ذریعے سے ارادۂ آمد ظاہر کیا۔ وہ خط موصوف کو اس وقت ملا۔ جب وہ علی گڑھ روانہ ہو رہے تھے۔ جب حبیب گنج کو مراجعت فرمانے لگے۔ تو از راہ ذرہ نوازی و معارف پروری خود غریب خانہ پر کرم کیا۔ سوا اتفاق کہ خاکسار گھر پر موجود نہ تھا۔ جب میں نے آکر سنا ندامت سے تھوڑا تھوڑا ہو گیا چنانچہ حبیب منزل حاضر ہوا۔ اور نواب صاحب کی معیت میں حبیب گنج پہونچا۔ رستہ بھر فارسی شعر و ادب اکثر نے تعلیم یافتہ اصحاب کے سطحی مذاق علم اور اسلاف کے علمی تصوف کی نسبت گفتگو ہوتی رہی۔ پہونچ کر پہلی فرصت میں طالب آملی کے موجودہ نسخے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ چنانچہ نسخہ مذکورہ نظر افروز ہوا۔ یہ وہی نسخہ ہے جس کی زیارت کے لئے علامہ شبلی حبیب گنج تشریف لائے تھے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حاشیے پر بعض غزلیں خود مصنف (طالب) نے اپنے قلم سے بڑھائی ہیں۔ چنانچہ یہ مشہور شعر بھی "ترانہ" کے عنوان سے حاشیہ پر درج ہے۔

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست ۔۔۔ کہ گل بہ دست تو از شاخ تازہ تر ماند

نواب صاحب کو آخر عمر میں عام ضعف اور ثقل سماعت کے ساتھ ساتھ نسیان کا مرض ہو گیا تھا۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ مفتی مولانا عبداللطیف صاحب کے مکان پر (جن کے یہاں وہ اکثر شام کو آیا کرتے تھے۔) میں حاضر ہوا اور اپنی تالیف (لمحات) ان کو نذر کی تو ان کو پہچاننے میں تامل ہوا۔ آخر بعض حاضرین کے بتانے پر مجھے پہچانا۔

زیاراں دوستی پرسد کہ غالب کیست طالع بیں ۔۔۔ کہ عمرے در ہوا لیش رفت و کارا خر سیدا ینجا

ان معدودے چند سرسری تعارف کی بنا پر موصوف کی عادات و خصائل کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنا بے محل ہوگا۔ دراصل یہ ان کے سوانح نگاروں کا جن کو ارتباط و اختلاط کے اکثر مواقع میسر ہوئے ہوں فرض ہے۔ تاہم کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے تجربات سے بھی انسان کی سیرت پر روشنی پڑ سکتی ہے اس لئے چند تاثرات پیش کرتا ہوں۔

نواب صاحب ایک سیر چشم۔ عالی حوصلہ۔ با اخلاق۔ نرم مزاج۔ انکسار پسند باوضع اور دیندار انسان تھے۔ ان کی مہمان نوازی۔ علم دوستی۔ اہل علم کی قدر دانی۔ نماز جماعت کی پابندی۔ کون نہیں جانتا۔ وہ اسلامیت و مشرقیت کے دلدادہ اور علم و ادب کے عاشق تھے۔ ان کا نادر کتب خانہ جو شمالی ہند کے کتب خانوں میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے ان کے ذوق علم کا زندہ ثبوت ہے خود اردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بلکہ فہمیدن بہ از گفتن بود " کے مطابق شعر فہمی میں خصوصی امتیاز رکھتے تھے۔ ان کی مجلس متانت و تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ ان کی آمد پر جب حاضرین کھڑے ہونے لگتے تو وہ اکثر تاکیداً روک دیتے۔ خوش پوشاکی اور جامہ زیبی کی ایسی مثالیں کم دیکھنے میں آئیں عطر نہایت بیش قیمت لگاتے۔ اور جب مجلس میں آتے تو فضا معطر ہو جاتی۔ اسی کے ساتھ اچھا کھانے بلکہ کھلانے کا بھی شوق تھا۔ ان کے یہاں کی شب دیگ جو خاص باورچیوں کے اہتمام سے تمام رات تیار کی جاتی نہایت لذیذ ہوتی تھی۔ جس کی شرکت کے لئے وہ لوگوں کو مخصوص طور پر بلاتے اور کھلا کر خوش ہوتے۔ دسترخوان پرتکلف اور وسیع ہوتا تھا۔ طرح طرح کے کھانوں کے علاوہ کبھی کبھی فصل کے پھل (آم وغیرہ) بھی ہوتے تھے۔ صدر میں وہ خود تشریف رکھتے اور گرد عاجزاد

کا ذکر کیا اور پھر نہایت عمدہ پیرایہ میں ... وہ جلسہ کی طرف اشارہ کیا۔

یہ تقریر ایک معرکۃ الآرا تقریر تھی اور مسلمانوں کو ہمیشہ یاد دلاتی رہیگی کہ انہوں نے اپنے سرمایۂ تہذیب و کلچر کو کھو کر کیا حاصل کیا۔

اس تقریر نے نواب صاحب کی رنسف مزاجی۔ دیانت داری اور اعلیٰ کیرکٹر کا بھی اظہار کیا۔ انکی سیاست کانگرس کی سیاست نہ تھی لیکن باوجود اس کے وہ کانگرس کو یہ نا کر اس کے خلاف خوامخواہ پروپگنڈہ پیدا کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور انصاف کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس تقریر کا جلسہ پر بڑا اثر ہوا اور لوگ شرمندہ بھی ہوئے۔

علی گڑھ پہونچکر نواب صاحب نے مجھے جو خط لکھا وہ شائع ہونے کے لائق ہے اور اگر مل گیا تو ضرور شائع کراؤں گا۔

جب بھی اُن سے ملاقات ہوتی کسی نہ کسی تاریخی یا اسلامی مسئلہ پر گفتگو رہتی۔ ڈاکٹر کنور محمد اشرف کو میں نے مستعد کیا کہ وہ کانفرنس کے علمی شعبہ کو اپنے ہاتھ میں لیں اور اس کے ذریعہ مسلمانوں میں ایک نئی روح پیدا کی جاوے۔ نواب صاحب کو اس سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ برابر کہتے کہ روپیہ کی کمی کے باعث کوئی اچھا کام نہیں رکنے کا۔ مگر ڈاکٹر اشرف کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہوگئے اور علی گڑھ نہ جا سکے۔ اور یہ مفید تجویز دیسی کی دیسی پڑی رہ گئی۔

احمد نگر جیل میں جب مولانا ابوالکلام آزاد غبار خاطر لکھ رہے تھے مجھ سے بارہا نواب صاحب کا ذکر آتا رہتا اور دیر تک ان کی سیرت و کلچر کے متعلق گفتگو رہا کرتی لیکن مجھے اُس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ مولانا غبار خاطر لکھ رہے ہیں جس کے موضوع خود نواب صدر یار جنگ ہیں۔

انکی موت نے ہماری قوم سے ایک ایسا شخص چھین لیا جس کا نعم البدل شاید اب مل ہی نہیں سکتا۔

ایک عرصہ کے تقاضوں کے بعد تپ بخار کی حالت میں یہ چند اوراق قلم بند ہو سکے ہیں میرے وعدہ کی آج آخری تاریخ ہے ... طرح کچھ لکھ کر آپ کو بھیج رہا ہوں۔ کوئی علمی مضمون نہ لکھ سکا لیکن ذاتی حالات کے یہ چند ورق میرے خیال میں شاید زیادہ دلچسپ ثابت ہوں۔ فقط

مخمس بر غزل مولانا جامیؒ

دلِ من گدائے نوالِ محمدؐ — سرِ من فدائے جلالِ محمدؐ
ہمہ فیضیاب از کمالِ محمدؐ — جہاں روشن است از جمالِ محمدؐ
دلم زندہ شد از وصالِ محمدؐ

خوشا صدق را امن عز و جاہے — خوشا اہل حق را ز شیطاں پناہے
خوشا جلوۂ قدس را بارگاہے — خوشا منزل و مسجد و خانقاہے
کہ در وے بود قیل و قالِ محمدؐ

زہے شان تنویر روئے دلآرا — کہ پرنور فرمودہ ارض و سمارا
تجلی از و قلب اہل صفا را — خوشا چشم کو بنگرد مصطفیٰ را
خوشا دل کہ دارد وصالِ محمدؐ

کسے راز تشویش دنیا ملالے — کسے بستہ دل را بحظے و مالے
کسے را گراں سر ز فکر محالے — بود در جہاں ہر کسے را خیالے
مرا از ہمہ خوش خیالِ محمدؐ

ز نور رخش فیض جو ماہِ کامل — بگرد سرش مہر گرداں چو سائل
بصبح ازل عکس سیمائش شامل — بوصف رخش والضحیٰ گشتہ نازل
چو واللیل شد وصف خالِ محمدؐ

زخاک رہش فخر خاقانِ عالم — گدایانِ درگاہ شاہانِ عالم
سگ کوئے یارِ بخش جانانِ عالم — بروئے زمیں گشتہ سلطانِ عالم
ہر آں کو بود پائمالِ محمدؐ

بشوق طلب در رہِ عشق پویاں — بگشتم بگرد جہاں حسن جویاں
ہو اللہ خواناں ہو الحسن گویاں — بآفاق دیدم ہمہ خوب رویاں
ندیدم جمالے جمالِ محمدؐ

غلام در او ست حسرتؔ گرامی — بود بال تاج شہاں ایں غلامی
بہ حبِ نبی شد بکونین نامی — "بصدق و صفا گشتہ بیچارہ جامیؔ
غلامِ غلامانِ آلِ محمدؐ"

(حسرت شروانی)

پھر ہم کہاں جو اس کی تجلی ہو بے حجاب — تھی مصلحت، وہ حسن جو مستور ہو گیا

"چہ کنم" کا ٹکڑا کس قدر بلیغ ہے۔ علامہ شبلی نے لکھا تھا۔ کہ یہ شعر (اگر برافگند الخ) تو دل میں رکھ لینے کا ہے۔

بعض غزلیں اول سے آخر تک مسلسل ہیں اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ ذیل میں ان کے مطلع دیئے جاتے ہیں۔

شکر اللہ کہ ز وصل تو براتم دادند — وز ستم ہائے شب ہجر نجاتم دادند

خدا سازد نصیبم وصل ...... — پریشاں خاطرم از فصل ....

اس طرح اس کا جواب جو شاعر نے محبوب کی زبان سے دیا ہے۔

شدم اینک گرفتار جسیم — زخود رفتم زرفتار جسیم

رو بیت بہ سیر باغ ندیدم گرستم — دیوانہ وار آہ کشیدم گریستم

در حریم وصل جاناں قائم وطن خواہد شدن — شمع بزم انس آں ماہ ختن خواہد شدن

ربودہ ہوش و قرار م غزال رعنائے — نگار مست خرامے بلند بالائے۔

بعض غزلیں نوت شریف میں ہیں۔ جن میں عقیدت و سلاست کا انداز بے اختیار دل کو کھینچتا ہے۔ نواب صاحب کی اردو غزلوں میں بھی فارسی غزل کی خصوصیات ایک حد تک جلوہ نما ہیں۔ اگرچہ فارسی کی سی نزاکت و لطافت نہیں۔ تاہم ان میں بھی اچھے اشعار مل جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

دل سے رخصت ہوں سب تمنائیں[1] — وہ سراپا حجاب یاد آیا!

آئینہ۔ پیکر تصویر۔ نگاہ مشتاق — جسے دیکھا تری محفل میں وہ حیراں نکلا

ایک ہی کا حسن ہے جلوہ نما کونین میں — دوسرا تو جب کہوں جب دوسرا پیدا کروں

دل کا ارماں ایک سے ہے ایک بڑھ کر انتخاب — کون سا ہمدم مٹاؤں کون سا پیدا کروں

بس اک حسرت آلودہ طرز نگہ میں — سخن کہہ گئے بے زباں کیسے کیسے!

یاس[2] پر کچھ تو عمر گذری ہے۔ — کٹ رہے گی امید پر باقی

شرم کے مارے جو نہیں لڑتیں[3] — انھیں آنکھوں نے مجھ کو مارا ہے

نواب صاحب کی نظم سے زیادہ ان کی نثر مستحق توجہ ہے۔ امید ہے ناظرین ادب اس موضوع پر قلم اٹھائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس جامعیت کے بزرگ آج کل بھی کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں۔ اور زمانے کی موجودہ رفتار کو دیکھتے ہوئے تو بہ آسانی پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ ایسی ہستیاں اب آئندہ نظر نہ آئیں گی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پسندیدہ[4] وضع لوگ — افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

---

[1] مجذوب کا شعر ہے۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی — اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

[2] فانی لکھتے ہیں:-

کچھ امید کرم میں گذری عمر — کچھ امید کرم میں گذرے گی

[3] میر صاحب کے مصرع اول میں تھوڑی سی ترمیم کر دی ہے۔ (ان کی روح سے معذرت کے ساتھ)

(علم پروری بقیہ صفحہ نمبر ۱۴ کا)

میں نے کہا یہ کیا؟ تو ان سب نے کہا کہ شاہی زمانے سے ہمارا یہی پیشہ ہے کہ ہم باغبانی کرتے ہیں اور جب کوئی بڑا افسر ہمارے گاؤں سے گذرتا ہے۔ تو اس کی خدمت میں پھولوں کی ڈالیاں پیش کرتے ہیں"۔

ان تمام واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پختہ مسلمان تھے۔ اور اس حیثیت سے ان کو مسلمانوں کی ہر چیز عزیز تھی۔ ایک طرف تو وہ علماء و مشائخ کے زہد و تقدس کے گرویدہ تھے۔ دوسری طرف ان کو مسلمان بادشاہوں میں بھی تمدنی حیثیت سے خلوص و للہیت نظر آتی تھی موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ تہذیب نے ان پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ بلکہ وہ عمر بھر مسلمانوں ہی کے قدیم تہذیب و تمدن کے معترف و گرویدہ رہے۔

قطرہ اشک

قطرۂ اشک کا مژگاں پہ ہے یہ عالم
صبحدم گھاس کی پتی پہ ہو جیسے شبنم

حسرتیں دل کی نکل جاتیں تو ز الفت کاش
ایک ہی رات کو مل بیٹھتے ہم تم باہم

سر میں انسان کے منصوبے ابھرتے کیا کیا
ہائے پر موت نے سب کر دیئے درہم برہم

بے نیازی نے کیا خون تمنا کا مری
سینہ میں دل کے تڑپنے سے ہے برپا ماتم

سر پٹے جاتے ہے اک عمر کے شکوے حسرت
مل سکے جب بیٹھ گئے دو گھڑی ہم دو باہم

حسرت شیروانی

آخری شمع!

(مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی رفیق دار المصنفین)

افسوس ہے کہ ہماری بزم دوشین کی وہ آخری شمع بھی خاموش ہو گئی جس سے مدتوں بزم کمال منور رہی یعنی اوراگست کو نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے چھیاسی سال کی عمر میں اس خاکدان سفلی کو الوداع کہا۔ عمر طبعی کو پہنچنے کے بعد موت ناگزیر ہے۔ لیکن بعض مرنے والوں کے ساتھ ایک پورا عہد اور پوری تاریخ دفن ہو جاتی ہے۔ مولانا شروانی مرحوم کا ماتم شیونات انہی میں ہے۔ وہ مشرقی و اسلامی تہذیب و شرافت کا نمونہ اور علم و عمل و فضل و کمال دین و تقوی، وقار و متانت اخلاق و تواضع کا پیکر اور تنہا ایک عالم تھے، کامل ساٹھ سال تک مسلمانوں کی قومی زندگی سے وابستہ رہے اسلئے ان کی وفات شخصی نہیں۔ بلکہ قومی حادثہ اور ایک نوع کمال و تعلیم تہذیب و شرافت کا ماتم ہے

اللہ تعالے نے ان کو دنیاوی دولت و جاہت سے بھی نوازا تھا۔ وہ خاندانی رئیس تھے اور اپنے اوصاف میں دور زوال کے امراء سے بالکل مختلف تھے، وہ خود صاحب علم، اصحاب علم کے قدردان، علم دوست، علما نواز اور علم و فن کے شیدائی اور سرپرست تھے، انکی پوری زندگی علمی اشغال میں گذری، مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا وہ ابتدا سے مدرستہ العلوم مسلم یونیورسٹی اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے رکن رکین۔ معاون و مددگار۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری، انجمن ترقی اردو کے سرپرست، اور مجلس دار المصنفین کے صدر نشین تھے، اور مدت تک ریاست حیدر آباد کے شعبہ امور مذہبی کی صدارت پر فائز رہے۔ ان کے خدمات کی فہرست بہت طویل ہے کوئی علمی و تعلیمی ادارہ انکی اخلاقی امداد و اعانت سے محروم نہ تھا مسلم یونیورسٹی نے ان خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔

وہ عربی کے عالم، فارسی کے ذوق شناس، انگریزی سے واقف، اردو کے صاحب طرز ادیب اور نکتہ سنج، سخن فہم اور سخن گو تھے، انکا ادبی ذوق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا۔ اسلامی علوم و فنون اور مسلمانوں کی علمی تاریخ سے انکو عشق تھا۔ انکا مشغلہ خالص علمی تھا۔ مختلف مذہبی، علمی، ادبی اور تاریخی موضوع پر درجنوں سے زیادہ چھوٹی بڑی تصانیف، ایک مجموعہ مضامین مقالات شروانی۔ اور دیوان فارسی[5] انکی علمی یادگار ہیں، نادر کتابوں کا بڑا شوق تھا۔ خود اپنی تلاش محنت اور زر کثیر صرف کر کے ایک عمدہ کتب خانہ جمع کیا جو نوادر کتب کا بیش قیمت ذخیرہ ہے اسکو اپنی زندگی میں مسلم یونیورسٹی پر وقف کر گئے تھے۔

ان کی ذات میں جدت و قدامت کا بڑا لطیف امتزاج تھا۔ وہ خود پرانی تعلیم و تہذیب کی یادگار لیکن زمانہ کے حالات و ضروریات سے واقف تھے، انکا وطن علی گڑھ مغربی تعلیم کا مرکز تھا۔ اس لئے وہ جدید تعلیم اور نئی مفید تحریکوں کے حامی و مددگار رہے لیکن اس کے کبھی مرعوب و مسحور نہ تھے، اور جدید تعلیم و تہذیب میں بھی اسلامی روح دیکھنا چاہتے تھے، قدیم تہذیب سے والہانہ شیفتگی تھی، انکی تحریروں میں جہاں اسکا ذکر آ جاتا، انکی بہت کم تحریریں اس ذکر جمیل سے خالی ہوتی تھیں۔ انکا قلم بے قابو ہو جاتا۔ اور انکی تحریر قدیم تہذیب کا مرثیہ بن جاتی،

صورۃً خوش جمال کشیدہ قامت، اور طبعاً نفاست و لطافت پسند تھے، وضع، قطع، لباس، رفتار، گفتار نشست و برخاست ہر چیز میں نفاست نمایاں تھی۔ بڑے خوش لباس اور جامہ زیب تھے، بڑھاپے کے نورنے اس میں اور زیادہ لطافت اور جذب و کشش پیدا کر دی تھی۔ زندگی کے تمام معمولات میں وضعداری کی شان تھی۔ پوری زندگی کسی معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کے تعلقات بہت وسیع اور مختلف و متضاد مذاق و مشرب کے لوگوں کے ساتھ تھے، جن کو آخر تک نباہا۔ سیاست سے طبیعت کو ذوق و مناسبت نہ تھی۔ اور اس خارزار سے ہمیشہ دامن بچایا۔ لیکن بہت سے اصحاب سیاست سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے جو برابر قائم رہے۔ ان پر اختلاف رائے و خیال کا اثر نہ پڑنے پایا۔ مولانا شبلی مرحوم سے ان کے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ جو ان کے بعد وراثۃً ارکان دار المصنفین کے حصہ میں آ گئے۔ اور آخر تک برابر قائم رہے۔ وہ دار المصنفین کے محض قانونی صدر نہ تھے، بلکہ اس کے اور اس کے کارکنوں کے ساتھ ان کو دلی تعلق تھا۔ چنانچہ پیرانہ سالی میں کئی مرتبہ اس اجڑے دیار میں آنے کی زحمت گوارا کی۔ جب آنا ہوتا تو بلا لحاظ عمر و رتبہ ہر شخص کی قیام گاہ پر جا کر ملتے، اور بڑی شفقت و محبت سے خیریت پوچھتے، اب اس وضعداری کی مثال کہاں ملے گی۔

مرحوم کی ذات پر ایک عزیزہ رواد اسکی خصوصیات کا خاتمہ ہو گیا۔ جس کا ذکر اب صرف تاریخ کے اوراق میں ملے گا۔ اللہ تعالے اس مرقع کمال کی تربت پر رحمت و مغفرت کے پھول برسائے

---

[5] دیوان اردو بھی کا روان حسرت کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جو زادِ راہ مطبع، محمد علی روڈ بالمقابل قلعہ علی گڑھ سے ۱۲ میں ملتا ہے۔ شاہد شروانی کے متعلق دقت کی رسائی کیتا مشروط (شاہد شروانی)

دوسرے اعزہ - خادم نواس مہمان اور متوسلین ہوتے - ان کا مجموعی اخلاق و فضائل کے لحاظ سے وہ ایک نادر الوجود بزرگ تھے - جن کی مثالیں اب دیکھنے میں نہ آئیں گی - علم و امارت کے اجتماع کے پیش نظر اگر مرحوم کو خود اپنی مثال پیش کیا جائے تو بے جا نہیں - در اصل ان کی ذات سے ہندوستان نے ایک ایسا شخص کھو دیا جو بجائے خود ایک جماعت (A Class by himself) تھا -

دہ ما کان قیس" ہلکہ ہلک واحد   ولکنہ بنیان قوم تہدما !

اوپر ان کے علمی کمال کا ذکر آ گیا ہے - اس کا اقتضا تھا کہ ان کے علمی کارناموں پر مفصل بحث کی جائے - لیکن ایک تو وقت کی قلت اور کام کی کثرت دوسرے اس بحث پر پہلے کچھ لکھا جا چکا ہو لہٰذا سردست تفصیل سے قطع نظر کی جاتی ہے - تاہم "ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ" نواب صاحب عربی کے عالم - فارسی کے ماہر - اور اردو کے ادیب و شاعر تھے - ان کی متعدد مذہبی اور علمی تصانیف اور انشا پردازانہ تحریر غالباً دوسرے اصحاب لکھیں - فی الحال ان کی فارسی اور اردو شاعری پر ایڈیٹر صاحب جمہور کی تعمیل فرمائش میں چند سطور حاضر ہیں -

نواب صاحب فارسی اردو پر پوری قدرت رکھتے تھے - اور دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے - لیکن ظاہر ہے کہ یہ شغل شوق کے طور پر صرف احیاناً ہوتا تھا - جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انکا کلام حجم میں بہت مختصر ہے - اور نیز اسی وجہ سے ان کے اشعار میں خال خال فنی اسقام بھی نظر آتے ہیں - ریاست کے انتظامات اور ملک کے علمی ادارات کے کاموں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ ان امور پر توجہ ہوتی - اگر پوری توجہ اور مشق کا موقع ملتا تو ان کا شمار چوٹی کے شعراء میں ہوتا -

مرحوم نے ۴۰ سال کی مدت میں جو مجموعہ کلام چھوڑا ہے وہ فارسی میں کل ۲۸ غزلیات پر مشتمل ہے - اردو کلام بھی تقریباً اسی قدر ہوگا - دوسرے اصناف شعر کم تر ہیں اور چنداں مستحق توجہ نہیں - لہٰذا ہم غزل ہی کے بیان پر اکتفا کریں گے -

غزل اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک ایسی صنف ہے جو فارسی زبان کے علاوہ (اور چاہئے تو اردو کو بھی شامل کر لیجئے) دنیا کے کسی لٹریچر میں نہیں پائی جاتی - عشق و محبت کے لطیف جذبات اور خیالات کو نرم اور شستہ زبان میں اس طور پر بیان کیا جائے کہ کل کا ہر جزو بجائے خود ایک مستقل اور مکمل خیالی وحدت (Unit) ہو - اور قافیے کا ایک خاص نظام قائم رہے - اسی کا نام غزل ہے - اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس کا موضوع حکایت از معشوق ہونا چاہیئے - یہ اور بات ہے کہ ضمناً دوسرے مضامین بھی آ جائیں - جس وقت شاعر یا عاشق اپنے دل سے باتیں کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے - اس وقت یہ صنف سخن وجود میں آتی ہے - یہی وجہ ہے کہ اس کو داخلی شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے -

یہ درست ہے کہ فارسی میں آدم الشعرا رودکی سے خاتم الشعرا غالب تک اور اردو میں ولی سے جگر تک ہزاروں غزل گو پیدا ہوئے - لیکن صاحب امتیاز یا صاحب طرز صرف معدودے چند ہی گذرے اس سے صاف ظاہر ہے کہ غزل ایک طرف تو اتنی آسان ہے کہ مبتدی شعرا شعر گوئی کی ابتدا غزل ہی سے کرتے ہیں - اور دوسری طرف اس قدر مشکل ہے کہ اس میں امتیازی درجہ چند خوش نصیبوں کو ہی ملا ہے - یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ دور حاضر میں جس قدر طوفان غزل کے خلاف اٹھا - اتنا کسی اور صنف کے خلاف نہیں اٹھا - کسی نے اس پر بے ربطی کا الزام لگایا - کسی نے اسکو جاگیردارانہ نظام کی یادگار ٹھہرایا کسی ناقد نے کہا کہ اس میں غیر واقعیت اور یکسانی کا جال ہے - کوئی بولا کہ پابندیوں اور تکلفات سے بوجھل ہے -

یہاں موقع نہیں کہ ان اعتراضات کی تحقیق کی جائے - صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ تصوف کی طرح غزل میں آخر تو کوئی جاذبیت ہے کہ عام تو عام خاص بھی اس پر سر دھننے لگتے ہیں - اس سے یہ قیاس نہ کرنا چاہیئے کہ ہمارے غزل گو شعراء ارتقائی رفتار کا ساتھ دینے سے قاصر رہے ہیں - سچ پوچھئے تو دور جدید میں فارسی غزل نہ سہی - اردو غزل نے اپنے طرز فکر اور اسلوب بیان میں کافی تغیرات کر لئے - بے محل نہ ہوگا اگر یہاں اردو کے مشہور اہل قلم ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی رائے پیش کر دی جائے - موصوف لکھتے ہیں -

" گذشتہ دو سو برس میں میر صاحب کے زمانے سے لے کر حسرت و جگر کے موجودہ دور تک اردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں - لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا - اس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہ صنف سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے - جو اس کے جاندار ہونے کی دلیل ہے - "

دوسری اصناف شعر (مثلاً قصیدہ - مثنوی) خارجی امور سے بحث کرتی ہیں مگر غزل کا میلان تمام تر داخلی ہے - یہی سبب ہے کہ جو غزلیں اس معیار پر پوری نہ اتر سکیں - ان کو قبول عام کے دربار میں بار نہ ملا - یہ صحیح ہے کہ غزل کے سانچے صدیوں کے عمل سے ایسے ڈھلے ہوئے موجود ہیں کہ ایک متشاعر بھی ان سے کام لے سکتا ہے لیکن حقیقی اور غیر حقیقی شاعری کا فرق ادنیٰ تامل سے کھل جاتا ہے - اور ناقد بہ آسانی کہہ سکتا ہے - کہ فلاں غزل یا شعر شاعر کے ذاتی تجربے کا نتیجہ ہے یا محض نقالی - مضامین کے چمن میں سوز دل کی بو ہے - یا صرف کاغذی پھولوں کی رنگینی -

یہاں سوال کیا جا سکتا ہے کہ نواب صاحب نے اپنی فکر کی جولانی کے لئے غزل کا میدان کیوں پسند کیا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف مردانہ حسن کا ایک ممتاز نمونہ ہونے کے ساتھ حسن سے فطری مناسبت اور جمالیات کا فطری ذوق بھی رکھتے تھے - اس کے ساتھ ہی نفاست و لطافت - تجمل و تنعم کے ماحول میں شروع سے انھوں نے پرورش پائی تھی - جس سے طبیعت میں غزل کی طرف رجحان ہوا - علاوہ بریں اردو اور فارسی غزل کے سرمایہ پر ان کی گہری نظر تھی - اس چیز نے بھی شوق کو اکسایا - لیکن دوسرے مشاغل سے اتنا وقت نہ تھا - کہ شاعری پر زیادہ توجہ کرتے - تاہم ان کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جن پر ذوق سلیم وجد کرتا ہے -

جیسا کہ اپنے مقالات میں خود لکھتے ہیں وہ غزل کے لئے چار چیزیں ضروری قرار دیتے ہیں - (۱) مضمون (۲) خیال - (۳) زبان - (۴) طرز ادا - مضمون سے غزل کا موضوع یعنی حسن و عشق کا بیان اور خیال سے فکر و تخیل مراد ہے - ان میں بظاہر دو یعنی مضمون اور زبان تو شاعر کو سوسائٹی سے ملتی ہے - اور خیال اور طرز ادا ذاتی ہوتی ہے - مگر سچ پوچھئے تو ایک اچھے شاعر کے یہاں چاروں چیزیں ایک امتیازی حیثیت کے ساتھ اس کی انفرادیت کا ٹھپہ لئے ہوئے ملیں گی - آیئے اس نقطۂ نظر سے ان کی شاعری (غزل) پر بحث کریں -

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا - ان کو غزل سے یک گونہ طبعی لگاؤ تھا - ان کے اکثر اشعار میں صدق جذبات اور لطافت بیان دل کو کھینچتی ہے - اسی کا اثر ہے کہ ان کی شاعری عالیہ شاعری ہو گئی ہے - دوسرے الفاظ میں انھوں نے غزل کو اس کے حقیقی معنی میں برتا ہے - اور ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے - مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں -

اے نسیم سحری رشحہ فیضے زاں کو   تا زنی آب تسلی دل سوزانے را

اے صبح کی ہوا محبوب کی گلی سے فیض کے چھینٹے لا - تاکہ میرے جلے ہوئے دل پر پانی پڑ کر تسکین کا باعث ہو - اور سنئے -

رہ روان شوق از ما سالہا آرند یاد   نقشہا انگیخت در راہ محبت گام ما

عشق کے راہ رو ہمیں برسوں یاد کریں گے - کیونکہ ہمارے قدموں نے اس راہ میں چل کر ان کے لئے نشان چھوڑ دیئے ہیں - جس سے ان کو چلنے میں آسانی ہوگی - کسی استاد کا شعر ہے -

دعائیں دیں مرے بعد آنیوالے میری وحشت کو   بہت کانٹے نکل آئے ہیں میرے ساتھ منزل سے

دلم بہ ساغر و مینا نمی کشد حسرت   کہ بردہ نرگس مستانہ زخود بارا

اے حسرت مجھے ساغر و مینا کی طرف رغبت نہیں ہوتی - کیونکہ مجھ کو کسی کی نرگس مست نے بیخود کر رکھا ہے - خواجہ عزیز لکھنوی شاگرد غالب نے اس شعر کو بہت پسند کیا تھا -

ز چشم سرخوش ساقی اشارۂ کافیست   دلم بہانہ بجوید شکست پیماں را

میرا دل توبہ توڑنے کے لئے بہانہ ڈھونڈھ رہا ہے - ساقی کی چشم مست کا اشارہ چاہیئے کہ میں توبہ کو ٹھکانے لگا دوں -

باد مین علاج تب دل نمی کند   عیسیٰ دمی ز گوشۂ داما نم آرزوست

انداز بیان اور لطف بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی - فرماتے ہیں کہ باغ کی ہوا سے میری تپ دل کا علاج ممکن نہیں - کسی کے گوشۂ دامن کی ہوا ہی میرے حق میں مسیحائی کر سکتی ہے - ایک ایرانی کہتا ہے -

آتش دل شد بلند از کف خاکسترم   باز مسیحائے شوق جنبش داماں کیست

ایں ہمہ پاکی گوہر نتواں یافت بہ خاک   مگر از شیرۂ جانت بد سرشتہ ساختہ اند

یعنی خاک میں تو یہ لطافت ہو نہیں سکتی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرا جسم روح کے جوہر سے تیار کیا گیا ہے - نازک خیالی کی حد ہے - جب جسم جوہر روح سے بنا ہے - تو خدا جانے روح کتنی لطیف ہوگی - اس غزل کے دو شعر اور سننے کے قابل ہیں -

بے نیا زانہ ز سیر گل و گلشن گذرند   بیدلانے کہ بہ گل پیرہنے ساختہ اند

سبحان اللہ - جو بیدل کسی گل پیرہن سے عہد محبت کر چکے ہیں وہ سیر باغ سے بے نیازی کی ادا سے گذر جاتے ہیں - خیال کی پاکیزگی اور زبان کی قدرت تعریف سے مستغنی ہے -

منت را نکشند نافہ و غنچہ نکشند   سرخوشانے کہ بہ بوئے دہنے ساختہ اند

جو مست کسی کی بوئے دہن سے لگاؤ رکھتے ہیں وہ نافہ و غنچہ کی خوشبو کا احسان کیوں اٹھانے لگے - بوئے دہنے کا ٹکڑا استادانہ ہے - پھر ساختہ اند کا لطف بھی کچھ کم نہیں - حقیقت یہ ہے کہ یہ چیزیں ترجمے کے بار کی بھی متحمل نہیں ہو سکتیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نازک شیشہ ہے چھوا اور ٹوٹا -

نہ کردہ جلوہ بت شوخ و باختیم دل و دیں   اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم

دوست نے ابھی جلوہ نہیں دکھایا - اور یہاں دل و دیں کھو بیٹھے - اگر اس نے نقاب الٹ دی تو اس وقت کیا گذرے گی - ایک صوفی کہہ سکتا ہے - کہ ابھی تو ہم نے دل و دیں نثار کیا ہے - جب نقاب الٹ دی جائے گی تو ہماری ہستی ہی کہاں رہے گی -

انوار اللہ کی وفات کے بعد مملکت آصفیہ کے عہدۂ صدرالصدور پر سنہ ۱۳۳۶ھ مطابق سنہ ۱۹۱۸ء میں فائز ہوئے۔ اور اس منصب پر بارہ تیرہ سال رہے۔ صدرالصدوری سے متعلق دو محکمے تھے۔ صدارت العالیہ اور امور مذہبی صدارت العالیہ خالص اسلامی محکمہ تھا۔ جو حضور نظام کے براہ راست ماتحت تھا۔ امور مذہبی ایک عاملانہ محکمہ تھا۔ جو ممالک محروسہ سرکار آصفیہ کے علم مذہبی نظم و نسق سے متعلق تھا۔ مولانا شروانی نے ان دونوں محکموں کی اصلاح بڑی توجہ اور سرگرمی سے کی۔ جس کا صلہ ان کو سنہ ۱۳۴۱ھ میں نواب صدر یار جنگ " کے خطاب کی شکل میں ملا۔ قیام حیدرآباد کے زمانے میں یہاں کے باشندوں پر ان کی پاکیزہ سیرت کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ وہاں کی تمام علمی و ادبی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا۔ اور نواب عماد الملک مرحوم کے ذمہ جو ادبی فرائض تھے وہ ان کے بعد ان ہی کے سپرد کر دیئے گئے۔ اور جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ جامعہ کی مجلس دینیات کے بھی امیر تھے۔ اور اپنے قیام کے دوران میں کتب خانۂ آصفیہ کی مجلس نظم کے صدر الصدور، اور مجلس انتظامی کے نائب صدر۔ اشاعت علوم کے صدر۔ دائرۃ المعارف کے رکن۔ مدرسہ نظامیہ کی مجلس کے صدر اور انجمن احترام اوراق متبرکہ کے نگران اعلیٰ بھی رہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن میں تھی۔ تو مولانا عبدالحق سے پہلے اس کے بھی سکریٹری رہے۔

حیدرآباد دکن سے سنہ ۱۹۳۰ء میں پنشن پائی۔ حیدرآباد ہی کے قیام کے زمانہ میں غالباً سنہ ۱۹۲۶ء میں حرمین شریفین کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔

مکہ معظمہ میں قاری سید عبدالرحیم کو پورا کلام پاک سنایا۔ اور مدینہ طیبہ میں قاری حسن شاعر سے ان کا رسالہ قرأت پڑھا ان سے آخری سبق مسجد نبوی میں لیا۔ اور قرأت کی سند حاصل کی۔

حیدرآباد سے سبکدوشی کے بعد ان کی زیادہ تر توجہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلم یونیورسٹی کے، مصنفین اور ندوۃ العلماء کی طرف رہی

چار منظر!

(پروفیسر محمد ہارون خاں شروانی)

(۱) سنہ ۱۹۱۹ء

یکم ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۸ اگست سنہ ۱۹۱۹ء کا مبارک اور سہانا دن ہے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی صدرالصدور مملکت آصفیہ کے گھر کے بچے بچے کا چہرہ امید اور خوشی سے کھلے پھول کی طرح ہو رہا ہے۔ ایک جلسہ میں شرکت اور صدارت کے لئے مولانا تیاری کر رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت خسرو دکن نے اپنے صدرالصدور کو اپنے نئے جامعہ کا معین امیر اور وائس چانسلر بنا کر "جامعہ" دونوں کو سرفراز کیا ہے۔ آج اس جامعہ کے افتتاح کی تیاریاں ہیں خود فرمان خسروی کے بموجب دس بجے کا وقت افتتاح کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اور یہی خواہان ملک کی ایک دیرینہ آرزو بر آنے کو ہے۔ مولانا ناشتہ کرنے کے بعد اس خطبہ کی نظر ثانی میں مشغول ہیں۔ جو پڑھنے والے ہیں۔ ساڑھے نو بجے چھوٹا سا قافلہ ان کے دولت خانہ سے جاتا ہے۔ اور امیر افضل حسین مرحوم کے مکان متصل توپ کے سانچہ کے قریب ہے وقت سے پانچ منٹ پہلے پہنچ جاتا ہے۔ وہاں سلطنت کے امرا و عظام جنہیں بارگاہ خسروی سے نئے جامعہ کی سینٹ یا مجلس تقنا کا ممبر بنایا گیا ہے۔ موجود ہیں۔ چھوٹا سا ہال ہے۔ سترہ پروفیسر اور مددگار پروفیسر ایک طرف اپنی علمی عباؤں میں، دوسری طرف نئی سنیٹ کے رکن سامنے برآمدے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سب سے پہلے طلبا جو تعداد میں ۷۰ - ۸۰ سے زیادہ نہیں۔ بیچ میں ایک طرف کو صدارت کی کرسی پر مولانا شروانی صاحب اور ان کے دونوں طرف نئی یونیورسٹی کی مجلس اعلیٰ کے ممبر۔ یہ ہے نشستوں کی ترتیب۔ مولانا شروانی ایک دیدہ زیب عمامہ اور دکھنی جامہ واری اچکن پہنے اور کندھوں پر مسلم یونیورسٹی کی سنیٹ کی گاؤن ڈالے بیٹھے ہیں۔ پہلے کلام پاک کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہوم سکریٹری مسٹر حیدری (جو اب ہیں رائٹ آنریبل نواب حیدر نواز جنگ سر اکبر حیدری صدرالمہام دولت آصفیہ ہوئے) فرمان مبارک مورخہ ۱۴ رجب سنہ ۱۳۳۵ھ متعلق قیام جامعہ عثمانیہ پڑھ کر سناتے ہیں۔ جسے سب کھڑے ہو کر سنتے ہیں۔ اس کے بعد شروانی صاحب وائس چانسلر کی حیثیت سے حسب ذیل خطبہ پڑھتے ہیں۔

حضرات! ارکان مجلس اعلیٰ معزز رفقاء و دیگر معززین۔ اساتذۂ کرام اور عزیز طلبہ۔ آج کا مبارک دن ایک تاریخی دن ہے اور تاریخ غرۂ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۱ھ کو اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ کے عہد ہمایونی کا وہ علمی کارنامہ شروع ہوتا ہے۔ جو بفضل خدا صدیوں تک یادگار رہے گا۔ اس سرزمین میں مدت ہائے دراز سے رود موسیٰ جاری ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا یہ چشمہ فیض رود علمی بن کر مردہ دلوں کو زندہ کرنے اور جہالت کے مریضوں کو شفا بخشنے میں اعجاز مسیحا دکھائے گا۔ جس طرح خلیفہ ہارون رشید کے بیت الحکمۃ اور خواجہ نظام الملک طوسی کے بغداد و نیشاپور کے مدارس نظامیہ کا نام صدہا برس گزرنے پر بھی آج تک روشن ہے۔ اسی طرح جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ اور درسگاہوں کے کارنامے صفحات تاریخ کو صدیوں تک منور اور درخشاں رکھیں گے انشاء اللہ العزیز۔

حضرات۔ علم بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کو بنی نوع انسان میں پھیلانا سب سے بڑا فیض ہے۔ تعلیم ملکی زبان میں "ایک ایسا دلکش خواب تھا جو برسوں ہمارے ملک میں دیکھا گیا۔ مبارک عہد عثمانی کی یہ کیسی برکت ہے کہ ہم اس روح پرور خواب کی تعبیر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں

مرہ مصاحب دماغ از رشک می تپاید کہ من دیدم
زلیخا کو رشد در حسرت خوابے کہ من دیدم

اعلیٰ حضرت خسرو دکن کی سرپرستی میں یہ مجلس اعلیٰ رفقاء اور یہ اساتذہ کا مجمع اس لئے قائم ہوا ہے۔ کہ نعمت علم کو زیادہ سہل الحصول اور زیادہ سریع الفہم بنا کر (جس طرح حضور ملک معظم قیصر ہند نے اپنے شاہی پیام میں فرمایا تھا) علم و امید کو غریب جھونپڑوں تک پہونچا دیں۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ اور ہے لیکن اعلیٰ حضرت کی شاہانہ سرپرستی اور نواب سرکار عالی کے محکمۂ تعلیمات کی جانفشانی اور ارکان دارالترجمہ کی محنت و عرق ریزی نے اس دشوار گزار مرحلے کو اتنا آسان کر دیا۔ کہ آج ہمارا قافلہ بخیر و خوبی جادہ پیما ہوتا ہے۔ خداوند تعالیٰ اسے منزل مقصود تک صحیح و سلامت پہونچائے۔

جامعہ عثمانیہ کی آئندہ نیک نامی و کامیابی کا زیادہ تر دار و مدار اس کے محترم اساتذہ اور عزیز طلبہ کی کوشش پر ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے حکام نے پوری کوشش لائق اور فاضل علماء کے فراہم کرنے میں کی ہے۔ اور منشور خسروی نے علوم ظاہری کے ساتھ علم دین اور اخلاقیات کو لازم قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ توقع بالکل بجا ہے کہ ہمارے اساتذہ کی تعلیم میں علوم جدیدہ کی وسعت اور نئے اعلیٰ اصول تعلیم کے دوش بدوش قدیم استادوں کی شفقت، دلسوزی اور متانت و وقار کا جلوہ ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ جو تعلیم قدیم کا سرمایۂ ناز ہے۔ اور اس طرح جامعہ عثمانیہ کی تعلیم قدیم و جدید دونوں تعلیموں کی برکتوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہوگی۔ اور اس کے شاندار نتائج چار دانگ عالم میں اپنا کوس عظمت بجائیں گے۔

یارب ایں آرزوے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں

خطبہ نہایت انہماک سے سنا جاتا ہے اس کے بعد پروفیسر ولنکر صاحب انگریزی ادب پر پہلا لیکچر دیتے ہیں۔ اور ساڑھے گیارہ بجے جلسہ برخاست ہو جاتا ہے۔

(۲) سنہ ۱۹۲۵ء

نومبر کے آخری ہفتہ کا ایک ٹھنڈا دن ہے شام کا وقت ہے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اب نواب صدر یار جنگ بہادر کے خطاب سے سرفراز ہو چکے ہیں نواب صدر یار جنگ بہادر کی کوٹھی "امید منزل" کے پائیں باغ کی وسیع لان مہمانوں سے بھری ہوئی ہے۔ انواع و اقسام کے کیک پیسٹری اور پھل وافر مقدار میں موجود ہیں۔ اندازاً ڈیڑھ پونے دو سو مہمانوں کی نشست کا انتظام کرنے تیس بتیس چھوٹی بڑی میزیں جگہ جگہ سلیقہ سے لگی ہیں۔ اور ہر ایک کے چاروں طرف پانچ پانچ چھ چھ مہمان بیٹھے ہیں۔ حیدرآباد کے عمائد وزراء اور جامعہ عثمانیہ کے رفقاء اور اساتذہ سب ہی نظر آتے ہیں۔ نواب صاحب نہایت خوش و خرم اپنے خاص انداز سے مسکراتے ہوئے ایک باوقار نوجوان کو ساتھ لے کر ایک ایک شخص سے ملا رہے ہیں۔ ان کا چہرہ مسرت سے تابناک ہے۔ لوگ سرگوشیاں کر رہے ہیں کہ یہ خوش قسمت شخص کون ہے۔ قصہ بس یہ ہے کہ ایم۔ اے دینیات کے امتحان میں ایک لڑکا عبدالقادر کامیاب ہوا ہے۔ اور یہ تقریب صرف اس کے اعزاز میں ہے۔ اس پر تکلف عصرانہ کے بعد اپنے عادی لطیف پیرایے میں ہنس کر اور گویا مجرم مجبور ہو کر ایک دلآویز تقریر فرماتے ہیں اور اس میں عبدالقادر کی کامیابی کو گویا جامعہ عثمانیہ کی کامیابی قرار دیا جاتا ہے۔ ہر شخص کہتا ہے کہ شاید پہلا ہی موقع ہے کہ کسی یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر نے محض ایک گریجویٹ کے اعزاز میں ایسی پارٹی دی ہو۔ لیکن نواب صاحب گویا اپنی زبان حال سے اس کا جواب دے رہے

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور انکی علم پروری

(مولانا عبدالسلام ندوی رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ)

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے تعلقات گوناگوں لوگوں سے گوناگوں تھے، لیکن خاکسار کے تعلقات ان سے صرف علمی تھے اور عمر بھر یہی تعلقات قائم رہے۔ اور یہ نہایت عجیب بات ہے کہ یہ تعلقات جس حیثیت سے قائم ہوئے اور رفتہ رفتہ بتدریج ان میں جس طرح ترقی ہوتی گئی ان سے ہر موقع پر مجھ کو ان کی علم پروری کی شان نظر آئی۔

اول اول جب میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا تو ان سے میری مطلق شناسائی نہ تھی۔ نہ میں ان کے فضائل و کمالات سے واقف تھا اور نہ وہ میرے علمی شوق و شغف سے واقف تھے۔ اتفاق سے وہ ایک بار ندوۃ العلماء کے کسی جلسہ میں شرکت کے لئے تشریف لائے اس وقت مولانا شبلی ندوہ ہی میں ایک کوٹھے پر مقیم تھے۔ اور اس کوٹھے کے نیچے جو کمرہ تھا اس میں بعض طلباء رہتے تھے اور مولانا شبلی کے کوٹھے کا جو زینہ تھا۔ وہ اسی کمرے سے متصل تھا۔ اور چونکہ اس کمرے میں زینے کے متصل تھا۔ اور چونکہ اس کمرے میں زینہ کے متصل ایک دروازہ لگا ہوا تھا۔ اس لئے اس کمرے سے گذر کر ان کے کوٹھے پر آسانی کے ساتھ پہونچ سکتے تھے۔ میں اسی کمرے میں لیٹا ہوا ایک کتاب کے مطالعہ میں جو غالباً مولانا شبلی کی کتاب الکلام تھی۔ اسقدر منہمک تھا۔ کہ مجھ کو دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ اسی حالت میں ایک خوشرو اور کشیدہ قامت بزرگ مولانا شبلی کے کوٹھے پر جانے کے لئے اس کمرے سے گذرے جنکے ان کے پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اور میں نے ان کے شاندار چہرے پر نظر ڈالی تو کتاب بند کر لی اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ ایک حسن ادب تھا۔ لیکن ان کو میرے مطالعہ کا اتنا حرج بھی گوارا نہ ہوا ٹھہر گئے اور پہلے ہاتھ کے اشارہ پھر زبان سے ارشاد فرمایا کہ "لیٹے رہو اٹھنے کی ضرورت نہیں۔" اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے اس علمی انہماک سے نہایت مسرور تھے۔ اور اگر میں وہ تہ طور پر ان کی تعظیم کو کھڑا نہ ہو جاتا۔ تو وہ اس علمی شوق و شغف کی وجہ سے اسکو بے ادبی نہ خیال کرتے۔ بلکہ مجھے معذور سمجھتے۔

اس کے بعد ایک مدت تک مجھ میں اور ان میں کوئی علمی رابطہ قائم نہ ہوا۔ البتہ بحیثیت شریک اڈیٹر کے الندوہ میں ان کے جو مضامین شائع ہوتے تھے ان کو بشوق پڑھتا۔ اور ان کے فضل و کمال کا معترف ہوتا جاتا۔ لیکن چند دنوں کے بعد جب میں نے خود الندوہ میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ اور میرے پہلے ہی مضمون کو جو "تناسخ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ مولانا شبلی نے نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ اور مدحیہ الفاظ کے ساتھ اسکو الندوہ میں شائع کیا۔ تو خود بخود بغیر کسی تعارف کے وہ مجھ کو بزرگانہ نظر شفقت سے دیکھنے لگے۔ اور جب ندوہ میں آتے اور مجھ کو مولانا شبلی کے یہاں دیکھتے تو خیریت مزاج دریافت کرتے۔ میرے علمی مشاغل کا حال پوچھتے۔ اور مسرور ہوتے۔ ان میں میں نے ایک عجیب اخلاقی خصوصیت یہ دیکھی کہ باوجود اس خسروانہ اور بزرگانہ تعلقات کے انھوں نے کبھی مجھ کو یہ محسوس ہونے نہیں دیا کہ وہ ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے مجھ سے ملتے ہیں۔ بلکہ متانت و وقار کے ساتھ اس میں ایک قسم کی مساویانہ شان نظر آتی تھی۔ ایک مدت تک یہی حالت قائم رہی کہ اس علمی اشتراک کی بنا پر میں ان کو عزت کی نگاہ سے اور وہ مجھ کو محبت کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔

اس کے بعد دار المصنفین قائم ہوا اور میں نے مضمون نگاری کے محدود دائرے سے نکل کر تصنیف و تالیف کے وسیع میدان میں قدم رکھا۔ تو علمی تعلقات روز بروز بڑھتے اور مستحکم ہوتے گئے۔ میں نے اپنی کتاب "اسوۂ صحابہ" لکھنی شروع کی۔ تو خاص اپنے کتب خانہ کی ایک نادر علمی کتاب "نزہۃ الابرار" مرحمت فرمائی۔ تاکہ وہ بطور ایک ماخذ کے کام آئے۔ اس کتاب کے چند اجزاء تیار ہو گئے تو ان کو طلب کر کے بغور انکا مطالعہ کیا۔ اور چند مفید اصلاحات و ترمیمات کیں۔ میں نے ایک سرخی قائم کی تھی "استحکام ایمان" اس کو بدل کر "قوت ایمانی" کر دیا۔ اور ہر صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے کہ یہ کسقدر مفید اور برجستہ اصلاح تھی لیکن باایں ہمہ حسن اخلاق کا یہ عالم تھا۔ کہ ملنے جلنے میں کبھی استادانہ اور شاگردانہ حیثیت ظاہر ہونے نہیں پائی۔ بلکہ وہی مساویانہ علمی تعلق قائم رہا۔

دار المصنفین کے قائم ہونے کے بعد جہانتک خط و کتابت یا معمولی ملاقات کا تعلق ہے برابر قائم رہا۔ لیکن مجھ کو ایک مدت تک کبھی ان کے ساتھ دیر تک رہنے اور ان کی تمام علمی، مذہبی اور اخلاقی خصوصیات کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن دار المصنفین ہی کے تعلق سے مجھ کو متعدد بار یہ موقع بھی حاصل ہوا اور علمی شوق و شغف کے ساتھ ان کی بہت سی مذہبی اور اخلاقی خصوصیات بھی نظر آئیں۔ پہلی بار میں کسی کتاب کے لئے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے علی گڑھ گیا۔ اور چونکہ حبیب گنج علی گڑھ سے بالکل متصل ہے اس لئے کتب خانہ حبیب گنج سے کیونکر بے نیاز ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ مجھے خود حبیب گنج کے دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ اس لئے میں نے چند روز کے لئے وہاں جانا ضروری سمجھا۔ اور مولانا سلیمان اشرف سے اس کے متعلق برابر گفتگو کرتا رہا۔ ایک روز انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ "حبیب گنج کب جائیے گا" حسن اتفاق سے اس وقت تیرھویں اور چودھویں کی چاندنی راتیں تھیں اور میں کالج کی وسیع اور پرفضا سرزمین میں شب ماہ کی سیر کا لطف اٹھا رہا تھا۔ میری زبان سے نکل گیا کہ "جب چاندنی راتیں ختم ہو جائیں گی تو حبیب گنج جاؤنگا۔ بھلا ایسی چاندنی مجھے حبیب گنج میں کہاں ملے گی"؟ مولانا سلیمان اشرف نے مولانا شروانی مرحوم سے اسکا تذکرہ کیا۔ تو مولانائے مرحوم کی رئیسانہ شان کا ظہور ہوا۔ مجھ سے دریافت کیا۔ کہ "کیا تم نے یہ فقرے کہے تھے"؟ میں نے اقرار کیا۔ تو فرمایا۔ کہ "حبیب گنج کی سخت توہین ہوئی"۔ لیکن یہ فقرہ ہنس کر فرمایا تھا۔ اس میں کسی قسم کی خشونت نہ تھی۔ تاہم اس سے بھی لطف و مدارات کے ساتھ رئیسانہ تمکنت کا اظہار ہوتا تھا۔ میں نے یہ باتیں اس لئے نقل کیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ مولانائے مرحوم میں خاکساری اور لطف و مدارات کے ساتھ رئیسانہ شان و شوکت کا ایسا لطیف امتزاج ہوا تھا کہ باوجود لطف و کرم کے ہر موقع پر ان کی عالمانہ اور رئیسانہ وقار و تمکنت کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ بہر حال میں حبیب گنج گیا۔ اور وہاں تین چار روز رہ کر مولانائے مرحوم کی مہمان نوازی سے بے حد مسرور ہو کر واپس آیا۔ اور مجھے وہاں لطف و کرم، علم پروری اور روحانیت کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔

اس کے بعد سوانح شبلی کے لکھنے کا کام میرے متعلق ہوا۔ اور جب میں نے اس کے تمام اجزاء مرتب کر لئے تو اس مسودہ کے دکھانے کے لئے مجھے حبیب گنج جانے کا اتفاق ہوا۔ اور اس تقریب سے مجھے مہینوں حبیب گنج میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ پہلے تو چند روز علی گڑھ ہی میں حبیب منزل میں قیام کیا۔ اس کے بعد خود مولانائے مرحوم کے ساتھ حبیب گنج گیا۔ اور مہینوں مقیم رہا۔ اور اسی وقت مجھے مولانائے مرحوم کی اصلی علمی زندگی کے مطالعہ کا موقع ملا۔ روزانہ یہ معمول تھا کہ صبح کے ناشتہ سے فارغ ہو کر کتب خانہ میں تشریف لے جاتے اور گیارہ بجے تک مطالعہ کتب بینی میں مشغول رہتے۔ اسی حالت میں میں سوانح شبلی کا مسودہ پیش کیا کرتا۔ اور اسکو بہ نظر غائر مطالعہ کرتے اور اس میں مناسب حک و اصلاح فرماتے کتب خانے سے اٹھ کر آتے تو کھانا کھاتے اور آرام فرماتے۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ اور خربوزے کی فصل تھی۔ چار بجے کے بعد خربوزے آتے۔ اور خربوزہ کھانے کے بعد شربت کا دور چلتا۔ ہر ایک کے سامنے خربوزہ کا ڈھیر لگا ہوتا۔ اور سب کے ہاتھ میں چھری دیدی جاتی۔ مجھ پر یہ خاص لطف و کرم تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے خربوزہ اٹھا کر دیتے اور فرماتے کہ "میں جو خربوزہ دوں اسکو کھاؤ"۔ اسی زمانے میں مولانا عبد اللطیف صاحب بھی اصول حدیث پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ اور کتب خانہ حبیب گنج سے معلومات حاصل کرنے کے لئے حبیب گنج میں مقیم تھے۔ شام کے وقت باغ کا دروازہ کھلتا۔ تو ہم سب باغ میں چلے جاتے اور باہم علمی گفتگو ہوتی۔ اور میں خاص طور پر مولانائے مرحوم کے علمی شوق و شغف سے متاثر تھا ایک روز میں نے مولانا عبد اللطیف صاحب کے سامنے اس اثر کو ظاہر کیا۔ تو بولے کہ "حبیب الرحمن خاں اس حیثیت سے بے نظیر آدمی ہے"۔ ایک بار اور بھی مجھے اسی قسم کی علمی ضرورت سے حبیب گنج جانا پڑا۔ میں نے اسلامی تمدن ہند پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اور مولانائے مرحوم کو اس موضوع سے بے انتہا دلچسپی تھی۔ اور اس کے متعلق برابر پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے۔ جب اسکا مسودہ تیار ہو گیا تو اس کے دیکھنے اور مزید معلومات فراہم کرنے کے لئے مجھ کو خود طلب فرمایا۔ میں وہ مسودہ لے کر گیا اور اس کو بھی بغور دیکھا۔ اور مناسب مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں جو گفتگوئیں ہوئیں ان سے معلوم ہوتا تھا کہ مولانائے مرحوم کو ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں سے کسقدر عقیدت تھی۔ ان کی تمدنی خصوصیات میں دو چیزوں کا خاص طور پر ذکر کرتے تھے۔ ایک تو یہ کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان میں جو تمدنی کام کئے خالصۃً لوجہ اللہ کئے۔ اس میں موجودہ زمانے کی طرح تجارتی اور سیاسی مصلحت پیش نظر نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ اس میں استحکام و ثبات تھا۔ اور اسکی حیثیت عارضی نہ تھی۔ بلکہ جس شخص کو جس کام پر لگا دیا وہ اس کا مستقل خاندانی پیشہ ہو گیا۔ اسی سلسلے میں اپنے قیام حیدر آباد کا ایک واقعہ بیان کیا۔ کہ میں وہاں ایک دورے میں گیا ہوا تھا۔ راستے میں چند دیہاتی لوگوں نے میرے سامنے پھولوں کی ڈالیاں پیش کیں۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم

(جناب مولانا محمد بدر الدین صاحب علوی استاد شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مجھے نواب صاحب کے فاتحہ کی مجلس میں روزنامہ "جمہور" کے ایک ذمہ دار صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ اس کا صدر یار جنگ نمبر نکلے گا۔ مگر کافی وقت گزر گیا۔ اور کان میں کوئی بات نہ پڑی۔ اور معارف اعظم گڑھ نے اپنے نمبر کیلئے مجھ سے لکھنے کی فرمائش کی چنانچہ ایک بسیط مضمون وہاں بھیجدیا "جمہور" کی بابت کچھ نہ سننے سے خیال ہوا کہ نمبر نکل گیا ہوگا۔ بہرحال معلوم ہوا کہ سال کے آخر میں نکلے گا۔ میں نے سمجھا کہ اب مجھکو اس نمبر سے کوئی معذرت ہوگا۔ لیکن عزیزم ریاض الرحمن صاحب کی فرمائش ہوئی کہ میں اس میں حصہ لوں۔ میں معذرت کر سکتا تھا کہ لکھ چکا ہوں۔ وقت کا سوال سب سے بڑا سبب معذرت کا ہو سکتا تھا۔ مگر وہ دونوں سے بھی زیادہ ہوگیا۔ ایک تو یہ کہ نواب صاحب مرحوم سے جو خصوصیت تھی اس کا یہ اقتضا ہے کہ ان کے ذکر سے میری سیری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حب شیئا اکثر ذکرہ دوسرے اس لئے کہ انکار رہا تو انجمن خالق کے لئے باعث ملال ہوگا۔ القصہ قلم اٹھالیا۔ جو باتیں معارف کے مضمون میں آچکیں انکا اعادہ غیر موزوں ہے۔ اس وجہ سے میدان میں تنگی نظر آئی مگر اس بنیاد پر وسعت پیدا ہوگئی۔ کہ مرحوم جو واقعات بیان فرمایا کرتے تھے ان میں سے چند کو جو مستحضر ہوں روایت کروں۔ یہی ایک خدمت ہوگی کیونکہ یہ واقعات تمام تر یا بیشتر ایسے ہوں گے جو پہلی بار نقل ہوں گے۔ اس کے بعد کچھ ذاتی اوصاف بھی آئیں گے۔ اور پھر الطاف کرمانہ کا ذکر ہوگا۔ جن کا اظہار بھی خدا کی قسم ناگزیر ہے۔ مگر میں ناظرین سے درخواست کرونگا کہ میرا معارف والا مضمون بھی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ اس کی پہلی کڑی ہے اور اس میں ضمیمہ مفتی صاحب ع کا لکھایا ہوا بہت اچھے واقعات کا انداز بیان نہایت خوش آئند دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے جسکو غالب کے ایک شعر تھوڑا سا تصرف کرکے بتاؤں تو بالکل بجا ہوگا اور جو لوگ واقف ہیں۔ یقیناً میری تائید کرینگے

ہیں اور بھی دنیا میں سخن گو بہت اچھے
کہتے ہیں کہ حسرت کا تھا انداز بیاں اور

استاد کے متعلق

اس عنوان کے تقدم کی وجہ ظاہر ہے کہ میرے اور نواب صاحب مرحوم کے درمیان بہت بڑی جہت واحد یہی ذات مبارک ہے۔ استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ مدرسے میں ایک شکستہ بوریا پر بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔ ایک بار مولوی خواجہ محمد یوسف وکیل جو خود بھی شاگرد تھے مدرسے میں آئے۔ اور بوریا کی حالت دیکھ کر کہا کہ میں ایک قالین بھیجے دیتا ہوں اس پر تشریف رکھ کر درس دیا کیجئے۔ استاذ العلماء نے برجستہ فرمایا ع

بوریا بہتر وقالیں برائے دیگراں

اپنے استاد مولوی عبد الغنی خاں صاحب سے نقل کرتے ہیں۔ کہ سالہا سال استاذ العلماء کی خدمت میں رہے۔ مگر کبھی کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہوئے نہ دیکھا۔ اس پر حیرت بھی ہوتی تھی۔ ایک بار نصف شب کے بعد آنکھ کھلی تو دیکھا کہ تلاوت فرما رہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ یہی معمول تھا۔ کہ بہت اخفا کے ساتھ ایسے ہی اوقات میں تلاوت فرماتے۔

شاہ عبد العزیز صاحب

شاہ صاحب کو روزانہ خفقان کے دو دورے پڑا کرتے تھے۔ پہلا صبح کو جو خفیف ہوتا شاہ صاحب اس میں اپنے مکان سے نکل کر گلی تک جاتے اور پھر واپس آجاتے۔ دوسرا شام کو طویل جس میں لال قلعہ تک چلے جاتے۔ مگر اس وقت میں بھی طلبا ساتھ ہوتے۔ اور مقامات حریری جیسی بلند پایہ ادبی کتاب کا سبق ہوتا جاتا۔ شان قرأت یہ ہوتی کہ ایک فقرہ طالب علم پڑھتے تو دوسرا ادھر سے شاہ صاحب ادا کرتے۔

الشیئی بالشیئی یذکر

اس جگہ شاہ صاحب کے متعلق دو واقعے اور اس جہت سے ذکر کئے جا سکتے ہیں کہ میں نے بارہا نواب صاحب مرحوم کو سنائے اور موصوف نے ان سے لطف حاصل کیا۔ پہلا استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے حضرت کو شاہ صاحب سے ایک خاص تعلق تھا۔ فرماتے تھے۔ ایک بار خواب میں شاہ صاحب کی قبر کا کشف ہوا۔ ان کو نماز پڑھتے ہوا دیکھا۔ دریافت کیا عالم برزخ میں نماز کیسی جواب ملا شاہ صاحب اپنے شوق سے نماز پڑھتے ہیں۔ دوسرا مولوی امانت اللہ صاحب مرحوم کی روایت سے ہے ایک بار حکیم رفیع الدین اسرائیلی کے ساتھ شاہ صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ قبر کے پاس مسجد ہے۔ حکیم صاحب نے کہا "آئیے نماز پڑھ لیں۔" مولوی صاحب کا وضو نہ تھا۔ فرمایا۔ "وضو کرنے کی مہلت دیجئے۔" مدرسے میں کنواں موجود ہے اور لوٹے بھی تیار۔ مگر نہیں پانی اور نہ رسی۔ مجبوراً حکیم صاحب سے کہنا پڑا۔ "آپ تنہا پڑھ لیجئے۔" مگر جماعت نہ ملنے پر بڑی حسرت ہوئی۔ اور خیال آیا کہ شاہ صاحب کی فاتحہ کو آئے اور جماعت نہ ملی یہ خیال ہوتے ہی معاً مسجد کے ایک طاق پر نظر گئی۔ دیکھا تو ایک کورا لوٹا پانی سے بھرا ہوا ہے اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس میں پانی بھرا گیا ہے۔ الغرض اس تصرف سے مولوی صاحب کو جماعت مل گئی۔

پیر و مرشد کے متعلق

گنج مراد آباد کی مسجد میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ صحیح بخاری کا درس دیتے بڑے بڑے علماء طالب علمانہ طور پر درس میں حاضر ہوتے عادت شریفہ تھی کہ بر وقت درس صحیح بخاری میں کتابت کی غلطیوں کو درست فرماتے جاتے۔ ایک بار اتفاق سے دوات خشک تھی۔ قلم ڈبا کے لکھتے کچھ نمایاں نہ ہوتا۔ حاضرین میں سے ایک نے دوسرے کو اشارہ کیا۔ کہ لوٹا لاکر دوات میں پانی ڈالدو اشارہ ہوتے ہی ڈانٹ پڑی کہ ان لوگوں کا پانی کس کام کا ہے۔ لوگ بے احتیاطی سے کام کرتے ہیں۔ اور استعمال ان میں کرتا جاتا ہے۔ صحیح احادیث کے لئے بالکل پاک کرنے والا پانی ہونا چاہئے۔ یہ تھا تقوی کا مرتبہ۔ دوسرا واقعہ ایک بار مولانا کی خدمت میں ایک شخص داڑھی منڈی ہوئی مونچھیں بڑی بڑی لباس آوارہ لوگوں کا پہنے ہوئے آیا۔ اہل مجلس متعجب ہوئے۔ اس نے مولانا سے عرض کیا۔ حضرت! جب شہر میں کتوں کی افراط ہو جاتی ہے۔ تو میونسپلٹی کی طرف سے حکم ہوتا ہے کہ کتے پکڑ کر مارے جائیں اور ہر کتا پکڑا جاتا ہے۔ جس کتے کے گلے میں پٹا ہو اس کو نہیں پکڑتے۔ حضرت! میرے گلے میں پٹا ڈالدیجئے۔ تمام اہل مجلس اس شخص کی بات سے حیرت زدہ ہو گئے۔ اور مولانا نے اسکو حلقۂ ارادت میں لے لیا۔

حکیم محمود خاں

ایک بار بھیکن پور تشریف لائے کئی روز قیام رہا۔ نواب صاحب مرحوم کی والدہ کا علاج ہو رہا تھا۔ چلتے وقت ایک رقم گٹھری باندھ کر نواب صاحب کے چچا مولوی عبد الشکور خاں نے بھیجے کو دی۔ کہ جب حکیم صاحب پالکی میں بیٹھ جائیں اس وقت دینا۔ تعمیل کی۔ لیکن حکیم صاحب گٹھری دیکھ کر بہت گھبرائے اور کہا یہ کیا ہے۔ فرماتے تھے میں نے کہا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کیا ہے۔ مگر اب میری بڑی مشکل ہے۔ آپ انکار فرماتے ہیں وہاں مجھ پر ڈانٹ پڑے گی۔ اس پر حکیم صاحب نے میری ٹھوڑی میں ایک ہاتھ ڈالا۔ اور دوسرے ہاتھ سے اپنی داڑھی پکڑ کے کہا۔ اس کو کلنک لگ جائے گا۔ غرض اپنی سیر چشمی سے گٹھری واپس کر دی۔ حکیم صاحب کی سیر چشمی کے تین واقعات اور نواب صاحب کا تذکرہ کے سلسلے میں بیان فرمایا کرتے۔ ایک حیدرآباد دکن کے سرآسمان جاہ نے حکیم صاحب کو بلایا تھا۔ نظام دکن نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنے یہاں طلب کیا۔ حکیم صاحب نے جواب دیا اعلیٰحضرت کے لئے زیبا نہیں کہ اپنے متوسل کے یہاں سے مجھکو بلائیں۔ ان کی شان تو یہ ہے کہ مجھکو دہلی سے طلب فرمائیں۔ اس کو نظام نے بھی پسند کیا۔ اور براہ راست دہلی سے بلانے کے لئے مستقلاً آدمی بھیجے حکیم صاحب نے شرائط پیش کیں۔ جو سب منظور ہوئیں۔ پھر ایک شرط نظام کی طرف سے پیش ہوا۔ کہ حکیم صاحب کمر میں پٹکا یعنی ٹیکا باندھ کر سامنے آئیں۔ حکیم صاحب نے اس کو ماننے سے انکار کیا۔ اور انکار کی وجہ یہ بتلائی کہ شاہانہ مغلیہ کے دربار میں نظام کے مورثین اور میرے مورثین ایک حیثیت میں ٹیکا باندھ کر حاضر ہوتے تھے اب یہ نہیں ہو سکتا کہ حکیم صاحب نظام کے سامنے ٹیکا باندھ کر آئیں۔ اس شرط پر نظام کی طرف سے شدید اصرار ہوا۔ اور حکیم صاحب کی طرف سے انتہائی شدید انکار۔ نتیجہ یہ کہ معاملہ فسخ ہوگیا۔ دوسرا واقعہ مہاراج کشمیر نے اپنے علاج کے لئے حکیم صاحب کو بلایا دیکھ کر نسخہ تجویز ہوا۔ مہاراج نے نسخہ کی بابت کچھ دریافت کرنا چاہا۔ بس اب کیا تھا حکیم صاحب برہم ہوگئے۔ اور مہاراج کو بے تکلف ڈانٹ بتاکر اپنے آدمیوں کو فوراً واپس چلنے کا حکم دیا اور ادھر مہاراج نے اپنے آدمیوں کو بلاکر کہا کہ اگر حکیم صاحب چلے گئے تو تم لوگوں کی خیر نہیں۔ تم سب کے مکانوں کو کھدوا کر ہل چلوا دونگا۔ وہ لوگ سخت پریشان ہوئے کہ کیا کریں آخر حکیم واصل خاں کو پکڑا جو اس وقت ساتھ گئے تھے۔ اور سفر میں رفیق۔ انھوں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ دوسرے دن صبح روانگی تھی حکیم صاحب کی عادت تھی۔ کہ آخر شب سے اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ ادھر واصل خاں نے اپنے پلنگ پر کروٹیں بدلنی شروع کیں۔ حکیم صاحب نے کہا ابھی دیر ہے سو رہو تھوڑے وقفہ کے بعد پھر کروٹیں بدلنے لگے۔ جب بار بار یہ صورت پیدا ہوئی تو حکیم صاحب نے پوچھا آج کیا بات ہے جو جاگ رہے ہو۔ بالآخر انھوں نے سارا ماجرا سنایا اور سفارش کی کہ آج روانہ نہ ہوں۔ چنانچہ روانگی ملتوی کردی اور مہاراج کے متعلقین کی جان میں جان آئی الغرض دوسرے دن باہتمام شاہی سفر کا انتظام ہوا۔ سفر خرچ اور فیس مہاراج کی طرف سے پیش ہوئی۔ مگر یہ کہہ کر کہ جب علاج ہی نہیں ہوا تو کیسی فیس اور کیسا سفر خرچ" انھوں کو ہاتھ نہ لگایا واپس کردیں۔ اور خود اپنے خرچ سے واپس چلے آئے۔ تیسرا واقعہ بالکل اسی قسم کا نواب کلب علی خاں والئی رام پور کے ساتھ گذرا۔

ایک بار علاج کے لئے طلب ہوئے دیکھا نسخہ تجویز کیا۔ نواب کلب علی خاں نے نسخہ کے بعض اجزاء کے متعلق خیال ظاہر کیا کہ مزاج کے

ع۔ مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب [illegible] (علیگڑھی)

بلکہ ایک مصری جامعہ کا سند یافتہ گریجوایٹ ہے جس نے دینیات میں ایم۔ اے کیا ہو۔

(۳) سنہ ۱۹۲۶ء

نومبر سنہ ۱۹۲۶ء کی ایک سہانی شام ہے بارش کا موسم ختم ہو چکا ہے۔ اور ہلکی ہلکی سردی شام کے کیف کو دوبالا کر رہی ہے۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ ہندو مسلمان۔ عیسائی۔ سب کے سب آغا منزل کے ایک خوبصورت چبوترے پر معزز مہمان کے منتظر ہیں۔ سلیقے سے میزیں لگی ہیں۔ اور ان پر کیک۔ پیسٹری۔ فواکہات چنے ہوئے ہیں۔ اسٹاف کے ممبروں نے دل کھول کر چندہ دیا ہے تاکہ ملک کے ہر دلعزیز صدر الصدور کو حج بیت اللہ سے مراجعت پر خوش آمدید کہیں۔

حجاز کے قیام کے دوران میں جلالۃ الملک عبد الرحمٰن آل سعود ملک حجاز و نجد نے جو او بھگت کی ہے۔ اس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ جب نواب صدر یار جنگ بہادر حیدرآباد واپس آتے ہیں اور ان کے اعزاز میں جو ظہرانے، عصرانے اور عشائیے ہوتے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی یوسف گم گشتہ ہے جو دوبارہ اپنے کنعان واپس آ گیا ہے۔ ایک ضیافت دوسری پر سبقت لئے جا رہی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کو اس لئے اور بھی مولانا سے ملنے کی خواہش ہے کہ وہ اس کے معین امیر یعنی وائس چانسلر رہے ہیں۔ اور اب بھی شعبہ دینیات کے سر (ڈین) اور جامعہ کی مجلس اعلیٰ کے رکن رکین ہیں۔

نواب صاحب ٹھیک مقررہ وقت پر پہونچتے ہیں۔ اور انکا صدر کلیہ پروفیسر عبد الرحمٰن خاں صاحب نہایت گرم جوشی سے استقبال کرتے ہیں چائے پی جاتی ہے۔ جو لوگ خوش خوراک ہیں وہ اپنے سامنے چنی ہوئی اشیا کو ختم کرنے میں تکلف نہیں برتتے۔ اس کے بعد آئس کریم اور شربت کی باری آتی ہے۔ اب صدر کلیہ نواب صدر یار جنگ بہادر سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ سفر حج کے حالات سے حاضرین کو بہرہ مند فرمائیں نواب صاحب کے بیٹھتے ہی تمام چبوترہ چیئرز سے گونج اٹھتا ہے۔ ہر شخص ہمہ تن گوش بنا ہوا معزز مہمان کی تقریر کو سنتا ہے۔ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ یہ جلسہ علما اور فضلا کا جلسہ ہے اور اس اعتبار سے وہ ان تمام صحبتوں سے ممتاز ہے جنہیں انھیں حج کے بعد حاضری کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ جو باتیں دوسرے مقامات پر بیان کی گئی ہیں۔ وہ اس جلسے کے لئے ناموزوں ہونگی۔ حاضرین پر جناب صدر الصدور کے اس فرمانے کا بڑا اثر پڑتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس خیال سے کہ مدینے جائے کہ وہاں وہ بڑی بڑی سڑکیں دیکھے گا۔ اس کے عصری آرام اور آسائش سے لذت اٹھائیں دوڑتی لیں گی۔ سینما اور تھیٹر جگہ جگہ موجود ہونگے اور وہاں جا کر ان سب چیزوں کا مشاہدہ کریگا جسے زمانہ حال کی اصطلاح میں تہذیب و تمدن کہتے ہیں۔ تو اس شخص کو یقیناً مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ عرب کے مناظر قدرت میں کالے کالے پہاڑ، ریگستان جن کی وسعت کا اندازہ صرف وہاں پہونچنے اور دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ بے آب و گیاہ میدان ہیں۔ اور یہ ایسا خطہ ہے جس کی نہ خاص کوئی پیداوار ہے نہ کوئی خاص صنعت ہے۔ اگر آپ کا مقصود یہ ہے کہ دنیا کی آب و تاب، چکدار نقوش آرام و آسائش حاصل ہو تو پھر آپ لندن جائیں پیرس جائیں۔ برلن اور نیویارک جائیں، حجاز میں تو ان میں سے مشکل سے کوئی چیز نہیں ملے گی۔ وہاں تو صعوبت ہی صعوبت نظر آئے گی۔

لیکن اگر آپ کو خدا کی بارگاہ میں جانا ہے اس کے گھر کا طواف کرنا ہے اور عمر بھر ما سوا کی تلاش کی تو حج کے چند روز خدا پر دہ ہٹا دیتا ہے۔ اور سکے مدینے میں خدا تک پہونچنے کا گویا زینہ تلاش کرنا ہے تو صرف ایسی حالت میں آپ کو حج کا عزم کرنا چاہیے۔

وہ فرماتے ہیں۔ کہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ یہ خطہ جس میں نہ بڑے بڑے شہر ہیں۔ نہ جس کے باشندوں میں حضریت ہے اور بقول مولانا حالی مرحوم جس کا پیوند زمانے بالکل ہی جدا ہے۔ اس سرزمین سے اسلام نکلتا ہے۔ اور اس کے پیغمبر صلعم دعوے فرماتے ہیں۔ کہ دنیا کا کوئی گھر ایسا نہ رہے گا جہاں خدا کا یہ پیام نہ پہونچ جائے۔

لیکن اس میں اللہ تعالے کی ایک عظیم الشان مصلحت پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ اس مقدس سرزمین کو اپنا مرکز بنانا چاہیں انہیں علاوہ خدا کی قدرت اور اس کی عظمت کے دوسری کسی ذات کی قدرت یا عظمت کا وہم و گمان بھی نہ ہو۔ اس سرزمین کا ایک ایک چپہ اس مذہب کے عاشقوں کے کارناموں کی یاد دلاتا ہے جس نے اس عالم میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور انسان کی زندگی کی قدروں کی کایا پلٹ کر دی تھی۔ اسی دور افتادہ سرزمین میں ہر سال چاردانگ عالم سے لوگ کھنچے ہوئے چلے آتے ہیں۔ اور ۹ ذی الحجۃ الحرام کو عرفات کے میدان میں جبل الرحمۃ کے سامنے خدائے عز و جل کے سامنے سر مجز و نیاز جھکا کر دنیا کو دکھا دیتے ہیں کہ اس کے سامنے امیر غریب، اونچا نیچا کالا گورا سب برابر ہیں اور اس ہستی کے روبرو تمام تکبر و تفاخر چلتے پانی کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ جسے چشم بینا ہو وہ دیکھ لے کہ انسانی بھائی چارے کے کیا معنی ہیں۔ اور یہ ایسا سبق ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

حضرت صدر الصدور یہ سب اپنے مخصوص و لطیف انداز سے بیان فرماتے ہیں لوگ بیان کے دوران میں دم بخود بیٹھے رہتے ہیں۔ اور جوں ہی ممدوح تقریر ختم کر کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان کی تالیوں سے ایک مرتبہ پھر آغا منزل گونج جاتی ہے۔ تقریر کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ جانے سے پہلے ہر شخص یہ سوچنے لگتا ہے۔ کہ اس کی حقیقی بہبود کے لئے لندن پیرس اور نیویارک کی چمک دمک دیر پا ہوگی یا حجاز کی۔ "وادی غیر ذی زرع" کی روحانی غذا۔ مغرب کی نماز کے وقت یہ دلچسپ اور سبق آموز صحبت ختم ہو جاتی ہے۔

(۴) سنہ ۱۹۳۰ء

اپریل کا مہینہ ہے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کے ہم نشین اور انہیں پہچاننے والے ایک طرح کے سوگ میں بیٹھے ہیں۔ اس لئے کہ نواب صاحب نے اعلیحضرت خسرو دکن کے حضور اپنا استعفے کا چودہ نامہ پیش کیا ہے۔ وہ منظور ہو چکا ہے اور اب نواب صاحب پا بہ رکاب ہیں۔ ۔ ۔ چودہ برس سے نواب صاحب اور ان کی رفیقۂ حیات نفیس و لطیف صاحبہ حیدرآباد کی سماجی زندگی کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ اور ان کے خطبے ان کے مواعظ ان کے مجالس میلاد مبارک ان کی صدارتیں ان کی تقریریں ان کے عصرانے ان کی مشہور شب دیگ کی دعوتیں اور پر لطف علمی صحبتیں کس کس کا ذکر کیا جائے۔ کون ایسا ہوگا جسے ان چیزوں کی یاد تڑپا نہ دیتی ہو۔ حیدرآباد میں کچھ الوداعی دعوتیں ہوا ہے جو اس کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ لیکن جانے والے کو کوئی نہیں لگاتا۔ لیکن نواب صدر یار جنگ بہادر کے حیدرآباد سے جانے کے دن ریل کا اسٹیشن ایسا بھرا ہوا ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ بہت سے احباب اور عزیز تو بھیڑ دیکھ کر گھبرا گئے ہیں۔ اور اس خیال سے کہ یہاں ان سے بات بھی کرنا مشکل ہوگا سیدھے سکندرآباد جا رہے ہیں اس لئے کہ وہاں ریل آدھا گھنٹہ ٹھیری ہوتی ہے اور وہاں شروانی صاحب سے تھوڑی بہت گفتگو کا موقع مل جائے گا۔ ہر شخص کا دل بھرا ہوا ہے اور آنکھوں میں نمی ہے۔

سکندرآباد کے پلیٹ فارم پر بھی بڑا اجتماع ہے۔ اور لوگ معزز مسافر کا ہاتھ چومنے پر مصر ہیں۔ آخر انجن سیٹی دیتا ہے گارڈ نواب صاحب سے بیٹھنے کے لئے عرض کرتا ہے۔ اور اس طرح شروانی صاحب کی زندگی کا ہی نہیں بلکہ حیدرآباد کی حالیہ تاریخ کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔

J1342

جمہوری گزٹ کے خریدار بن کر ثبوت دیجئے

منیجر

پیکر تصویر!

بت بیدرد کا غم مونس، ہجراں نکلا
درد جاناں تھا جسے ہم نے وہ درماں نکلا

آنکھ جب بند ہوئی تب کھلیں آنکھیں اپنی
بزم یاراں جسے سمجھے تھے وہ زنداں نکلا

حسرت و یاس کا انبوہ خیالی کی کثرت
میں تری بزم سے کیا با سر و ساماں نکلا

خون ہو کر تو یہ دل آنکھ سے برسوں ٹپکا
نہ کوئی پر دل ناکام کا ارماں نکلا

آئینہ پیکر تصویر۔ نگاہ مشتاق
جسے دیکھا تری محفل میں وہ حیراں نکلا

مجھکو حیرت ہے ہوا کیا دم رخصت ہمدم
جان نکلی مرے پہلو سے کہ جاناں نکلا

خوب دوزخ کی مصیبت سے بچے ہم حسرت
اس کا داروغہ وہی یار کا درباں نکلا

(حسرت شروانی)

پھر وہ بے حجاب یاد آیا
ایسا اضطراب یاد آیا

دل میں کچھ گدگدی سی ہوتی ہے
ہائے کس کا شباب یاد آیا

دل سے رخصت ہوں سب تمنائیں
وہ سراپا حجاب یاد آیا

پھر کسی کی گلی کو جاتا ہوں
دل خانہ خراب یاد آیا

خود فراموش سے ہو کچھ حسرت
آج کون اے جناب یاد آیا

حسرت شروانی

سے قرضہ لیتے اور اکثر بار بار روپیہ چھینتے اور تعجب کرتے فرماتے تھے کہ جب ان کی سمجھ میں کسی طرح نہ آیا تو میں نے مولانا کی دعا کا ذکر کیا اس پر انھوں نے کہا کہ بس اب ٹھیک ہے انکی دعا کی برکت تھی کہ ان حالات میں آپ قرضہ ادا کر سکے۔

جب ریاست تقسیم ہوئی تو نواب صاحب مرحوم نے اپنے ششتر کا ر سے کہدیا کہ وہ لوگ اپنے حصے کے مطابق مواضعات پسند کر لیں اور باقی ان کے لئے چھوڑ دیں۔ چنانچہ اس طور پر اچھے مواضعات دوسرے لوگوں نے اپنے حصے میں لے لئے۔ مگر نیک نیتی کی برکت خدا نے یہ دکھلائی کہ نواب صاحب نے ریاست میں اتنا اضافہ کیا کہ تنہا ان کا حصہ اس پوری ریاست کے برابر ہو گیا۔ جو ان کے دادا کے قبضہ میں تھی۔ یہ بات سننے کے قابل ہے کہ باوجود اتنی بڑی ریاست قبضہ میں ہونے کے حکام ضلع سے بے تعلق رہتے۔ فرماتے تھے کہ جب کوئی نیا کلکٹر آتا تو صرف ایک بار اس کے ملنے کو جاتے تاکہ وہ ناواقف نہ رہے۔

حیدرآباد کا تعلق

جب حیدرآباد سے تعلق کا تار آیا تو اس کے منظور کرنے میں بہت پس و پیش ہوا۔ انکا دل میں ایک سوال پیدا ہوا۔ کہ اگر یہ دریافت کیا گیا کہ ایک موقعہ استسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا دیا گیا تھا۔ کیا کیا؟ اس سوال کا کیا جواب ہوگا۔ اسی خیال نے منظور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حیدرآباد میں نظام دکن سے بلا واسطہ تعلق تھا۔ جب رخصت پر آنے کے بعد حیدرآباد واپس پہونچتے تو معمول یہ تھا کہ اسٹیشن سے براہ راست نظام کی کوٹھی پر جاتے اطلاع ہوتے ہی سرا پردہ اٹھتا اور نظام برآمد ہوتے۔ اکثر نظام کہتے "آئیے مولوی صاحب"۔ جس پر نواب صاحب اپنے تکان آجانے کہنے کی بات یہ ہے کہ اگر نظام کو اس وقت کوئی بات کرنی منظور ہوتی تو باوجود اس کے کہ تمام خدام حاضر ہوتے وہ اپنی لڑکی کو پکار کر حکم دیتے "کرسی لا" کرسی آنے کے بعد بٹھلاتے اور جتنی دیر منظور ہوتا باتیں کرتے۔

حیدرآباد میں عموماً یہ طریقہ چلا آتا تھا کہ عید کا چاند اتنیا لوگوں کی گواہی کے ذریعہ سے قرار دیا جاتا اور نظام کے حکم خاص سے عید کا اعلان ہو جاتا۔ نواب صاحب مرحوم کے وہاں پہونچنے پر یہی واقعہ گذرا۔ قاعدہ کی رو سے اس قسم کے احکام کا صادر کرنا صدر الصدور کے اختیار میں تھا۔ نواب صاحب کو رویت ہلال ثابت نہ ہوئی اور شہر میں چاند کا اعلان ہو گیا۔ اس روز جمعہ تھا۔ نواب صاحب روزہ رکھے ہوئے مسجد میں پہونچے وہاں ہر روزہ دار کا روزہ افطار کرایا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ ہمت کر کے ان کے پاس بھی آئے۔ اور نظام کے زبان کا حوالہ دیکر گفتگو کی۔ مگر انھوں نے کوئی التفات نہ کی۔ اور کسی طریقہ پر ان لوگوں کو ٹال دیا۔ غرض نظام کو یہ خبر پہونچ گئی کہ صدر الصدور نے روزہ کو افطار نہیں کیا۔ آئندہ سال سے نظام کا دخیل ہونا ختم ہوا۔ اور ضابطہ کے مطابق رویت ہلال اور عیدین کے اعلان کا کام صدر الصدور کے ہاتھ میں آ گیا۔

حیدرآباد کے قیام میں جو واقعات گذرے ان کے ذکر سے نواب صاحب مرحوم کو بہت دلچسپی تھی۔ جن میں سے چند ذیل میں لکھتا ہوں۔

ایک مرتبہ ریزیڈنٹ نے ملنے کی خواہش کی اس کا مقصد یہ تھا۔ کہ جمعہ کے خطبہ میں جو سلطان ترکی کا نام آتا ہے۔ وہ نکال دیا جائے۔ ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ اپنے مقصد پر پہونچا۔ مگر نواب صاحب مرحوم نے ایسے اچھے پیرایہ سے اس کو خاموش کر دیا کہ وہ مزید گفتگو نہ کر سکا۔ کہہ دیا کہ یہ بات ان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خود نظام کے ہاتھ میں ہے۔

دوسرا واقعہ۔ محکمہ دینیات میں کوئی جگہ خالی ہوئی۔ اس کے لئے ایک نوجوان اعلیٰ حضرت کا فرمان اپنے تقرر کے متعلق لے کر پہونچے نواب صاحب نے برجستہ ان سے کہدیا "آپ کا تقرر نہیں ہو سکتا۔" وہ صاحب حیرت زدہ ہو گئے۔ کہ فرمان کے بعد بھی اس معقولیت کے ساتھ اس کے خلاف بات کہی جا رہی ہے۔ مگر مجبور تھے واپس آ گئے۔ ادھر فرمان کے جواب میں نواب صاحب نے لکھا۔ کہ یہ امیدوار اس جگہ کا اہل نہیں۔

تیسرا واقعہ۔ جاگیرداروں میں کوئی جھگڑا تھا۔ ایک جاگیردار کا انتقال ہو گیا تھا اس کے بھائی نے بیوہ اور یتیم بچے پر ظلم کر کے جاگیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ جو محکمۂ فلاں تا لکیں تھا نظام کے یہاں اس کا بہت رسوخ تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ مقدمہ چلا اور نظام نے اس مقدمہ کو نواب صاحب مرحوم کے یہاں بھیجوا یا مقدمہ سپرد ہوتے ہی سفارشیں آنے لگیں فرماتے تھے کہ ایک بڑے با اثر صاحب نے ٹیلیفون پر مجھ سے اس مقدمہ کے لئے بات چیت کی۔ میں نے جواب دیا "فیصلہ مسل کے مطابق ہوگا" اس پر وہ صاحب بہت ناخوش ہوئے اور کہا "شروانی صاحب ہم آپ کو سمجھاتے ہیں مگر آپ کی سمجھ میں نہیں آتا۔" اس پر بھی میرا جواب وہی تھا۔ آخر میں انھوں نے کہا "اب کہئے بستر بندھوا دیا جائے گا" فرماتے تھے میں نے جواب دیا "میرا بستر بندھا ہوا رکھا ہے" اس جواب کو سنکر انھوں نے ٹیلیفون بہت زور سے میز پر دے مارا۔ کہ جس کی آواز مجھ تک آئی۔ بیوہ اور یتیم حقدار تھے نواب صاحب نے فیصلہ حق کے مطابق کیا۔ نہ اس بات کی پروا کی کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں اور نہ اسکا خیال کیا کہ جس کے خلاف فیصلہ دے رہے ہیں وہ نظام کے یہاں بارسوخ ہے۔

چوتھا واقعہ۔ ایک بار کوئی مدنی حیدرآباد آئے۔ نواب صاحب مرحوم ان کو مہاراج کشن پرشاد سے ملانے کے لئے لے گئے مہاراج اس وقت بالاخانے پر تھے اطلاع ہونے پر اوپر آنے کے لئے اجازت ملی یہ بات پہلے ان کے علم میں لائی جا چکی تھی۔ کہ مدنی صاحب ملنے کو آ رہے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ جس وقت مدنی صاحب کا سر مہاراج کو نظر آیا فوراً اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ اور جب تک وہ بالائی سطح پر پہونچیں مہاراج بے ساختہ دوڑ کر ان کے پاس پہونچ گئے۔ اور ان کے سر اور منہ کے جا بجا بوسے لئے۔

ایک پارسی کا غبطہ

"علمائے سلف" جب شائع ہوئی تو بمبئی کے ایک پارسی نے خط لکھا جس میں درخواست تھی کہ پارسیوں کے سلسلے میں بھی ایسی ہی کوئی کتاب لکھئے۔

قوت ایمانی

حیدرآباد میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ مولوی عبدالباری ندوی کو کوئی جگہ دکھلانے کے لئے ساتھ نکلے جہاں گئے تھے طاعونی مردے پڑے دیکھے ہٹ کر دوسری طرف ہو لئے۔ مکان پر واپس پہونچے تو یہ وہم ہوا کہ طاعون مسلط ہوا چاہتا ہے۔ اس وہم کی وجہ سے بہت بری حالت ہو گئی۔ رات ہوئی نیند غالب آ گئی ایک سوال دل میں آیا "کیا موت کا گھوڑا ایسا بے لگام ہو گیا ہے کہ جدھر چاہے چلا جائے۔" فوراً جواب خیال ہوا "نہیں" یہ خیال آنے کے ساتھ ہی وہم دور ہو گیا۔ رات کے ایک بجے کا وقت تھا جب وہم سے رہائی ہوئی فوراً نیند آ گئی۔ اور پھر کبھی اس قسم کا وہم نہ ہوا۔

میرے مشاہدات

مولوی بشیر احمد صاحب مرحوم سے جا رہے تھے۔ موٹر جامع مسجد کے پاس چھوڑ کر پیادہ چلے۔ چند قدم چلکر زمین کی طرف جھکے میں ساتھ تھا۔ سخت حیرت مجھ کو ہوئی۔ کہ یہ کیا۔ دیکھا تو راہ میں ایک سالم اینٹ پڑی تھی۔ جھک کر اس کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اور راہ سے الگ ایک طرف اس کو رکھ دیا۔ فارغ ہو کر میری جانب متوجہ ہوئے۔ اور مشہور حدیث کا ٹکڑا "ادناہا اماطۃ الاذیٰ عن الطریق" پڑھا۔ میں اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ بشاشت اپنے چہرہ پر خود محسوس ہوئی۔

کتابوں کی محبت

عباس خاں شروانی کی تاریخ شیر شاہ سوری کا قلمی نسخہ حبیب گنج سے لنن لائبریری میں مستعار آیا تھا کئی برس گذرنے پر بھی نسخہ واپس نہ ہوا۔ تو تقاضوں کی نوبت آئی وہ بھی بے اثر رہے تو مجھ سے فرمایا کہ جس طرح ہو سکے اس کو لاؤ۔ میں نے جستجو کی تو معلوم ہوا کہ شعبہ تاریخ کے سیمینار میں موجود ہے وہاں سے لائبریری میں منگوا کر مرحوم کی خدمت میں پہونچا دی۔ وہ منظر قابل دید تھا اور حق یہ ہے کہ کبھی نہ بھولونگا۔ کہ نواب صاحب نے کتاب کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بے اختیارانہ اپنے سر اور آنکھوں پر رکھا۔ پھر بہت دیر تک سینے پر لگا کر چومتے رہے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ کتنا عشق ان کو اپنی کتابوں سے تھا۔ اس واقعہ کو لائبریری میں جس نے بھی سنا ان کے شغف کی داد دی۔

ادبی ذوق

مفتی صاحب کے یہاں کبھی اگر دیگر حاضرین مجلس سے قبل تشریف لے آتے تو بعد کے آنے والے کو دیکھ کر بار بار فرماتے تھے

سے چلے ہی آتے ہیں مکتش سبو سبو کرتے

مفتی صاحب کے یہاں مغرب کی نماز کے بعد نواب صاحب کے لئے سبز چائے زعفرانی کا اہتمام ہوتا۔ کئی سال سے سقایت کی خدمت مجھے سپرد تھی۔ چائے میں لیموں کی چاشنی ڈال کر اور ادھ بیچ شیشے کے فنجانوں میں بیرنگی عجیب لطف دیتی اکثر اس موقع پر یہ شعر نواب صاحب بہت کیف کے ساتھ پڑھا کرتے۔ سبا

رامپور میں کوئی رضا روڈ ہے۔ اس کا ترجمہ "راہ رضا" فرما کر تین شعر فارسی میں کہے اور رقت فامہری ایا دیتھا

ابہا ہوا و ام پہا خمر

ایک پرچہ پر لکھ کر مجھکو عنایت فرمائے۔

پرچہ کی نقل بعینہ درج ذیل ہے۔

حسرت شروانی

براہ رضا جوئے راہ نجات
بیابی ز گنج سعادت برات

ولہ

بمروی قدم نہ براہ رضا
بعزت بود تاج صدق و صفا

ولہ

براہ رضا جوئے نقش مراد
دود زیر ران تو رخش مراد

۱۴ ربیع الآخر ۱۳۶۶ھ

یہ ابیات دیوان مطبوعہ میں موجود نہیں ہیں۔

جسمانی صحت۔ فرماتے تھے۔ کہ کبھی بخار نہیں آیا۔ ہاں زکام میں حرارت البتہ ہوئی۔ اس عمر میں بھی صحت بہت اچھی تھی ہمیشہ کا صبح کے وقت معمول تھا۔ دانت بیچ کے سب صحیح سالم تھے۔ صرف اوپر کے گر چکے تھے۔ جن کی بجائے مصنوعی لگا لیتے۔ بینائی ایسی اچھی تھی کہ اکثر حبیب منزل میں بعد مغرب کوئی کتاب مجھے دکھاتے یا اپنی نوٹ بک میں کچھ نوٹ فرمانے کا حکم دیتے۔ اور میں عینک کا عذر کرتا تو فرماتے واہ پھر ہنستے اور خود کتاب پڑھنے لگتے۔ یا خود نوٹ بک میں نوٹ کر لیتے۔

موافق نہیں۔ آپ حکیم صاحب کو کہاں تاب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور واپسی کا حکم دیدیا کس کی طاقت تھی کہ روک سکتا جس حال فیس اور سفر خرچ نذر ہوا۔ گر یہاں بھی دہی کہکر واپس کر دیا۔ کہ جب علاج نہیں ہوا تو نہ فیس کا حق ہے نہ سفر خرچ کا بلکہ اور اپنے پاس سے دربار کے ملازمین کو انعام دے کر واپس چلے آئے۔

سرسید اور شاہ غلام علی صاحب خاندانی تعلقات

کی بنا پر آغاز شباب میں سرسید سے تعارف ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے کالج کی دینیات کی کمیٹی کا اور انتظامی جماعت کا ممبر انہوں نے بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی عصر کے بعد سرسید کے پاس جایا کرتے۔ فرماتے تھے کہ سرسید کے سامنے ایک بڑی لمبی میز ہوتی۔ جس کے مختلف حصوں میں مختلف اقسام کے کاغذات رکھے ہوتے میز کے سامنے ایک چوڑا سا کوچ کہ وہ بھی میز کے برابر لمبا تھا۔ پڑا رہتا۔ سید صاحب اسی پر بیٹھے بیٹھے میز کے مختلف حصوں کے سامنے تکیہ لگا کر کام کرتے رہتے۔ مجھے دیکھ کر اپنے جسم کو سمیٹنا شروع کرتے۔ میں دور ہی سے عرض کرتا سید صاحب تشریف رکھئے۔ سید صاحب تشریف رکھئے۔ مگر ایک نہ سنتے۔ اور جب میں ان کے پاس پہونچتا کھڑے ہو چکے۔ جتنی دیر میں حاضر رہتا حضرت شاہ غلام علی صاحب کا ذکر کرتے رہتے۔ اور کوئی موضوع سخن ہی میرے لئے ان کے پاس نہ تھا۔ ایک بار سرسید نے اپنی تفسیر کا ذکر کیا۔ کہ وہ عقل اور نقل میں مطابقت کے لئے لکھی گئی ہے۔ فرماتے تھے میں نے کہا۔ میرا تو یہ حال ہے کہ ایک وقت تو فلسفہ میں پڑھتا ہوں۔ کہ خرق و التیام محال ہے۔ اس کے بعد حدیث میں معراج کا واقعہ پڑھتا ہوں۔ بعد رات کو جب لیٹتا ہوں تو دونوں باتیں دماغ میں یک وقت آتی ہیں لیکن یہ کبھی فکر نہیں ہوتی کہ ان میں اختلاف ہے۔ اس کو کیسے اٹھایا جائے۔ سرسید نے کہا۔ تو آپ ہرگز میری تفسیر نہ دیکھئے میں نے تو صرف ان لوگوں کے لئے لکھی ہے جو عقل اور نقل کو ملاتے ہیں۔

خاندانی واقعات

بھیکن پور قدیم زمانے سے اس سعادت سے سرفراز تھا۔ کہ وہاں دین اور دولت مجتمع تھے۔ چنانچہ مارہروی بزرگ کا مصرعہ ہے اس جگہ سے، دین و دولت توأماں۔

نواب صاحب کے دادا تین بھائی تھے جو سب کے سب نہایت وضعدار تھے۔ ان کی وضعداری کا ایک بڑا ثبوت اب بھی موجود ہے۔ کہ منجھلے خان زماں خاں نے چھتیس سوالات شادی اور غمی کی رسم و رسوم کے متعلق ترتیب دے کر شاہ اسحاق صاحب کی خدمت میں بھیجے۔ شاہ صاحب نے چار سوالات اور بڑھا کر چالیس کر دیئے۔ اور مسائل اربعین کے نام سے ان کا جواب تحریر فرمایا۔ جب فتویٰ آگیا تو بڑے بھائی داؤد خاں نے کہا منجھلے میاں اب اس پر عمل ہونا چاہئے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں خاندان کے اندر ایک جگہ شادی ہونے والی تھی۔ قرار پایا کہ اسی شادی سے فتویٰ پر عمل کا آغاز کیا جائے۔ جن صاحب کے یہاں شادی تھی۔ یہ سن کر پریشان ہوئے اور کہنے لگے۔ کہ تمام خاندان چھوڑ دیگا۔ داؤد خاں نے کہا ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ "خاندان کے چھوڑنے کی پروا نہ کرو۔" اس بات سے وہ بھی تیار ہو گئے۔ اور اہل خاندان کی مخالفت بھی کم ہوئی۔ الغرض اعلان کے مطابق یہ شادی بالکل شرعی ہوئی۔ اور تمام مروجہ رسوم چھوڑ دیئے گئے۔ اس وقت سے تمام رسمیں پورے شروانی خاندان میں بند ہو گئیں اور اب شادی اور غمی میں شریعت پر عمل ہوتا ہے بموجب حدیث "من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرہا واجر من عمل بہا"

کہ قیامت تک اصلاح رسوم کا اجر داؤد خاں اور خان زماں خاں کو ملتا رہے گا۔ داؤد خاں کی دلیری اور اثر کے دو واقعے قابل ذکر ہیں ایک بار وہ کلکٹر سے ملنے گئے۔ اتفاقاً ان دنوں اس کے یہاں ایک فوجی انگریز مہمان تھا کلکٹر نے خان صاحب کو اس فوجی سے ملایا۔ خانصاحب کمر میں تلوار باندھے ہوئے تھے فوجی نے پوچھا یہ کیا ہے۔ خانصاحب نے بتایا "تلوار" اس پر اس نے حقارت آمیز لہجہ میں تلوار کا لفظ دہرایا۔ خان صاحب کو غصہ آیا اور کہا "پٹھان کی تلوار دیکھے گا" یہ کہتے ہی تلوار نیام سے نکال لی۔ اور قریب تھا کہ اس پر چلا دیں کہ کلکٹر نے پکڑ لیا اور فوجی کی طرف سے معذرت کی۔ کہ کسی لڑائی میں اس کے تمام رشتہ دار مارے گئے ہیں اس صدمہ کی وجہ سے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے جب جا کر داؤد خاں کا غصہ فرو ہوا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے زمانے میں پوری تحصیل اترولی کی مالگذاری انھوں نے سرکار کی حکم سے وصول کی اور چھکڑے میں روپیہ لاد کر سرکاری خزانہ آگرہ کو بھیجا۔ غارت گر جب چھکڑے کی طرف لپکتے تو پہرہ دار نے پس کر کہتے یہ روپیہ داؤد خاں کا ہے۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی۔ کہ ہاتھ ڈالتا۔ غرض کہ پورا راستہ اسی طریقہ پر طے ہوا۔ اور مالگذاری کا روپیہ سرکاری خزانہ میں بحفاظت پہونچ گیا۔

نواب صاحب کے چچا مولوی عبد الشکور خاں بھی بڑے دیندار ذی علم اور درویش مزاج تھے۔ نواب صاحب نے انھیں کی تربیت پائی تھی۔ اور عربی کی تعلیم بھی انھوں نے دلائی۔ ورنہ ان کے والد محمد تقی خاں اس کے خلاف تھے کہا کرتے "عربی نکالے چربی" "منجھلے میاں نے لڑکے کو کس جھگڑے میں ڈالدیا۔" مگر یہ جرأت نہ تھی کہ بھائی کے خلاف ہو کر پڑھنے سے روک دیتے مولوی عبد الشکور خاں بڑے بڑے ارباب کمال کو کھینچ کر بھیکن پور بلا لیا کرتے۔ ان کی مسکنت اور درویش مزاجی کے دو واقعے سننے کے قابل ہیں۔ ایک یہ کہ جب کبھی وہ باہر سے علی گڑھ آتے تو ان کے استقبال کے لئے اسٹیشن پر ایک ہجوم ہوتا۔ ریل پر سے سامان اتارا جاتا۔ اور لوگ لے چلتے تو وہ خود بھی ایک گٹھڑ اسی ہجوم کے ساتھ اپنے کاندھے پر رکھ لیتے اگر کوئی ان سے لینا چاہتا تو ڈانٹ کر ہٹا دیتے۔ باہر جہاں سب سامان اتارا جاتا۔ اسی جگہ خود بھی اپنا بوجھ اتارتے۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک دسترخوان پر سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ جب کسی کے سامنے دیکھتے کہ سالن ختم ہو گیا ہے تو اپنا پیالہ اس کے سامنے بڑھا دیتے۔ اور خود دال چاٹ کر اٹھ جاتے

نواب صاحب کے والد محمد تقی خاں شیانہ شان رکھتے تھے۔ ان کے مشاغل سیر و شکار، تعمیرات اور ورزش تھے۔ ورزش کی یہ کیفیت تھی۔ کہ مگدر کی ایک وزنی جوڑی کے (جو حبیب گنج میں اس وقت تک موجود ہے) ہزاروں ہاتھ ملاتے دو آدمیوں کو گننے کے لئے بٹھال دیتے اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ایک ہزار دو دو ہزار ہو چکنے کے بعد گننے والے بھول جاتے تو خانصاحب ان سے کہتے کہ پھر سے شروع کرو۔ تعمیرات میں حبیب گنج کا قلعہ انھیں کی یادگار ہے رات کو سوتے وقت تاریخی کتابوں کے مطالعہ کی عادت تھی۔

ایک اور صاحب خاندان بھیکن پور کے عنایت اللہ خاں تھے۔ جن کے کتبے سرسید کورٹ کے متعدد کمروں پر لگے ہوئے ہیں۔ سادہ مزاج اتنے تھے کہ بیل گاڑی میں بھیکن پور سے علی گڑھ آتے۔ باہمت ایسے کہ جب کبھی سرسید نے ان سے کالج کی کسی ضرورت کا ذکر کیا۔ تو رقم معلوم ہونے پر خواہ ہزاروں کی ہو فوراً اس کو مکمل کرا دیا۔ یونیورسٹی اسپتال کے پیچھے ایک کنواں ان کا بنایا ہوا موجود ہے جس کے کتبہ پر کیلئے مغفور بہرمن عنایت اللہ

ذاتی واقعات

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ نواب صاحب مرحوم نے اپنے چچا کے زیر تربیت عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اسی بات پر نازاں تھے کہ مولوی لطف اللہ خاں جیسے فاضل استاد تعلیم کے لئے ملے مولوی صاحب فرخ آباد کے رہنے والے تھے بعد فراغت تعلیم مدرس ہو گئے تھے۔ ایک عہدہ ان کو اپنے وطن ایک طریقہ سے مل رہی تھی۔ مگر انھوں نے اس طور پر لینا پسند نہ کیا۔ اور علی گڑھ استاذ العلماء کی خدمت میں حاضر ہو گئے کہ خدمت تدریس میں مشغول ہوں یہاں بھیکن پور سے پیام آ چکا تھا۔ کہ کوئی مستعد فاضل بھیجدیا جائے۔ قرعہ فال مولوی صاحب کے نام پر نکلا۔ اور وہ حبیب گنج نواب صاحب مرحوم کو تعلیم دینے کے لئے پہونچ گئے اعلیٰ مذاق فارسیت کا اور علوم متداولہ عربیہ کی تعلیم ان سے پائی۔ یہ بخت کی یاوری تھی کہ تحصیل علوم کا جو سامان میسر ہوا اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور بعد فراغت علمی مشاغل کو پسند کیا۔

انتظام ریاست

نواب صاحب مرحوم کے والد کا انتقال اپنے بڑے بھائی کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ جو لوگ اس خاندان کے اتفاق اور اتحاد پر حسد رکھتے تھے ان کو موقع چچا بھتیجے میں اختلاف پیدا کرنے کا مل گیا سینکڑوں خطوط نواب صاحب کے پاس اس سلسلہ میں آئے۔ مولوی عبد الشکور خاں کو بھی بھتیجے کی طرف سے شبہ تھا۔ لیکن نواب صاحب مرحوم نے کسی مخالف کی بات پر کان نہ رکھا۔ فرماتے تھے ایک معتمد کارندے جب تعزیت کے لئے میرے پاس آئے۔ تو میں نے ان کے ذریعہ سے خالو جی کے پاس کہلا بھیجا کہ میں اپنے والد کے طریق کار پر رہونگا۔ مگر وقت کی وجہ سے زبان اس مضمون کو ادا نہ کر سکی۔ مجبوراً یہی مضمون ایک کاغذ پر لکھ کر بیان کر دیا خانصاحب مطمئن ہو گئے چند ہی روز بعد مولوی عبد الشکور خاں نے حج کو جانے کا اعلان کیا۔ اور تمام ریاست کا نظم و نسق بھتیجے کے سپرد کر کے روانہ ہو گئے۔ واپسی پر مدینہ میں انتقال کیا۔ اب نواب صاحب پوری ریاست پر جو مشترک تھی۔ متصرف ہوئے خانصاحب مرحوم نے مصارف خیر کثرت سے جاری کر رکھے تھے۔ تین لاکھ روپیہ ریاست پر قرض بھی تھا۔ جس کا نصف نواب صاحب مرحوم کے حصہ پر آتا تھا۔ یہ کات قرضہ سبا تنہا خانصاحب کے نام سے تھے۔ اس لئے وکلاء نے رائے دی کہ انکار کر دیں تو ان کی ریاست بری ہو کر پورا قرضہ مولوی عبد الشکور خاں کے وارثوں کی ریاست پر پڑ جائے گا۔ لیکن ہمت دیکھئے کہ اس مشورے کو منظور نہ کیا اب خاص بات جو سننے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ مصارف خیر بدستور جاری رکھتے ہوئے اور تمام حصہ داروں کو ان کے حصے تقسیم کرتے ہوئے بغیر کسی جزو ریاست کو فروخت کئے ہوئے قرضہ کی ایک ایک کوڑی ادا کی۔ فرماتے تھے۔ پیر و مرشد نے پہلی حاضری میں جو دعا دی تھی کہ خدا قرض سے بچائے۔ اور اس وقت اس دعا پر تعجب بھی ہوا تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ وہ اس وقت کے لئے تھی۔ "سہارنپور میں کوئی رئیس تھے جنہوں نے اپنی ریاست کا قرضہ کثیر ادا کیا تھا۔ اور اس اعتبار سے ایک اچھی شہرت انھوں نے حاصل کر لی تھی۔ ان کو نواب صاحب مرحوم کے قرضہ ادا

نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم مغفور

(جناب خانبہادر ڈاکٹر محمد حبیب اللہ خاں (بی۔ اے) ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر)

نواب صاحب مرحوم سے میری شناسائی اتفاقیہ طور پر مئی سنہ ۱۸۹۲ء کو ہوئی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ ملاقات نہ تو حبیب گنج میں ہوئی اور نہ بھیکن پور میں بلکہ بوڑھے گاؤں میں حاجی محمد کریم اللہ خاں صاحب کے مکان پر۔ میں اس زمانے میں اترولی میں نائب تحصیلدار تھا اور ایک سرکاری کام کے واسطے بوڑھے گاؤں ایک دن کے واسطے گیا تھا۔ مجھ کو نواب صاحب کے دلکش بیان سے جو وہ ندوۃ العلماء کے ابتدائی جلسے کے حالات بیان کر رہے تھے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور نواب صاحب کو (جیسا کہ انھوں نے خود سالہا سال کے بعد مجھ سے کہا) میری طرف توجہ کالج کے ایک جلسہ میں جو سنہ ۱۸۹۲ء میں ہوا تھا۔ پیدا ہوئی۔ اور یہ کشش ان کو اتفاقی جذبۂ احساس سے ہوئی تھی۔ انھوں نے وہیں جلسہ میں نواب مزمل اللہ خاں صاحب مرحوم سے میری بابت دریافت کر لیا تھا۔ نواب مزمل اللہ خاں صاحب اس سے قبل مجھ سے واقف ہو چکے تھے۔ بہرحال میری واقفیت جو سرسری طور پر بوڑھے گاؤں میں ہوئی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ ترقی کرتی گئی۔

قیام اترولی میں کئی بار بھیکن پور جانے کا اتفاق ہوا اور ایک بار حبیب گنج۔ لیکن مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ مراسلت اسی زمانہ میں شروع ہو گئی تھی۔ میرے ایک دوست (محمد داؤد صاحب مرحوم نائب تحصیلدار علی گڑھ) نے ایک نظم سچی دوستی کے عنوان سے اسی زمانے میں لکھی اور وہ میری تقریظ کے ساتھ علی گڑھ میں چھپی۔ میں نے اس نظم کی ایک کاپی نواب صاحب کو بذریعہ حبیب گنج بھیجی۔ اور اس کے جواب میں جو خط ممدوح نے لکھا تھا۔ اس کا ایک فقرہ کبھی میں نہ بھول سکا۔ اور وہ یہ تھا کیا سچی دوستی کا امتحان ہے "نظم کا نام سچی دوستی کا امتحان" تھا اور نواب صاحب نے بھی اسی عنوان کی نسبت سے مندرجہ بالا فقرہ اپنے خط میں لکھا تھا۔ میں نے جواب میں صرف "ہاں" لکھ کر بھیج دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس امتحان میں جو رفتہ رفتہ سالہا سال تک ہوتا رہا نواب صاحب اور راقم الحروف ایک دوسرے کے معیار کے موجب پورے اترے۔

تحصیل اترولی میں میں تین سال کے قیام کے بعد میں ضلع میرٹھ کو تبدیل ہو گیا اور پھر وہاں سے چار سال کے بعد تحصیل کھیر ضلع علی گڑھ میں تحصیلدار ہو کر سنہ ۱۹۰۱ء میں آیا۔ اس دوران میں نواب صاحب سے سلسلہ مراسلت و ملاقات جاری ہو گیا۔ لیکن جس واقفیت مجھ کو جناب مرحوم کے اعلیٰ صفات دیانت و امانت سے اس وقت شروع ہوئی جب کہ سنہ ۱۹۰۶ء میں ڈپٹی کلکٹر و حاکم پرگنہ تحصیل اترولی ہوا۔

اسی زمانہ میں جناب مولوی محمد عبدالشکور خاں صاحب رئیس بھیکن پور کا انتقال بمقام جدہ ہو گیا اور انتظام ریاست کا کل بار شروانی صاحب کے کندھوں پر آ پڑا۔ جناب مرحوم نے مجھ سے ان دقتوں کا ذکر کیا۔ تو بلحاظ اس دلی تعلق کے جو ان سے پیدا ہو چکا تھا۔ میں نے میرٹھ سے اپنے ایک خاص دوست سے اسی ہزار روپیہ کے قرضہ کا انتظام کر دیا۔ اور زر مذکور کا چیک بلا انتظار تکمیل دستاویز وغیرہ شروانی صاحب کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس رقم سے چند رقمیں قرضہ کی جو بہت زیادہ پڑنے سود کی تھیں ادا ہو جاتیں۔ لیکن شروانی صاحب کے ایک عزیز نے جو ریاست کے ایک حصہ دار تھے کچھ اعتراضات کئے۔ جس کو اگر شروانی صاحب چاہتے تو نظر انداز کر دیتے۔ کیونکہ جو انتظام شروانی صاحب کے سپرد ہوا تھا۔ وہ کلکٹر ضلع کی پسندیدگی اور کلی ہمدردی کے بعد ہوا تھا جس پر معترض عزیز کی کوئی شکایت نہ سنی جاتی۔ لیکن نواب صاحب اخلاقی طور پر اپنے آپ کو اس وقت پابند کرتے جب کہ جملہ شرکار ریاست ان سے پوری طرح متفق ہو جاتے۔ یہ کارروائی اس وقت ممکن نہ تھی۔ اس لئے نواب صاحب نے ان عزیز کی خاطر سے اپنے آپ کو دقتوں میں مبتلا رکھنا زیادہ پسند کیا۔ بمقابلہ اس کے کہ سرکاری دباؤ سے وہ عزیز مذکور کو خاموش کرا دیتے۔ بہرحال نواب صاحب ممدوح نے یہ حالات بیان کر کے چیک مجھ کو واپس کر دیا۔

دوسرا واقعہ جو مذکورہ صدر واقعہ سے زیادہ نواب صاحب مرحوم کے اعلیٰ کردار و صفات حمیدہ پر تیز روشنی ڈالتا ہے اس کی تفصیل کسی قدر زیادہ پچھلے واقعات کی محتاج ہے۔ ان کو جہاں تک کہ میں نواب صاحب مرحوم سے سن چکا ہوں ذیل میں عرض کرتا ہوں۔

نواب صاحب کے عم بزرگوار مولوی حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب اور نواب صاحب کے پدر بزرگوار محمد تقی خاں صاحب کے درمیان جو رشتہ حقیقی بھائیوں کا تھا وہ باہمی رواداری اور الفت کی وجہ سے معمولی سطح سے بہت ارفع و اعلیٰ ہو گیا تھا۔ یہ بات اس زمانے میں اس نواح میں عام طور پر مشہور تھی کہ عبدالشکور خاں اور محمد تقی خاں بھائی بھائی نہیں ہیں بلکہ باپ بیٹے ہیں۔ محمد عبدالشکور خاں صاحب کل ریاست کا کام بذات خود انجام دیتے تھے۔ اور محمد تقی خاں صاحب ایک آزادانہ و رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے انتظام ریاست میں محمد تقی خاں صاحب کو قطعی مداخلت نہ تھی۔ بلکہ جو تھوڑا بہت کام بڑے بھائی ان کے سپرد کرتے تھے وہ اسکو انجام دیدیتے تھے۔ عبدالشکور خاں صاحب کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ اور بعض اوقات وہ اس کام میں جو کہ محمد تقی خاں صاحب کے خود سپرد کر دیتے تھے پھر مداخلت کرتے تھے۔ اور محمد تقی خاں صاحب ان سب چیزوں کو نہایت سعادتمندانہ طرز سے برداشت کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ باوجود برابر کے حقدار ہونے کے محمد تقی خاں صاحب اپنے بڑے بھائی کے اس طرح دست نگر رہتے تھے جیسے ایک چھوٹا بچہ اپنے کسی بڑے بزرگ کا ہو۔

سطور بالا سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ عبدالشکور خاں صاحب کو اپنے بھائی سے معمولی محبت میں بھی کمی تھی۔ نہیں بلکہ ان کو اپنے بھائی کے ساتھ جس قدر قلبی تعلق تھا وہ اپنی اولاد کے ساتھ بھی نہ تھا۔ چنانچہ اسی تعلق کا یہ نتیجہ تھا کہ حبیب الرحمن خاں صاحب کی تعلیم و تربیت پر انھوں نے اس قدر توجہ خاص کی کہ اس کا عشر عشیر بھی ان کی خاص اولاد کے حصہ میں نہ آیا۔ چنانچہ عبدالشکور خاں صاحب حج کو روانہ ہونے والے تھے۔ تو کل انتظام ریاست انھوں نے باضابطہ طور پر مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔ عبدالشکور خاں صاحب کی وفات جدہ میں بعد حج واقع ہوئی۔

علی گڑھ میں اس کی اطلاع آنے کے بعد حبیب الرحمن خاں صاحب کی دقتیں شروع ہو گئیں۔ اور وہ وقت آ گیا کہ جب ان کے صفات دیانت و امانت بلند حوصلگی کا امتحان ہو۔ عبدالشکور خاں صاحب بہت شاہ خرچ آدمی تھے۔ اور ان کی داد و دہش ریاست کی آمدنی کی نسبت سے بہت زیادہ بلند اور بڑھی چڑھی ہوئی تھی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ کئی لاکھ کی رقم قرضہ ممدوح نے چھوڑی۔

یہ کل قرضہ عبدالشکور خاں صاحب کے رقعوں وغیرہ سے لیا گیا تھا۔ اور چونکہ محمد تقی خاں صاحب انتظام ریاست میں کوئی دخل نہ رکھتے تھے لہذا ان رقعوں پر محمد تقی خاں صاحب کے نہ تو دستخط کرائے جاتے تھے اور نہ کچھ مشورہ لیا جاتا تھا۔ قانوناً محمد تقی خاں صاحب ذمہ دار ادائیگی قرضہ کے نہ تھے۔ لیکن جو روپیہ قرضہ سے حاصل کیا جاتا تھا۔ وہ ریاست کی مجموعی ذمہ داری پر ہوتا تھا۔ بہرحال عبدالشکور خاں صاحب کے بعد حبیب الرحمن خاں صاحب کے سامنے یہ تکلیف دہ مرحلہ ادائیگی قرضہ کا سب سے زیادہ مقدم تھا۔ ان کے بعض ہوا خواہوں نے جن میں کچھ قانون پیشہ اصحاب بھی تھے مشورہ دیا کہ قانوناً آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں عائد ہوتی ہے یعنی یہ کہ آپ کے والد محمد تقی خاں صاحب کے نہ دستخط ہیں ان رقعوں پر نہ اور کسی طرح سے ان پر کوئی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اس لئے آپ بالکل آزاد ہیں۔ اور بار ادائیگی قرضہ عبدالشکور خاں صاحب کی اولاد پر ہے۔

لیکن خدا نے نواب صاحب کو وہ صحیح احساس مذہبی دیانت و امانت کا عطا فرمایا تھا کہ انھوں نے بلا تامل کہہ دیا۔ کہ کیونکہ روپیہ کا کل انتظام ریاست سے متعلق قرضہ میں لیا گیا تھا۔ اس لئے میں بخوشی نصف کا اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہراتا ہوں۔ یہ بات معمولی نہیں تھی۔ اور نہ معمولی آدمی اس کے متحمل ہو سکتے تھے بلکہ

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ناظرین۔ آپ ملاحظہ فرمائیں۔ اور سوچیں کہ نواب صدر یار جنگ کس اخلاقی اعلیٰ مرتبہ پر تھے اور انھوں نے کس قدر ایثار و قربانی سے ریاست بھیکن پور کو تباہی و بربادی سے بچا لیا تھا۔

یہاں تک تو جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس میں میری سرکاری حیثیت ملازمت کا دخل اور واقفیت شامل تھی۔ اور یہ مندرجہ بالا واقعات سنہ ۱۹۰۹ء تک محدود رہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء کے شروع میں ریاست باولی کہ دورہ بند لکھنؤ میں چلا گیا۔ اور پانچ سال تک وہاں مقیم رہا۔ لیکن اس دوران میں مجھ کو بار بار علی گڑھ میں اپنے تعلق کالج کی وجہ سے آنا پڑتا تھا ان مواقع پر نواب صاحب سے طویل ملاقاتیں رہتی تھیں۔ کیونکہ موصوف کو بھی کالج اور کانفرنس کی کمیٹیوں سے خاص شغف تھا۔ نیز مراسلت بھی برابر جاری تھی۔ نواب صاحب مراسلت میں بہت مستعد اور چست تھے۔ مجھ کو یاد نہیں کہ خطوط کے جواب میں کبھی ایک دن کی بھی دیر لگی ہو ان سب وجوہ سے میرا تعلق نواب صاحب سے معمولی ملاقات کے حدود سے گذر کر اخلاص و محبت کے دائرہ میں آ گیا جس اتفاق سے کہ دورے سے واپسی کے بعد علی گڑھ میں میری تعیناتی بحیثیت ڈپٹی کلکٹر ہو گئی۔ اور تحصیل اترولی سے پھر مجھ کو سرکاری حیثیت سے تعلق ہوا۔ اس سے قبل ہی ریاست بھیکن پور تقسیم ہو چکی تھی۔ اور نواب صاحب مرحوم حبیب گنج میں اپنے مسائل علمی میں بالخصوص منہمک رہتے تھے۔ چنانچہ اسی زمانے میں میں نے حبیب گنج اور ان کے سرسبز باغ اور ان سے زیادہ مشہور کتب خانہ کی وقتاً فوقتاً سیر۔

ایک پر لطف واقعہ

نواب محمد اسحاق خاں کے زمانے میں ایک جلسہ ٹرسٹیان کالج کا اس عمارت میں جس میں اب کامرس ڈپارٹمنٹ ہے۔ منعقد ہوا اتفاق سے اس جلسہ میں نواب صاحب مرحوم خواجہ سجاد حسین صاحب پانی پتی اور راقم الحروف کے

یہ سب کچھ باوجود ضعف ہوتا تھا۔ صحت کی اس کیفیت پر خدا کا انعام کہہ کر شکر ادا کرتے اور حافظہ پرانی باتوں کے لئے اس وقت تک ایسا تھا کہ سرِ مو فرق نہ ہوا تھا۔ جو بات جس طرح پہلے سنایا کرتے اب بھی اسی طرح پر محفوظ تھی۔ البتہ وقتی اور حال کی باتوں میں اب آخر میں کافی نسیان ہو گیا تھا۔

مجھ پر الطاف کریمانہ کانفرنس میں ایک جلسہ تھا۔ یونیورسٹی کے متعدد پروفیسران شریک جلسہ تھے میں بھی حاضر تھا۔ جدید و قدیم طریقۂ تعلیم پر گفتگو تھی۔ نواب صاحب مرحوم تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے جس کا وقت اس زمانے میں جو تباہی علم کی ہے اس پر تاسف کا اظہار فرما کر قدیم تعلیم کے سلسلے میں حضرت استاد العلماء رحمۃ اللہ علیہ نے جو بحالت معذوری مجھ کو پڑھایا اسکا ذکر کیا۔ پھر اہل مجلس کی طرف خطاب کر کے کہا۔ دیکھئے اس معذوری کی حالت میں تعلیم پانے والا موجود ہے۔ اور مجھ سے فرمایا کھڑے ہو جاؤ۔

دعوت شدید تک سال میں ایک بار ہوتی جو عام تھی۔ اور بھی کئی دعوتیں ہوتیں ہر دعوت میں میری ایک خاص جگہ تھی۔ میں خود بھی مخصوص طور پر ان کے لئے دعوتیں ترتیب دیتا جن میں خلوص سے شرکت کرتے میرے یہاں کے کھانوں کی لذت اور خوش ذائقگی کی ستائش فرماتے اور پھر کہتے سب سے بڑھ کر آپکی محبت لذیذ ہے۔ ایک بار میں نے دعوت ترتیب دی جو دن مقرر ہوا تھا۔ عین اسی دن جب کہ وقتی سامان ہو چکا تھا۔ پیام آیا کہ کوئی فوری ضرورت پیش آگئی ہے۔ حبیب گنج جا رہے ہیں دعوت میں شریک نہ ہوں گے۔ مجھ کو اس وقت نہایت رنجیدہ ہوا۔ مگر کیا کرتا۔ مجبور تھا۔ شام کو کیا دیکھتا ہوں کہ وقت سے بہت کافی پیشتر چلے آ رہے ہیں۔ جس قدر رنج ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ اب مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ سواری سے اترتے ہی فرمانے لگے: "جانا تو بہت ضروری تھا سب سامان بھی ہو گیا تھا۔ اور موٹر تک سواری میں لگ گیا تھا۔ مگر آپ کی کشش نے روک لیا۔"

مفتی صاحب کے بیان جب مجھ سے پہلے تشریف لے آتے۔ اور میں بعد کو حاضر ہوتا تو فرماتے کہ ابھی تمہارا ہی ذکر تھا۔ اکثر مجھے اپنے ساتھ سواری میں بٹھاتے میں ادب ملحوظ رکھتے ہوئے تکلف سے بیٹھتا۔ تو فرماتے "بلا تکلف آرام سے بیٹھئے" غرض تکلف قائم نہ رہنے دیتے۔ جب میں سفر سے واپس آتا مجھ سے معانقہ کرتے۔

جب میں لکھنؤ اپنی لڑکی کے پاس جاتا تو فرماتے "بچی کو میری طرف سے بہت بہت دعا کہنا" غرض میرے ساتھ اتنی یگانگی برتتے کہ دوئی محسوس نہ ہوتی۔ مرض الموت کے آخر میں ایک بار جو حاضری ہوئی تو پہچانا نہیں۔ کچھ توقف کے بعد خود ہی معانقہ کے لئے ہاتھ بڑھایا میں نے اپنا ہاتھ دیا تو دیر تک نہ چھوڑا غفلت کی حالت میں بھی آنکھوں پر گن کر دم لینے کا معمول جاری تھا جنازے میں شرکت کے وقت مجھے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا وہ شعر یاد آیا۔ جو انھوں نے خلیفہ ثالث حضرت عثمان کی شہادت کے روز کہا تھا۔ شعر یاد آتے ہی اسکو حسب حال بنانے کے لئے تصرف بھی خیال میں آگیا۔ چنانچہ تصرف کرنے اور حسب حال بنانے کے بعد اُن کو درج ذیل کرتا ہوں:

للناس همٌّ ولی الیوم همّان
فقد الکمال وموت الشیخ شروانی

اس تصرف میں اگرچہ ایک جگہ سقم ہے لیکن بضرورت میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ دیر تک وردِ زبان رکھا۔ اور اب بھی کسی وقت زبان پر آ جاتا ہے۔ تو کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اب جنازے کا ایک واقعہ بیان کر کے دعائے مغفرت پر اس طول کو ختم کرتا ہوں کیا ضرور ہے کہ جیسی دلچسپی مجھ کو ہے ہر شخص کو ہو۔

نماز ظہر جنازہ علی گڑھ سے خاندانی قبرستان گیا۔ متعدد لوگ یہاں سے گئے میں بھی ان میں تھا۔ قبرستان پہونچ کر معلوم ہوا کہ قبر میں دیر ہے۔ چنانچہ شام ہو گئی۔ مغرب کے وقت قبر تیار ہوئی۔ کہنا یہ ہے کہ بارش کا موسم تھا۔ بادل امنڈ رہے تھے اور ادھر ادھر خوب بارش ہو رہی تھی۔ جنازہ لے گئے ایک چھولداری لگا دی گئی تھی۔ کہ اگر بارش ہونے لگے تو اس میں رکھ دیا جائے۔ لیکن وہاں ایک قطرہ بھی نہ گرا گھنٹے دو گھنٹے نہیں بلکہ گھنٹوں واپسی میں بھی جا بجا بارش شدت سے ہوتی ہوئی ملی۔ اگر بارش ہوتی تو اس میدان میں شرکائے جنازہ کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ مگر ان کی نیکی کا تصرف دیکھئے کہ شرکا تکلیف سے محفوظ رہے۔

اللھم امطر شآبیب الرحمۃ والغفران
علی شیخ الشروان حبیب الرحمن
آمین آمین برحمتک یا ارحم الراحمین

(مولانا) محمد بدر الدین علوی

ضمیمہ محترم جناب مفتی عبد اللطیف صاحب کا ذکر اوپر بار بار آچکا ہے۔ نواب صاحب مرحوم کا تعلق موصوف سے ہر شخص کو معلوم ہے اور میرا معارف والا مضمون غالباً بڑے ساز طریقہ اس کا حامل ہے۔ مفتی صاحب نے مجھ سے فرمایا ہے کہ مندرجہ ذیل واقعہ ان کی روایت سے اپنے اس مضمون میں شامل کر دوں۔

نواب صاحب مرحوم کے حیدرآباد سے ترک تعلق کے بعد معمول تراشہ پایا تھا کہ ہر سال عثمانیہ یونیورسٹی کی تعطیل کلاں میں نواب صاحب کی طلب پر مفتی صاحب حبیب گنج تشریف لایا کرتے چنانچہ ایسے ہی موقع پر ایک روز بعد مغرب کی نشست میں نواب صاحب نے بہت مسرت کے ساتھ فرمایا۔ شب گذشتہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک صاحب کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے میز پر رجسٹر رکھا ہوا ہے جس میں دو فہرستیں ہیں۔ ایک اہل جنت کے ناموں کی اور دوسری اہل دوزخ کی میں جھک کر رجسٹر دیکھنے لگا۔ تو انھوں نے مجھ سے پوچھا آپ کیا دیکھتے ہیں۔؟ میں نے کہا دیکھتا ہوں کہ میرا نام کس فہرست میں ہے۔ انھوں نے جواب دیا آپ کا نام جنت والوں کی فہرست میں ہے۔

مخمس!

(بر غزل حضرت امیر خسرو دہلوی)

قیامت کا سماں تھا اور محشر خیز تھا عالم — متاعِ ہوش پر گرتی تھیں ہر سو بجلیاں پیہم
صفیں تھیں جلوۂ قاتل کی ساری ہم درہم — نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم
ہر جا رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم

پری روئے سمن بوئے سراپا ناز دلدارے — بہ گیسو غیرت سنبل بعارض رشک گلزارے
بلائے ہوش عیارے ستمگارے جفاکارے — پری پیکر نگارے سرو بالا لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود شب جائیکہ من بودم

غضب کی کشمکش تھی حوصلہ فرسا تھی سب ساماں — ادھر تو تھے بھری دل میں ہزاروں حسرت و ارماں
ادھر دل خوف افشا سے لبانِ بید تھا لرزاں — رقیباں گوش بر آواز او در ناز من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

جگر بریاں نفس سوزاں نظر ششدر عجب منظر — بھیانک تھی شب تاریک وحشت خیز بام و در
پریشاں ہوش سر تا سر مجسم تخیل خرد مضطر — فغاں بر لب الم در دل قلق در جاں اجل بر سر
بلا ہا بے تو نازل بود شب جائیکہ من بودم

بیابانِ طلب میں جو جنوں کی آگ کی اک رو — شرارے جس سے پکار اٹھتی ہیں جب لے الحذر رہرو
یہ دامن جھاڑ کر بولا پڑا جس پر ذرا پرتو — مرا از آتشِ عشقِ تو دامن سوخت ای خسرو
محبت شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

تعالی اللہ زہے طالع میں جا پہنچا کہاں خسرو — جہاں چرخ ہفتم کا بھی نہ تھا نام و نشاں خسرو
صفت اس بزم اعلیٰ کی کروں کیونکر بیاں خسرو — خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

(حسرت شروانی)

ایم۔ اے۔ او کالج سے آپ کا تعلق اس قدر مستحکم وعمیق تھا اور آپ ایسی دلچسپی اور انہماک سے اس کے کاموں میں حصہ لیتے تھے کہ بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس قدر دلچسپی آپ کو کسی دوسری قومی تحریک یا ادارے سے نہ ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے طلبہ، اساتذہ اور ارکان سے بھی نواب صاحب مرحوم کا تعلق اسی قدر قدیم اور مستحکم تھا۔ وہ ندوۃ العلماء کے ایک سربرآوردہ ومقتدر رکن تھے۔ اور برابر اس کی مجالس انتظامیہ میں شرکت فرماتے تھے نیز تمام انتظامی معاملات اور ترتیب نصاب تعلیم وغیرہ میں عملی حصہ لیتے تھے۔

اس کے علاوہ طلبہ کے وظائف اور دوسری مدات کے لئے مالی امداد بھی فرمایا کرتے تھے ندوۃ العلماء کے کاروبار سے آپ کا رابطہ اتنا مستحکم تھا۔ کہ جب مجلس ندوۃ العلماء نے اپنا آرگن رسالہ "الندوہ" جاری کیا۔ تو برسوں تک اس کے سرورق پر اڈیٹروں کے دونام پابندی سے لکھے جاتے رہے تھے "شبلی نعمانی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی"

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے اس رابطہ وتعلق کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مولانا شروانی مرحوم مذہبی ومشرقی علوم کے تحفظ اور نشر و اشاعت سے خاص شغف رکھتے تھے۔ اور ندوہ اس تحریک کا علمبردار تھا اور علوم اسلامیہ کی بقا و احیا کے لئے جد و جہد کر رہا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ ندوۃ العلماء کی تحریک کو بروئے کار لانے والے درحقیقت حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جو حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن علیہ الرحمۃ کے ممتاز واکابر خلفاء میں سے تھے۔ مولانا شروانی مرحوم کو اپنے محترم مرشد اور ان کے خلیفہ مولانا سید محمد علی سے بے مثال عقیدت تھی، جب کسی صحبت میں حضرت شاہ علیہ الرحمۃ کا ذکر چھڑ جاتا تھا تو مولانا شروانی مرحوم نہایت والہانہ محبت وعقیدت اور شگفتگی کے ساتھ اس ذکر میں حصہ لیتے تھے اور اپنے مرشد کی حیات طیبہ سے متعلق بہت سے واقعات بیان فرماتے تھے، ان واقعات میں سب سے نمایاں چیز یہ ہوتی تھی کہ حضرت شاہ صاحب کو احادیث نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام خصوصاً بخاری شریف پر کس قدر عبور تھا اور اتباع سنت نبوی کا کس قدر اہتمام فرماتے تھے۔

مولانا سید محمد علی صاحب مرحوم سے بھی نواب صاحب قبلہ کو عقیدت تھی اور وہ ممدوح سے نیازمندانہ طریقے سے ملتے تھے، مولانا سید محمد علی صاحب اس زمانے کے نہایت مقتدر و اکابر علماء میں سے تھے اور انہوں نے مختلف طریقوں سے ملت اسلامیہ اور علوم اسلامیہ کی نادر المثال خدمت انجام دی تھی۔ نیز اپنی مفید ومحققانہ اور معرکۃ الآراء تصانیف اور روحانی فیوض وبرکات سے ہزاروں انسانوں کو فائدہ پہنچایا تھا۔ افسوس کہ یہاں ان خدمات کے تذکرہ کا موقع نہیں۔ اگر یہ تذکرہ چھڑ گیا تو یہ داستان نہایت طویل ہو جائے گی۔

حضرت مولانا سید محمد علی صاحب کے علاوہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کے بعض دوسرے فیض یافتہ علماء مثلاً مولانا سید ظہور الاسلام صاحب وغیرہ ایک مقدس مذہبی فرض سمجھ کر ندوۃ العلماء کی تحریک میں زبردست عملی حصہ لے رہے تھے۔ ان میں سے ہر بزرگ بجائے خود ایک علمی وروحانی درسگاہ کی حیثیت رکھتا تھا اور نواب صاحب مرحوم کو ان سب بزرگوں سے محبت وعقیدت تھی۔ مخلصانہ تعلقات تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ علماء کی اس مقدس جماعت کی صحبت میں رہ کر خوش ہوتے اور روحانی کیف وسرور حاصل کرتے تھے۔

ان علمائے کرام کے بعد جب استاد مرحوم مولانا شبلی نعمانی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد (سکریٹری) مقرر ہوئے۔ تو نواب صاحب مرحوم کا تعلق اس ادارہ سے اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ مولانا مرحوم سے نواب صاحب کے تعلقات بہت مخلصانہ بلکہ برادرانہ تھے اتحاد مذاق نے دونوں بزرگوں کو ایک دوسرے کا مداح ومعترف بنا دیا تھا۔ دونوں کے دل میں اسلامی تاریخ وروایات آثار سلف اور علوم اسلامیہ کے تحفظ وبقا کا زبردست جذبہ کارفرما تھا۔ اور اسلام کے عہد عروج واقبال کا مرقع دونوں کے پیش نظر تھا۔ اسلاف کرام کے دماغی افکار اور تصانیف کی جستجو دونوں کو تھی اور دونوں بزرگ ان جواہر پاروں کے قدرشناس تھے۔ اگر ان باتوں کی مزید تفصیل بیان کی جائے تو جمہور کے صدر یار جنگ نمبر کا دامن اس کو سمیٹنے سے قاصر رہے گا۔

> داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار
> گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

نواب صاحب مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب سرسید مرحوم کے زمانہ میں مولانا شبلی نعمانی بطور ایک استاد یا پروفیسر کے ایم اے او کالج میں تشریف لائے۔ تو موصوف سے سب سے پہلی ملاقات نمائش علی گڑھ کے کسی کیمپ میں ہوئی اس وقت علامہ بالکل نوجوان اور تنومند تھے اسوقت جو تعلق پیدا ہوا وہ علامہ کے آخر ایام حیات تک قائم رہا۔

اسی زمانہ میں جب مولانا شبلی نعمانی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تھے، جب نواب صاحب مرحوم لکھنؤ تشریف لے جاتے تو عموماً مولانا ہی کے یہاں قیام فرماتے تھے۔ مولانا کو ان کی تشریف آوری سے بہت خوشی اور مسرت ہوتی تھی۔ اور دونوں بزرگ اس محبت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ راقم الحروف کو نواب صاحب قبلہ کا شرف زیارت وتکلم سب سے پہلے مولانا ہی کی قیامگاہ پر حاصل ہوا اور اس لحاظ سے کہ ممدوح علاوہ جلیل القدر عالم ہونے کے استاد محترم کے دوست تھے اسی وقت سے ان کی عزت وعظمت میرے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ اس زمانے میں دارالعلوم کی اونچی جماعتوں کے متعدد طلبہ بعد نماز عصر مولانا کی بارگاہ میں حاضر ہو کر علمی فیوض حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ صحبت بھی ایک عجیب صحبت تھی۔ جو پھر کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اس زمانہ میں علامہ کے یہاں حاضر ہونے والوں میں متعدد طلبہ ایسے تھے جنہوں نے زمانہ مابعد میں اپنی محققانہ ومعیاری تصانیف اور انشا پردازی یا دوسری قومی وملی خدمات کی بدولت ملک میں کافی عزت وشہرت حاصل کی مثلاً سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی، مولانا عبدالباری صاحب ندوی، مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی مرحوم وغیرہم۔

غرض اسی زمانہ میں مجھے نواب صاحب کی خدمت میں حصول نیاز کا موقع ملا۔ اس زمانہ کے بعد جب علامہ مرحوم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمت سے دستکش ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ تشریف لے گئے۔ اور وہاں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ تو رسالہ الندوہ کی ادارت کی خدمت راقم الحروف کے متعلق کی گئی۔ نواب صاحب قبلہ ابتدا ہی سے الندوہ کے معاون وخریدار تھے۔ اس لئے الندوہ کا یہ تعلق نواب صاحب سے مزید تعارف کا باعث ہوا۔ غرض زمانہ طالب علمی کا یہی تعارف میرے علی گڑھ آنے کا باعث ہوا اور مجھے نواب صاحب مرحوم کے زیر نگرانی ایک طویل زمانہ تک کانفرنس کے لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرنے کی سعادت وعزت حاصل ہوئی۔ نواب صاحب مرحوم کو میری طالب علمی کا یہ زمانہ اور علامہ کی صحبتیں اچھی طرح یاد تھیں اور کبھی کبھی اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ میں آپ کو طالب علمی کے زمانہ سے جانتا ہوں دوسرے اپنی جگہ پر ہیں آپ اپنی جگہ پر اپنا کام لئے جائیے۔

اس زمانہ میں جب نواب صاحب قبلہ ندوۃ العلماء کی کسی کمیٹی میں شرکت کے لئے لکھنؤ تشریف لے جاتے۔ تو ہمیشہ تو نہیں لیکن اکثر دارالعلوم میں تشریف لا کر طلبہ سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔

اس موقع پر آپ جو تقریریں فرماتے ان میں عموماً اسلامی ومشرقی نقطۂ نظر سے طلبہ اساتذہ کے فرائض وحقوق کی تفصیل بیان فرماتے، نیز اسلاف کرام اور مشاہیر علماء کے حالات بیان کر کے یہ بتاتے تھے کہ ان میں سے اکثر نے کیسے ناسازگار وناموافق حالات یا عسرت وتنگدستی میں جد وجہد کر کے علم میں درجہ وکمال حاصل کیا اور اس کے بعد ملک وملت کی غیر فانی خدمات انجام دیں۔

نواب صاحب کی یہ تقریریں نوجوان طلبہ کے دلوں میں جوش وولولہ اور علم کی تشنگی اور امنگ پیدا کرتی تھیں، اور طلبہ واساتذہ دونوں ان تقریروں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نواب صاحب جو کچھ فرماتے دلی جذبہ واخلاص سے فرماتے تھے۔ اس لئے بمصداق

آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد، اس کا اثر ہوتا تھا۔

یہی کیفیت استاد مرحوم علامہ شبلی نعمانی کی روزانہ صحبت اور تقریروں کی تھی۔ جن کو سنکر مردہ سے مردہ دل میں حرارت اور علم کی تڑپ پیدا ہو جاتی تھی۔ مولانا شروانی اور علامہ شبلی نعمانی دونوں بزرگ یہ رائے رکھتے تھے۔ کہ اگر قوم کے ہونہار نوجوانوں کو صحیح طریقہ سے تعلیم وتربیت دی جائے تو وہ اسلامی علوم وتہذیب کو زندہ کرنے کی بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اس لئے ان بزرگوں کے دلوں میں ایک عجیب سوز وگداز پیدا ہو گیا تھا۔

اس وقت زمانہ طالب علمی کا ایک پر اثر واقعہ یاد آ گیا۔ جو اگرچہ اس موقع سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رکھتا لیکن اس مضمون میں نواب صاحب مرحوم کے دوست استاد مرحوم کا ذکر بار بار آیا ہے اس لئے لکھنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی دارالعلوم ندوہ کی خدمت سے استعفا دیکر ہمیشہ کے لئے لکھنؤ سے رخصت ہو رہے ہیں۔ سامان سفر تیار ہو چکا ہے۔ علامہ سے طلبہ کو جو محبت وشگفتگی تھی اس کو الفاظ کے ذریعہ بیان کرنا ممکن نہیں۔ طلبہ پر اس دائمی جدائی کا اثر تھا۔ ان کی آرزو تھی کہ علامہ لکھنؤ سے رخصت ہونے سے پہلے آخری دفعہ ان کے مجمع سے خطاب کریں۔ اور اپنی دوامی تقریر میں ان کو نصیحتیں فرمائیں۔ لیکن علامہ کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ ناتوانی اور کمزوری غالب تھی پھر بھی اپنی شفقت ومحبت بزرگانہ کی بنا پر طلبہ کی درخواست کو رد نہ کر سکے۔ مغرب کے بعد تشریف لائے کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ چوکی پر بیٹھ کر تقریر کی تقریر کیا کی، دل و جگر کے ٹکڑے نکال کر ان عزیزوں

ہیں پاس کی نشستوں پر تھے ۔ حاجی محمد صالح خاں مرحوم بھی سے دو تین نشستوں کے بعد تھے ایک مسئلہ زیر بحث پر (جس کی تفصیل یاد نہیں) نواب صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہوا اس کے بعد حاجی صالح خاں صاحب نے نواب صاحب مرحوم کی رائے سے اختلاف کیا خواجہ صاحب نے بلا تامل نواب صاحب کو مخاطب کرکے یہ آیت پڑھی۔

"إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ"

نواب صاحب اور جو لوگ قریب تھے اسکو سنکر بہت محظوظ ہوئے غالباً حاجی صالح خاں صاحب نے اسکو سنا نہیں ۔ اور اگر سنا ہو تو اس کے بعد کچھ کہا نہیں ۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں نظام حیدر آباد دکن نے نواب صاحب کو صدر الصدور امور مذہبی بناکر حیدر آباد بلالیا ۔ نواب صاحب سال میں دوبار وہاں سے تشریف لاتے ۔ اور حیدر آباد کے دلچسپ حالات بیان فرمایا کرتے تھے ۔

چند سال کے بعد نواب صاحب حیدر آباد سے واپس تشریف لے آئے ۔ اور پھر جناب ممدوح کا مستقل قیام علی گڑھ میں ہو گیا ۔ اب موقع نواب صاحب سے زیادہ ملنے کا ملا اور اس وقت ان کے صحیح جذبہ دینداری اور تقوے کا اندازہ ہوا ۔

میرا یقین کامل ہے کہ ان امور میں نواب صاحب اس قدر درجۂ اعلیٰ وارفع پر تھے ۔ کہ جس کا اندازہ کرنا اس زمانے میں مشکل ہے وضعداری ان کی تو زبان زد خاص و عام ہے لیکن میں ایک ذاتی واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مجھ سے اور جناب مرحوم سے یہ قرارداد ایک خاص موقع پر ہوگئی تھی ۔ کہ میں حبیب منزل حاضر نہ ہوا کرونگا ۔ لیکن ایک مرتبہ حاجی ملا احمد عرف ملا جی نے ولایت منزل میں مجھ سے علیحدہ چپکے سے کہا ۔ کہ حبیب منزل کا باغ آجکل بہار پر ہے ۔ اور دیکھنے کے لائق ہے ۔ میں نے اسوقت نہ کچھ ملا جی سے کہا اور نہ نواب صاحب سے کچھ عرض کیا لیکن دوسرے روز پھولوں کی سیر کے شوق میں حبیب منزل پہونچ گیا ۔ نواب صاحب مجھ کو دیکھ کر بہت متحیر ہوئے ۔ اور ایک خاص خلوص کے انداز میں فرمایا ۔ کہ اب آپ سے ملاقات ہونا معلوم ہوتا ہے ترک ہو جائے گی ۔ کیونکہ آپ نے خلاف معاہدگی کی ہے ۔ میں نے بمنت و سماجت اصل حال ان سے بیان کیا اور ان کو یقین دلایا کہ پھر ایسی بات میری طرف سے پیدا نہ ہوگی ۔ یہ تو ایک معمولی بات تھی ۔ ان کی خوبیوں کو احاطۂ تحریر میں لانا میرے لئے ناممکن ہے ۔

—————

نواب صدر یار جنگ مرحوم کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر!

(مولانا محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)
سابق مدیر کانفرنس گزٹ علی گڑھ

اس دور کے آخر میں نواب صدر یار جنگ مولانا الحاج ڈاکٹر محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم مغفور کی ذات بابرکات اپنے علمی فضائل و کمالات، محاسن اخلاق و سیرت و کردار کی گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھی ۔ خصوصاً امراء و ارباب ثروت و ریاست کے طبقہ میں ایسی جلیل القدر اور جامع خصائص شخصیت میری نظر سے نہیں گذری ۔

نواب صاحب مرحوم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی ایک طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے ۔ بلکہ ان کی ہمہ گیر شخصیت ہر طبقہ میں اس قدر گھلی ملی ہوئی نظر آتی تھی کہ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی طبقہ کے ایک معزز فرد ہیں اور کسی دوسری جماعت یا طبقہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ لیکن درحقیقت یہ خیال صحیح نہیں تھا ۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر طبقہ میں مولانا شروانی مرحوم کو ایک امتیاز خاص حاصل تھا ۔ اور ہر جماعت میں انکی شخصیت نمایاں تھی ۔

مولانا شروانی مرحوم اپنے ایام شباب ہی میں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن علیہ الرحمۃ گنج مرادآبادی کے حلقۂ بیعت و ارادت میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کر چکے تھے ، اور اس سلسلے ارادتمندوں میں ان کی ممتاز حیثیت تھی ۔ اور ان کا خاص احترام کیا جاتا تھا ۔ نیز دوسرے مشہور سلسلوں کے مشائخ عظام و صوفیائے کرام اور سجادہ نشین بزرگوں سے ان کے خاص تعلقات تھے اور یہ سب اصحاب نواب صاحب مرحوم کو اپنی برادری اور حلقہ کا ایک فرد سمجھتے تھے ۔

اس کے علاوہ مولانا شروانی اپنے علمی فضائل و کمالات ، معارف پروری اور مذہبی زندگی کی بنا پر ہر طبقہ کے مشاہیر علماء اور ارباب درس و تدریس کی جماعت میں ایک بلند مرتبہ رکھتے تھے ۔ اور ہر خیال کے علماء کے حلقہ میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ہندوستان کے مشہور و معروف تعلیمی اداروں سے جہاں مذہبی و مشرقی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ مرحوم کے خاص تعلقات تھے ۔ مثلاً دارالعلوم ندوۃ العلماء ، دارالعلوم دیوبند اور فرنگی محل وغیرہ جیسے مشہور اداروں اور تعلیمگاہوں کے اساتذہ اور ارباب حل و عقد کی جماعت میں آپ کی ایک ممتاز عالم و فاضل کی حیثیت سے عزت کی جاتی تھی ۔

میں نے بارہا دیکھا کہ جب وہ علمائے کرام کی مقدس مجلس اور صحبت میں ہوتے تھے تو اس جماعت میں اس قدر گھلے ملے اور بے تکلف حالت میں نظر آتے تھے ۔ کہ کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ان کا تعلق کسی دوسری جماعت یا علی گڑھ کے جدید تعلیم یافتہ گروہ سے بھی ہو سکتا ہے ۔ جب وہ علماء کی صحبت ہوتے تو مذہبی و مشرقی علوم خصوصاً تفسیر و حدیث نیز سیرت اور تاریخ و ادب سے تعلق رکھنے والے مباحث میں ایسے انہماک و شوق سے حصہ لیتے اور ایسے تفسیری و تاریخی نکات پیش کرتے تھے کہ ہر شخص بلا شائبۂ ریب یہ محسوس کرتا تھا کہ ان مذہبی و مشرقی علوم میں نواب صاحب کو خاص درجہ کمال ہے ۔ اور انکا مطالعہ نہایت وسیع ہے ۔ اس لئے ہر شخص بالطبع یہ سمجھتا تھا کہ ان کی اصلی جگہ علماء کی صف میں ہے ۔ اور جدید تعلیم یافتہ گروہ یا طبقہ سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے ۔ لیکن یہ خیال صحیح نہ تھا ۔

واقعہ یہ ہے کہ علماء و مشائخ کے طبقہ کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور اس جماعت کے سربرآوردہ اصحاب اور قائدین و لیڈروں سے بھی ان کے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے اور وہ اس حلقہ میں بھی مانوس و محبوب اور ہر دلعزیز تھے ۔

سرسید مرحوم نے جب علی گڑھ میں اپنی تعلیمی تحریک کا آغاز کیا ۔ اور ایم ۔ اے ۔ او کالج کی بنیاد ڈالی تو نواب صاحب مرحوم کے بزرگ اس ضلع کے ممتاز امراء و رئیس سے تھے ۔ اور امور خیر میں فیاضی سے حصہ لیتے اور دولت کے صحیح مصرف سے واقف تھے ۔ آغاز کار ہی میں سرسید کے حامی و مددگار بن گئے ۔ اور اپنی مالی و اخلاقی امداد سے سرسید کی تحریک کو کامیاب بنانے میں حصہ لیتے رہے نواب صاحب مرحوم بھی اپنے خاندان کے مسلک کے مطابق علی گڑھ تحریک سے وابستہ ہوکر اس میں عملی حصہ لیتے رہے ۔ نواب صاحب مرحوم سرسید کی خدمات کے معترف اور قدرشناس تھے ۔ اور دل سے ان کی عظمت کرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ سرسید مرحوم کے مذہبی عقائد و آزادانہ خیالات سے بالکل متفق نہیں تھے ۔ اور خود سرسید بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے لیکن باایں ہمہ اختلاف خیال ، خود اپنے اختیار سے مولانا شروانی مرحوم کو کالج کا ٹرسٹی مقرر فرمایا عنفوان شباب میں سرسید جیسے شخص کا ان کو اس منصب کے لئے موزوں سمجھنا کوئی معمولی بات نہیں تھی ۔ سرسید کے بعد بھی ان کے ممتاز جانشینوں یعنی نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک اور نواب محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم وغیرہ کے زمانے میں بھی کالج کے ٹرسٹی رہے ۔ اور اس کے بعد جب مسلم یونیورسٹی وجود میں آئی تو وہ ابتدا ہی سے اس کے ممبر کورٹ مقرر ہوئے ۔ اور یہ تعلق مرحوم کے آخر ایام حیات یعنی تقریباً ربع صدی تک قائم رہا ۔

اس کے علاوہ نواب صاحب مرحوم ایک طویل زمانہ تک مسلم یونیورسٹی کی اگزیکٹو کونسل کے ممبر بھی رہے ۔ اور مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ دینیات کو تقریباً آپ کے زیر اثر رہا ۔ اور اخیر دور میں جب ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں ہر شعبہ کے لئے ڈین مقرر ہوئے ۔ تو نواب صاحب مرحوم فیکلٹی آف تھیالوجی کے ڈین مقرر ہوئے ۔ اور ڈاکٹر صاحب کے بعد بھی اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہتر انتخاب ممکن بھی نہ تھا ۔ کیونکہ مذہبی و مشرقی علوم میں مرحوم کو خاص بصیرت حاصل تھی ۔ اور انھوں نے مختلف طریقوں سے ان علوم کی خدمت بھی کی تھی ۔ اس کے علاوہ وہ اس دائرہ کی دیرینہ روایات اور یہاں کے طلبہ کی مخصوص ذہنیت سے بھی واقف تھے ۔

مولانا شروانی مرحوم ہمیشہ ایم ۔ اے ۔ او کالج اور مسلم یونیورسٹی کی مالی و اخلاقی امداد فرماتے رہے ۔ بلکہ علی گڑھ سے جو تحریک بھی سرسید یا ان کے جانشینوں نے شروع کی مولانا شروانی مرحوم نے ہمیشہ اس میں حصہ لیا ۔ چنانچہ جب مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تحریک بروئے کار آئی تو مرحوم نے نہ صرف مالی امداد فرمائی بلکہ دوسرے اصحاب کے ساتھ وفد میں شریک ہوکر ملک کے بعض حصوں کا دورہ بھی کیا ۔ اور دوسرے اصحاب سے مالی امداد حاصل کی ۔

ذکر کیا جائے داستان طول طویل بنتی ہے
داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

نواب صاحب کے کتابخانہ پر بہ نہایت مختصر تبصرہ ہے اور وجوہ ندرت بیان کرنے کے لئے بڑی محنت اور کافی وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے یہ کتابخانہ چار پانچ دفعہ دیکھا ہے۔ مگر سرسری نظر سے نواب صاحب کے ایام حیات میں کئی دفعہ یہ خیال آیا کہ چند روز حبیب گنج میں قیام کر کے کتاب خانہ پر ایک مقالہ لکھوں مگر افسوس کہ اس کی نوبت نہ آئی۔ اگر یہ ارادہ پورا ہوتا تو نواب صاحب کس شوق و ذوق سے میری رہنمائی فرماتے۔ اور اس کام میں مدد دیتے۔

نواب صاحب کو محض کتابوں کے جمع کرنے کا شوق نہ تھا جس طرح کہ بعض امراء کو کسی چیز کے جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ مگر یوں ہی خواہ مخواہ، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ علم کی خدمت اور اپنے اسلاف کرام کے اس قیمتی سرمایہ کی حفاظت کا جذبہ کارفرما تھا۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ علمائے سلف کے نتائج افکار آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ ہو جائیں۔ نواب صاحب صرف کتابیں نہیں جمع کرتے تھے بلکہ ان سے استفادہ بھی کرتے تھے۔ وہ اپنے کتابخانہ کی تمام کتابوں پر حاوی تھے۔ اور ہر کتاب کی خصوصیات اور وجوہ ندرت بیان کر سکتے تھے۔ یہ کتابخانہ تقریباً ساٹھ برس کی مسلسل و پیہم سعی و کوشش کا نتیجہ تھا۔

نواب صاحب کو قلمی اور نادر الوجود کتابوں کے بارے میں اس قدر غیر معمولی بصیرت اور غیر معمولی کمال حاصل ہو گیا تھا۔ کہ وہ کوئی قلمی کتاب ہاتھ میں لے کر یہ بتا سکتے تھے کہ یہ کس صدی کی لکھی ہوئی ہے۔ اور اس کا کاغذ کس شہر یا ملک کا بنا ہوا ہے۔ مثلاً گجرات سمرقند۔ یا کشمیر کا۔ وہ ہر ملک کے رسم خط و طرز کتابت سے بھی واقف تھے۔ اس لئے یہ بھی بتا سکتے تھے کہ کس ملک میں لکھی گئی ہے۔ وہ کوئی قدیم مجلد کتاب دیکھ کر یہ بھی اندازہ کر لیتے تھے کہ جلد کا یہ ڈیزائن یا نقش و نگار کس بادشاہ کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے بتایا کہ عہد جہانگیری کی جلد کی یہ خصوصیات ہیں۔ انکی غیر معمولی بصیرت کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ کتابوں کے معاملہ میں کوئی شخص ان کو دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔

علی گڑھ اور حیدرآباد میں کئی دفعہ ایسا ہوا کہ قلمی کتابوں کے ڈھیر میں سے ایک دو کتابیں چن لیں۔ اور بتا دیا کہ یہ اس ڈھیر سے نادر ہیں باقی مسترد کر دیں۔ اور ثابت کر دیا کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ دیکھ کر لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

یہی حالت علامہ شبلی نعمانی کی تھی۔ گویا ان دونوں بزرگوں کے ہاتھ میں آ کر کتاب خود بولنے لگتی تھی۔ کہ میں کس زمانے اور کس ملک کی ہوں۔ اور میری قدر و قیمت کیا ہے یعنی کتاب اپنے بارے میں خود شہادت دیتی ہے۔ قلمی کتابوں کے فروخت کرنے والے جب ان دونوں بزرگوں کی خدمت میں کتابیں لاتے تو ان کی غیر معمولی بصیرت دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ جب یہ بزرگ کسی کتاب کے نادر ہونے کی تصدیق کرتے تو پھر اس میں شبہ کی گنجائش نہ رہتی۔

غرض ان بزرگوں کی کون کون سی خصوصیات کا ذکر کیا جائے۔ بات میں سے بات نکلتی آتی ہے۔ مگر پھر بھی داستان تمام نہیں ہوتی۔

شب بآخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد

نواب صاحب مرحوم نے ملک و ملت اور علم کی جو خدمت طویل زمانہ تک کی اس کی تفصیل کیسے بیان ہو سکتی ہے۔ خصوصاً ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۹ء تک آپ نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری کی حیثیت سے تعلیم کے سلسلے میں مسلمانوں کی جو گوناگوں خدمات انجام دیں۔ ان کے بیان کرنے کے لئے ایک مفصل رسالہ کی ضرورت ہے۔ میں اس پر سب سے زیادہ تفصیل سے لکھنا چاہتا تھا۔ مگر نہ وقت میں گنجائش ہے نہ جمہور کے صدر یار جنگ نمبر میں اس لئے کچھ نہ لکھ سکوں گا۔

مختصر یہ ہے کہ نواب صاحب نے ۱۳ سال سے زیادہ مدت تک حسب ذیل خدمات انجام دیں۔

(۱) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں میں منعقد کرائے۔ اور ہندوستان کے مشاہیر کو ان اجلاسوں کی صدارت کے لئے آمادہ کیا۔

(۲) کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی اشاعت کے لئے ہزاروں میل کا سفر ہندوستان میں کیا اور جابجا تقریریں فرمائیں۔ اور کبھی سفر خرچ کا ایک پیسہ آپ نے کانفرنس سے نہیں لیا۔ بلکہ ہزاروں روپیہ اپنی جیب سے خرچ کیا۔ ہر سفر میں آپ کے ساتھ خدام وغیرہ ہوتے تھے اس سے سینکڑوں روپیہ خرچ ہوتا تھا۔

(۳) نواب صاحب نے اپنی تصانیف کثیر تعداد میں کانفرنس بک ڈپو کو ہدیتہً عطا فرمائیں۔ تاکہ بک ڈپو ان کو فروخت کر کے فائدہ اٹھائے۔

(۴) اس کے علاوہ نواب صاحب نے کانفرنس کے ذریعے سے ہزاروں روپیہ ابتدائی مکتب اور وظائف طلباء کے لئے دیا جس کی پوری تفصیل دفتر میں موجود ہے منشی محمد نجم الدین صاحب سابق اکاؤنٹنٹ کانفرنس نے میری فرمائش پر پرانے کاغذات کی تلاش و جستجو کر کے ایک گوشوارہ تیار کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے اپنے زمانہ سکریٹری شپ میں مکاتب اسلامیہ اور طلبہ کے وظائف کے سلسلے میں ۲۲ ہزار اٹھائیس روپیہ آٹھ آنے اپنی جیب سے عطا فرمائے۔

ان دو مدوں کے علاوہ کانفرنس کی دوسری مدوں میں جو روپیہ دیا وہ اس کے علاوہ ہے۔ جس کی تفصیل ابھی معلوم نہیں ہو سکی۔

(۵) نواب صاحب کے زمانہ سکریٹری میں حسب ذیل شہروں میں کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقد ہوئے۔

کلکتہ - سورت - خیرپور سندھ - امراؤتی برار - بمبئی - دہلی - مدراس - اجمیر شریف بنارس - رہتک - لاہور - میرٹھ - آگرہ رامپور - پٹنہ - پونا - جبل پور - اور علی گڑھ۔ ان میں سے بعض شہروں میں کئی دفعہ اجلاس ہوا۔

(۶) جن مشاہیر ملک نے کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت فرمائی ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

(۱) سر اکبر حیدری۔ (۲) سیٹھ ابراہیم ہارون جعفر۔ (۳) مولوی سر رحیم بخش (۴) آنریبل میاں فضل حسین۔ (۵) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (۶) آنریبل سر ابراہیم رحمت اللہ (۷) جسٹس سر شاہ سلیمان (۸) نواب سر عبد القیوم (۹) آنریبل سر عبد الرحیم۔ (۱۰) سر شیخ عبد القادر۔ (۱۱) نواب مسعود جنگ سر راس مسعود۔ (۱۲) سر سید رضا علی (۱۳) لفٹنٹ کرنل مقبول حسن قریشی۔ (۱۴) ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد (۱۵) ہز ہائینس سر آغا خاں۔ (۱۶) آنریبل مولوی فضل حق وزیر اعظم بنگال۔ (۱۷) نواب کمال یار جنگ بہادر (۱۸) نواب ظہیر یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ (۱۹) سر عزیز الحق۔ (۲۰) نوابزادہ لیاقت علی خاں ایم۔ اے آکسن۔

مندرجہ بالا اصحاب میں سے بعض نے ایک سے زیادہ مرتبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ ان اجلاسوں میں جہاں جہاں وہ منعقد ہوئے مشاہیر ملک اور اعلیٰ حکام نے شرکت کی۔ ہر اجلاس کے استقبالیہ کمیٹی کے صدر اور سکریٹری بھی معزز اصحاب میں سے تھے۔ جن کے اسمائے گرامی بوجہ عدم گنجائش نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ یہ نواب صاحب ہی کی شخصیت کا اثر تھا۔ کہ ملک کے مرکزی مقامات میں کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے۔ اور قوم کے بعض جلیل القدر مشاہیر نے بھی ان اجلاسوں کی صدارت فرمائی۔

مندرجہ حالات سے جو در حقیقت حالات نہیں چند اشارات ہیں ناظرین نے یہ اندازہ فرما لیا ہوگا کہ نواب صدر یار جنگ مرحوم جیسی نادرہ روزگار ہستیاں بار بار عالم وجود میں نہیں آتیں۔ وہ خاندان بڑا خوش قسمت ہے جس میں ایسے نامور لوگ پیدا ہوں۔ اب جب کہ مسلمانوں کا آفتاب اقبال مائل بہ زوال ہے۔ ایسے باوقار بزرگوں کا پیدا ہونا مشکل ہے۔

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

رنگ بقا

زندگی گردے خدا عالم بنا پیدا کروں
روز ہو ہو کر فنا رنگ بقا پیدا کروں

حاصل صد زندگانی اک متاع درد ہے
حضرت ناصح کو یہ ضد ہے دوا پیدا کروں

یاں تو اظہار تمنا دال خموشی کی ادا ہے
مدعا یہ ہے دل بے مدعا پیدا کروں

ایک ہی کا حسن ہے جلوہ نما کونین میں
دوسرا تو جب کہوں جب دوسرا پیدا کروں

سوکے دعوے سب مٹا کر دل میں کیوں رکھوں دوئی
خود نمائی ہو چکی قبلہ نما پیدا کروں

حسن رعنا خود کے جلوے میں منصور کے دلربا
کس طرح ہر روز حسرت دل نیا پیدا کروں

حسرت شروانی

بزرگوں کی زندگی کا مرقع

اسی سلسلہ میں دوسری تاریخی کتابیں جن میں اکابر اسلام اور مشاہیر علماء و مصنفین کے حالات و سوانح ہیں۔ آپ کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ اس ذوق کی بنا پر آپکی تصانیف کا اکثر حصہ آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور دوسرے اکابر اسلام کے حالات سے تعلق رکھتا ہے۔

سیرت پر آپ نے متعدد رسائل تالیف کئے ہیں، جو سب کے سب معتبر و صحیح احادیث و روایات پر مبنی ہیں۔ اس قدر معتبر کہ ایک مورخ یا مصنف اپنی کسی تصنیف میں بے تامل ان کا حوالہ دے سکتا ہے۔ یہ مفید رسالے ہندوستان کے علاوہ حیدرآباد میں بھی طبع ہوئے ہیں۔ اور سب کے سب قابل مطالعہ و استفادہ ہیں۔

سیرت پر آپ نے بہت سی معرکۃ الآرا تقریریں بھی علی گڑھ اور حیدرآباد میں فرمائیں ہیں۔ علی گڑھ کی بعض تقریریں میں نے قلمبند کرکے کانفرنس گزٹ میں شائع کیں۔ یا رسالوں کی صورت میں شائع ہوئیں۔ حیدرآباد کی تقریریں ایڈیٹر صاحب اخبار صحیفہ نے قلمبند کرکے شائع کیں۔ جو مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خانصاحب شروانی نے طبع کرائیں۔

سیرت کے علاوہ اکابر اسلام اور دوسرے مشاہیر علماء کے حالات پر بھی نواب صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ کا رسالہ علمائے سلف نہایت مشہور و معروف ہے جو کئی بار طبع ہو چکا ہے۔ یہ رسالہ جو بڑی محنت، کاوش اور ریزہ چینی کے بعد لکھا گیا ہے۔ نواب صاحب نے ندوۃ العلماء کے ایک سالانہ اجلاس میں پیش کیا تھا۔ جو علماء کے حلقہ میں بے حد مقبول ہوا۔ اس کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے قابل ہے اسی سلسلے کا ایک رسالہ نابینا علماء بھی ہے۔ ایک رسالہ میں طویل عمر علماء کے حالات لکھے ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ سیرۃ الصدیق بھی آپ کی ایک مشہور و مقبول کتاب ہے جو بار بار چھپی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ نواب صاحب کی دوسری تاریخی و ادبی تالیفات بھی ہیں۔ جن کے تذکرہ کی یہاں گنجائش نہیں۔

نواب صاحب کی تحریر کی نمایاں خصوصیت ایجاز و اختصار ہے وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب ادا کرتے تھے، اس لحاظ سے ان کی تحریریں ماقل و دل کی صحیح مصداق ہیں، اس کے علاوہ نواب صاحب کی تحریریں متانت کہ رزانت اور جزالت کا بہترین نمونہ ہیں، وہ عامیانہ و سوقیانہ طرز تحریر اور سطحیت سے بمراحل دور تھے ہر تحریر سے پختہ کاری اور معیار کی بلندی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ جس عنوان پر لکھتے اسی کے مناسب الفاظ استعمال کرتے

سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی جو تالیفات ہیں، ان میں ذات نبوی کے وقار و احترام اور زبان کی تہذیب شائستگی اور آداب کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے برخلاف اس کے ادبی مضامین کا انداز دوسرا ہے ادبی تحریروں میں ایک خاص شگفتگی و رعنائی بلکہ یک گونہ دلربائی ہے۔ کہیں کہیں طعن و طنز کا بھی ہلکا سا رنگ ہے۔ لیکن اس میں تلخی و ناخوشگواری نہیں۔ بلکہ شوخی کی جھلک ہے۔

نواب صاحب کی ہر تقریر اس پر شاہد ہے کہ قدرت نے ان کو مذاق سلیم اور صحیح ذوق ادب عطا کیا تھا۔ ان کی تحریریں حشو و زوائد سے پاک اور ادبی لطافتوں سے معمور ہوتی تھیں۔ اوائل عمر کی تحریروں میں کہیں کہیں مولانا محمد حسین آزاد کا رنگ جھلکتا ہے لیکن تاریخی تصانیف میں احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا۔ جو کچھ لکھا ذمہ داری کے احساس کے ساتھ لکھا ہے۔ پامال عنوانوں پر کبھی قلم نہیں اٹھایا۔ بلکہ ہمیشہ ایسی چیزیں لکھیں جن سے علم و فن کا معیار بلند ہو۔

حاصل کلام یہ کہ نواب صاحب مرحوم عصر حاضر کے ایک بلند پایہ نثر نگار اور صاحب طرز خاص تھے۔

نثر کے علاوہ بزم شعر و سخن میں بھی نواب صاحب کو ایک اونچی جگہ حاصل تھی۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ حسرت تخلص فرماتے تھے۔

اردو میں حضرت امیر مینائی سے تلمذ تھا اساتذہ کا کلام ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا۔ کلام ابتذال اور سوقیانہ انداز سے پاک تھا۔ اس میدان میں بھی ذوق سلیم ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ اس مختصر مضمون میں کلام پر تبصرہ ممکن نہیں ہے۔ یہ بجائے خود ایک مستقل کام ہے۔

نواب صاحب مرحوم کی وسعت معلومات کا راز جلیل القدر علماء کی صحبت اور ان کا کتاب خانہ ہے۔ جو آپ اپنی نظیر ہے۔ ایک مختصر مضمون میں کتب خانہ پر کچھ لکھنا مشکل ہے۔ کتب خانہ کے نوادر کا حال بیان کرنے کے لئے ایک اچھی خاصی کتاب اور محنت شاقہ کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ذاتی کتاب خانوں میں شاید ہی کوئی کتاب خانہ ایسا ہو جو حبیب گنج کے اس کتاب خانہ کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ میرا خیال ہے کہ اگر نواب صاحب ساری عمر میں ملک و ملت کی یا علم و فن کی کوئی خدمت نہ کرتے اور صرف یہ کتاب خانہ قائم کر دیتے تو یہ اتنا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ کہ قوم ان کے شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ کتاب خانہ نواب صاحب کا خاندانی نہیں ہے بلکہ کم و بیش ساٹھ برس کی ذاتی جد و جہد سعی و کوشش اور ذوق و شوق کا نتیجہ ہے۔ ان کو بچپن ہی کی عمر سے کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ اور وہ اس شوق پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ جیسے جیسے علمی استعداد و قابلیت بڑھتی گئی۔ اس کی مناسبت سے کتابوں کے حصول اور خریداری کا ذوق بھی بڑھتا گیا۔ نواب صاحب ایک مضمون میں جو معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوا تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ۱۸۸۳ء تک سوا سو کتابیں جمع ہو چکی تھیں ایک صندوق پلنگ کے پاس رہتا تھا۔ اس میں یہ کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان رہتا۔ اسی طرح کتابیں بڑھتی رہیں۔ جب علیحدہ کمرہ رہنے کو ملا تو والد مرحوم نے اس میں ایک الماری کتابوں کے واسطے بنوا دی۔ اسی مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔

۱۸۸۵ء میں انگریزی پڑھنے آگرہ گیا۔ وہاں قلمی کتابیں دیکھنے اور خریدنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب مختلف ضرورتوں سے دلی اور لکھنؤ جانا ہوا تو وہاں بھی قلمی کتابیں خریدی گئیں۔ کانپور میں مصر و بیروت کی کتابوں کے دو مشہور تاجر تھے۔ ان کے یہاں سے بھی خریداری کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

نواب صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا سید محمد علی صاحب اور علامہ شبلی کی تشویق سے بیرونی ممالک کی کتابیں خریدنے کا شوق ہوا۔ قدم آگے بڑھا تو بمبئی۔ مصر۔ شام اور یورپ سے کتابیں آنے لگیں۔"

جب علی گڑھ سے حیدرآباد تشریف لیگئے تو وہاں بھی کتابوں کی خریداری کا سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا۔

نواب صاحب اکتوبر ۱۹۲۱ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ میرا مختصر کتاب خانہ نصف صدی سے زیادہ کی تلاش کا سرمایہ ہے۔ الحمد للہ کہ اس میں ایک نسخہ بھی سرقہ یا ناجائز ذریعہ کا حاصل کیا ہوا نہیں ہے۔"

نواب صاحب کے کتاب خانے میں ہر علم و فن کی معتبر و معیاری کتابیں موجود ہیں زیادہ اہتمام قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا کیا گیا جو مختلف حیثیات سے نادر الوجود ہیں۔ مثلاً بعض کتابیں ایسی ہیں جو اپنے طلائی نقش و نگار اور ظاہری حسن و تزئین کے لحاظ سے قابل دید ہیں۔ یہ کتابیں ایران، ترکی، عرب کشمیر اور ہندوستان وغیرہ کی ہنرمندی و صناعی کا بہترین نمونہ ہیں۔ کچھ کتابیں ایسی ہیں جو ایشیا کے تاریخی شہرت رکھنے والے خطاطوں مثلاً میر عماد، میر علی کاتب وغیرہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ ایسی کتابیں بھی ہیں جو خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں یا مصنف کے صحیح نسخہ سے ان کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ متعدد کتابیں نویں صدی ہجری سے پہلے کی ہیں بعض کتابیں اس لحاظ سے نادر ہیں کہ وہ مدت تک کسی مشہور بادشاہ کے کتاب خانہ میں رہ چکی ہیں۔ یا کسی ملک کے فتح کرنے میں کسی بادشاہ کو حاصل ہوئی ہیں مثلاً ملا عارفی کی مثنوی "گوئے چوگان" نوشتہ میر علی کاتب جو شاہ اورنگ زیب عالمگیر کو گولکنڈہ کی فتح میں ہاتھ آئی۔

بہت سے کتابیں ایسی ہیں جو اپنے کاغذ کی قدامت، حسن کتابت اور تصاویر وغیرہ کی وجہ سے نادر ہیں۔ ایک خاصی تعداد ایسی کتابوں کی ہے جن پر ایک یا چند بادشاہوں کی شاہی مہریں اور ان کے دست و قلم کی عبارتیں یا کتاب خانے میں داخل ہونے یا خریدنے کی تاریخیں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں کبھی شاہی کتب خانہ کی زینت تھیں۔ ان میں سات کتابیں سلاطین تیموریہ کے کتب خانوں کی تھیں جو ان کی مہروں سے مزین ہیں۔ غرض کہاں تک لکھا جائے جب کوئی قدر شناس اور صاحب بصیرت کتاب خانہ میں داخل ہوتا ہے تو حیران رہجاتا ہے کہ کس کس چیز کو دیکھے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

یہ امر قابل تذکرہ ہے کہ مطبوعہ کتابوں میں بھی بہت سی کتابیں ایسی ہیں۔ جو اب نایاب ہیں، اور کہیں نہیں ملتی ہیں۔ تفسیر حدیث رجال، تصوف کلیات و دواوین اور تاریخ خصوصاً تاریخ ہند کا سرمایہ بہت زیادہ ہے میں نے اپنی ساری عمر میں تین بزرگ ایسے دیکھے ہیں جن کی واقفیت اور ناقدانہ نظر تاریخ ہند کے متعلق حیرت انگیز تھی (۱) حضرت الاستاذم علامہ شبلی نعمانی (۲) میرے مخدوم و محسن حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب ناظم ندوۃ العلماء (۳) نواب صدر یار جنگ بہادر۔

ان اصحاب کی وسعت نظر کا یہ عالم تھا کہ تاریخ کے بڑے بڑے پروفیسر اور ڈاکٹر جن کی عمر کا بڑا حصہ تاریخی ریسرچ میں گزرا ہے ان کے سامنے طفل مکتب تھے۔ مولانا سید عبدالحی صاحب نے آٹھ جلدوں میں عربی زبان میں تاریخ ہند لکھی اور دو جلدوں میں اس کا معرکۃ الآرا مقدمہ یہ ربع صدی کی جانگداز تحقیقات کا نتیجہ ہے غرض ان بزرگوں کے کمالات کا کہاں تک

علاقے خریدے۔ خاندان بھیکم پور نے کالی ندی پر ایک مضبوط پل اپنے صرفے سے بنوایا ست رفاہی روساء نے بڑے بڑے ملک کاموں میں چندے دیئے۔ علی گڑھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کے قیام میں بڑا حصہ لیا۔

اب موجودہ حکومت کے انفساخ زمینداری کی اسکیم کی وجہ سے یہ بات بھی جاتی رہے گی زراعت تو خدا سے تعلق ہے دیکھئے اسکا کیا حشر ہوتا ہے۔ البتہ اس شروانی خاندان میں ایک روایت اب تک باقی رہی مگر زمانہ کے ہاتھوں وہ بھی اب ختم ہو رہی ہے۔ یعنی اچھے گھوڑے رکھنا۔ پولو کھیلنا۔ نیزہ بازی کرنا۔ گھوڑدوڑوں میں حصہ لینا چیتوں باز جروں سے اور بڑا لشکروں سے شکار میں تفریح کرنا۔ پھر آخر میں جب لاوے آرزو ہونے لگا تو اس میں کئی ایک ہستیاں بالخصوص نواب صدر یار جنگ مرحوم ایسے اہل قلم ہوئے کہ ہندوستان بھر میں انکا ڈنکا بجا۔ چہرہ کا لشکر شروانی مدرسہ جن کے قصد سے ہو جانے پر آج تک آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں۔ بعض کی یادگار تھا۔ یہ تعلیم گاہ آئین کی بھینٹ کی شکار ہوئی۔ جس کا ذکر یہاں تکلیف دہ اور غیر ضروری ہے۔

نواب حاجی سر مزمل اللہ خاں مرحوم و مغفور کا باوجود جلال ان کے سیاسی کارنامے ان کی داد و دہش اور حکومت میں انکا دخل آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ نواب حاجی اسمٰعیل خاں شروانی زمیندار دتاولی کے علمی ادبی کارنامے اور حکیم عبد الرحمٰن کو امداد ہمیشہ یاد رہیں گے۔

نواب ابوبکر خاں مرحوم زمیندار داد وں کی نیاضی۔ غربا پروری اور اپنے عزیزوں کے ساتھ سلوک کی یاد ہمارے دلوں کو ہمیشہ بے چین کرتا رہے گی۔ نواب صدر یار جنگ مرحوم کا علمی ادبی قابلیت ریاست حیدرآباد اور مسلم یونیورسٹی کا خدمت۔ غربا پروری۔ فیاضی۔ علم نوازی ایسی ہیں جن کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ مرحوم کی تصانیف ابد ان کی یاد دلاتی رہیں گی۔ ان کے صفات اور کارنامے شمار کرانے کے واسطے ایک طویل مضمون چاہیئے۔ یہی کیا کم ہے کہ اپنے مسکن حبیب گنج میں وہ نادر اور بیش قیمت مخطوطات اور مطبوعات کا ایسا کتاب خانہ چھوڑ گئے جس کی ہندوستان سے باہر بھی شہرت ہے۔ بیرکال یہ ہے کہ ہزار ہا کتب میں سے جس کو اٹھایئے نواب صاحب مرحوم کے قلم کی کوئی نہ کوئی یادداشت اس پر موجود ہے جس سے ان کے حفظ اور علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے۔

مرحوم کی اتنی برکات ہمارے لیے ایسی تھی کہ انکا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہم بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

اے مصحفی رو دل کیا میں کہوں جیسوں کو
ان ہی کے کھیل بیٹھے لاہور کے نو شاہیں

مرحوم و مغفور کے مفصل حالات کے واسطے ایک دفتر چاہیئے۔ جس کے لئے ہما تو نا ہوگا

قلم اور کم مائیگی کافی نہیں ہے۔ راقم الحروف پر مرحوم مغفور کی بزرگانہ شفقت ایسی تھی کہ موصوف کی یاد سے دل بھر آتا ہے۔ بجز اس کے اور کیا عرض کروں۔

اے سوختہ جان ضبط نہیں نفس کن
بس کن ز حدیث عشق بس کن

محمد عباس خاں شروانی
(بی۔ اے)
ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر

نواب صدر یار جنگ کی مذہبی جفاکشی

(از مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی)

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم شروانی کی علمی شہرت کی وجہ سے میں ان کو جانتا تھا۔ ان سے میری خط و کتابت بھی رہی۔ یہ بھی شہرت تھی کہ مولانا مرحوم باوجود رئیس ہونے کے بہت بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ اور تعلیمی کاموں میں بہت بڑا حصہ لیتے ہیں۔ اجلاس میں ندوۃ العلماء کا جلسہ ہوا تو ان سے ملنے کا موقع ملا۔ ان کو بہت زیادہ خلیق اور منکسر المزاج پایا۔ ۱۹۳۶ء میں سفر حج میں مکہ معظمہ میں مولانا مرحوم سے ملاقات ہوئی اور عرفات میں بھی ان کا ساتھ رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ کہ باوجود اتنے بڑے رئیس ہونے کے ان کو مذہبی کاموں میں بہت زیادہ باعمل اور مشقت برداشت کرتے ہوئے پایا۔

حج کا زمانہ ماہ جون کا تھا۔ ۲۲ جون کو منیٰ میں وہ گرمی دھوپ میں تمام فرائض نہایت اطمینان اور سکون سے ادا کر رہے تھے۔ جب کہ تمام حاجی قربانی کے جانور دوسروں سے منگوا کر ذبح کرا رہے تھے اور گرمی کی شدت کی وجہ سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کرتے تھے مولانا مرحوم اس وقت اور اس گرمی میں خود ہی انجام دے رہے تھے۔ ان کی طبیعت میں بیحد خلوص تھا۔ اور شہرت پسندی سے ان کو نفرت تھی۔ قاری عبد الرحمٰن صاحب مرحوم الہ آبادی جو اصل میں مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے۔ اور دنیا سے بے نیاز تھے۔ ان سے مولانا شروانی مرحوم کی اتفاق سے ملاقات ہو گئی۔ مولانا موصوف نے اپنی محبت اور خلوص کی بنا پر قاری صاحب مرحوم کو مجبور کر دیا کہ حبیب گنج میں رمضان شریف میں قرآن مجید سنائیں اور جب قاری صاحب حبیب گنج تشریف لے آئے۔ تو مولانا مرحوم کے والد مرحوم نے قاری صاحب کو دیکھ کر یہ کہا کہ یہ شخص کیا قرآن مجید سنائیگا۔ جب رات کو قاری صاحب مرحوم نے قرآن مجید مسجد میں پڑھنا شروع کیا تو مولانا مرحوم کے والد نے اپنے نوکر سے کہا کہ میری کرسی مسجد کے دروازہ کے قریب لگا دو تاکہ میں سنوں کہ یہ قاری صاحب کیسا قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ جب مولانا مرحوم کے والد نے قرآن شریف سنا تو فوراً وضو کر کے نماز میں شریک ہو گئے۔ اور ان پر قرآن شریف سننے کا یہ اثر ہوا کہ پھر اس کے بعد انھوں نے تمام عمر کبھی نماز ترک نہیں کی۔

قاری عبد الرحمٰن صاحب مرحوم کے حالات

قاری عبد الرحمٰن مرحوم قاری محمد عبد اللہ صاحب مکی کے چھوٹے بھائی تھے۔ آپ نے فن قرأت پڑھنے کے بعد کانپور میں مولانا احمد حسن صاحب مرحوم سے تعلیم حاصل کی۔ قاری صاحب مرحوم اور میرے والد مولانا محمد ذکریا مرحوم ہم سبق تھے۔ آپس میں بے تکلف دوستی تھی۔ قاری صاحب مرحوم حضرت سید پیر مہر علی شاہ گولڑوی ضلع راولپنڈی کے مرید تھے۔ قاری صاحب مرحوم ہر سال اپنے شیخ کی خدمت میں گولڑے جایا کرتے تھے۔ آتے جاتے کے وقت ہم لدھیانے ضرور ٹھہرتے تھے۔ میرے دادا مرحوم سے قاری صاحب کو بہت عقیدت تھی دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ، قاری ضیاء الدین اور قاری عبد المالک یہ سب حضرات قاری عبد الرحمٰن مرحوم کے فیض یافتہ ہیں اور پنجاب اور پاکستان میں زیادہ تر قاری صاحب ہی کے شاگردوں کا فیض جاری ہے۔ آخر عمر میں قاری صاحب نے قرآن شریف الہ آباد کی ایک بے آباد مسجد میں سنانا شروع کر دیا تھا اور باہر سب جگہ ترک کر دیا تھا۔

آہ! نواب صدر یار جنگ بہادر

(ڈاکٹر وارث القادری)

کتنی آنکھیں رو رہی ہیں تر کے غم میں
پیرو احکام داور کے لئے

کتنے دل ہیں مضطرب مایوس سے
ایک "خوش خلقی" کے مصدر کے لئے

کتنے ہیں بھٹکی سی ہے جن کی حیات
ایک "جانِ لطف" رہبر کے لئے

کتنی امیدوں کے گلشن لٹ چکے
اک بہار روح پرور کے لئے

اک کریم "لطف زا" کے واسطے
اک رئیس جود پرور کے لئے

یادِ حق سے دین کے احساس سے
جو رہا غافل نہ دم بھر کے لئے

لے گیا جو نیکیوں پر نیکیاں
جمع کر کے روز محشر کے لئے

وہ کہ جس کے بعد مختص ہو گئی
بے سکونی قلب مضطر کے لئے

جس کی اک اک سانس روح ارتقا
ناز تھا جو خانداں بھر کے لئے

جگمگا دینا کوئی آساں نہیں
دل کی دنیا ماہ و اختر کے لئے

آج ہی پر منحصر کیا قادری
ہے یہ رونا زندگی بھر کے لئے

تعلق قائم کر، عہد اکبری میں آنے کے منافی نہیں
ہے۔ بہر حال ممکن ہے کہ سلیمان خاں یوسف زئی
محمد حنیف ثانی کی اولاد میں ہوں۔ مسلسل اور مفصل
شجرہ جات ہم کو نہیں مل سکے۔ موضع کناوہ کے
شروانی خاندان میں ایک بڑے درجہ کے
شروانی یوسف خاں گذرے ہیں۔ سلیمان خاں
کا نام بھی قابل غور ہے۔ اکبری عہد میں بنگال
میں کرارانیوں اور سوریوں کے ساتھ علاوہ ایک
سلیمان خاں شروانی بھی اکبری فوج سے
لڑے۔ کیا عجیب ہے کہ ان کو اکبر نے یہ خیال کر کے
جو کہ پنجاب سے نکالا ہو۔ اور ان لوگوں نے ان
اطراف میں پناہ لے کر عہد شاہ جہاں میں
بھوری بھیکم پور کا تعلقہ حاصل کیا ہو۔

نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم کے خاندان
کا جو شجرہ معلوم ہے وہ بتاتا ہے کہ اگر فی پشت
چالیس سال کا حساب لگایا جاوے تو کم و بیش
اکبری عہد میں ان کے مورثوں کا ان اطراف میں
سکونت کے واسطے آنا پایا جاتا ہے۔ پیڑھیوں
کے واسطے چالیس سال کی اوسط کچھ زیادہ
نہیں ہے۔

شاہجہانی عہد میں ہم کو تین چھوٹے درجہ کے
شروانی منصبداران کے نام تاریخ میں ملتے
ہیں۔ عہد شاہجہانی میں ایک ممتاز پٹھان جنرل
خان جہاں لودی نے بادشاہ کے خلاف سخت
بغاوت کی۔ اور ہندوستان کے ہر ضلع
سے بہت سے نامور پٹھانوں کو بلا کر اپنے
ساتھ لیا۔ ہم کو ان شروانیوں کے نام نہیں
ملتے پر دوسری بات ہے کہ چھوٹے درجہ کے
کچھ شروانی خان جہاں کے ساتھ باغی
فوج میں شریک رہے ہوں۔ … جو
کچھ … باقی رہ گئے تھے وہ
اپنے ذریعہ معاش کو … حالت
میں لگے ہوئے تھے۔ جیسا کہ آئندہ کے واقعات
سے معلوم ہوگا۔ اب اس کے بعد مخصوص خاندان
شروانی کی تاریخ پر کم و بیش پردہ پڑا ہوا ہے
اورنگ زیب کی اولاد کے زمانے میں ہندوستان
میں جو جنگ و جدال رہے اور خاندان مغلیہ کے
زوال کے زمانے میں بیرونی حملوں اور اقوام روہیلہ
مرہٹہ سکھ وغیرہ کی مدافعت میں جو بڑی بڑی
فوجیں روانہ کی گئیں ان میں شروانیان شریک
نہ تھے۔ کیونکہ وہ اب بجائے اہل سیف کے زراعت
پیشہ ہو گئے۔ اور ان کے سرداروں نے تعلقہ
حاصل کرنے اور ان میں اضافہ کرنے کا مشغلہ اپنے
واسطے نکالا۔ البتہ شروانیوں کی ایک شاخ
یعنی والیان ریاست مالیرکوٹلہ پنجاب نے ترقی شروع
کی۔ مگر انکا تعلق ہمارے صوبہ کے ان اطراف
کے شروانیوں سے نہ تھا۔ ہاں حال میں دو
شادیاں آپس میں ہونے کے بعد سلسلہ بند ہو گیا
سنہ ۱۷۵۹ء میں شاہ عالم ثانی دہلی کے تخت پر
بیٹھا۔ اس کا زمانہ شروانیوں کے واسطے
پر آشوب ثابت ہوا۔ اور ان پر بہت مصیبتیں آئیں۔

بقول شاعر ؎

ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے
سو بار بنا ہے تو سو بار جلا ہے

اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ ہمارے مرحوم
مغفور صدر یار جنگ بہادر کے مورثان اپنے
وطن بھوری بھیکم پور میں چین سے اپنے زمینداری
کے کام میں مشغول تھے۔ کہ بھرت پور کے جاٹوں
نے جنہوں نے فرخ سیر کے زمانے سے ہاتھ
پیر نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ راجہ سورج مل
جاٹ کی قیادت میں زور پکڑا۔ اور علاقہ کول کے
اس حصہ کو جس میں شروانیان کے دیہات ہیں
اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس علاقہ کے مشرقی
حصہ کے کچھ دیہات پر بنگش نواب فرخ آباد قبضہ
کر چکے تھے۔ سورج مل نے کول کے قلعہ کو جو … کے
… کے نام سے مشہور تھا ۱۷۵۷-۵۸ء
… نے اپنی چیرہ دستی سے
نواب صدر یار جنگ مرحوم مغفور کے مورثان کو بھیکم پور
سے اور ان کے برادران دتاولی کو
دتاولی سے نکالا۔ اور ان کے زرخیز دیہات پر
قبضہ جما لیا۔ مرحوم مغفور کا خاندان بھیکم پور تو
گنگا پار موضع نیتوا میں جا گیا۔ اور ان کے مورث
نے ایک … زمیندار کے یہاں … کی نوکری
کر لی۔ خاندان دتاولی نے کول کے علاقہ قریب
… ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ درانی نے سورج مل
کو ان اطراف سے نکالا۔ مگر پٹھان قوم
… چلے جانے کے بعد پھر اس طرف جاٹوں
… مرہٹوں سے
… چھوڑا۔ …
… ۱۷۷۱ء میں شاہ عالم ثانی
کے دربار میں نواب ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں
… تو شروانیوں کے مقابلہ سے
جاٹوں کو … دیا۔ اور سورج مل بھی دہلی کے
قریب مارا گیا۔ اسی زمانہ میں نواب نجف خاں
نے کول کا نام … سے بدل کر علی گڑھ
رکھا۔ اب شروانی خاندان بھیکم پور اور دتاولی
اپنے اپنے دیہات واپس آ گئے۔ مگر فلک
کج رفتار نے ان کو زیادہ دن تک چین سے
نہ بیٹھنے دیا۔

۱۷۸۲ء میں نواب نجف خاں کا ستارہ
بھی غروب ہو گیا۔ ان کے جانشین میں قابلیت
نہ تھی کہ وہ اس کام کو سنبھالتا۔ مگر مرہٹوں کے
ہاتھوں اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ بادشاہ دہلی
خود مرہٹوں کے … میں تھا۔ مادھو راؤ
سندھیا مرہٹہ نے بادشاہ اور اس کے ملحقہ
ہوئے علاقہ پر پورا تسلط جما لیا۔ بادشاہ
اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا۔ اور شروانیوں
کے علاقہ بھی مرہٹوں کے قبضے میں تھے۔ مگر
مرہٹوں نے ان کو اپنی جگہ بحال رکھا۔
البتہ مادھو راؤ سندھیا کے تسلط کے زمانہ
میں ایک نیا شگوفہ کھلا۔ یعنی اس کی فوج میں
گوسائیں بھرتی ہو گئے۔ راجہ اندر گر
انوپ گر گوسائیں ان کے سردار تھے اور
راجہ ہمت بہادر گوسائیں اندر گر کا چیلہ
تھا۔ یہ بڑا تیز طرار اور سازشی تھا۔ مادھو راؤ
سندھیا کے توسل سے اس نے دہلی کے تخت
بادشاہ کے دربار میں بڑا دخل حاصل کر لیا۔

راقم الحروف نے … سرکاری دستاویزات
(سابق امپیریل ریکارڈس) سے شاہ عالم کے
زمانے کے ایک فرمان کا ایک انگریزی ترجمہ دیکھا
جس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ نے گنگا جمنا کے
دوآبہ کا وہ حصہ جس میں ضلع بلند شہر علی گڑھ
اور کچھ حصہ ایٹہ کا شامل ہے انتظام کی غرض
سے اس گوسائیں راجہ (ہمت بہادر) کے سپرد
کر دیا۔ اور … کا علاقہ کول کے حدود تک
اسکو جاگیر میں دیدیا۔ بس اب کیا تھا اس
گوسائیں نے … مرحوم مغفور نواب صدر یار جنگ
کے خاندان اور دیگر شروانیوں پر ہاتھ صاف
کیا۔ اور ان کو شروانی دیہات سے بیدخل
کیا۔ بھیکم پور کے قریب … ایک
فوجی قلعہ بنایا۔ اور … کے گنبد میں
خزانہ رکھنے کا چور گھر تھا۔ جو باہر سے دکھائی نہ
دیتا تھا۔ خاندان بھیکم پور کے موضع کھولی اور
راقم الحروف کے … میں بھی گوسائیوں کے
… ہیں۔ بلکہ راقم الحروف کے موضع
میں تو حال ہی تک دو ایک گوسائیں خاندان
آباد تھے۔ … کہ ان
گوسائیوں کی جو فوج تھی … عادت
تھی کہ … انگیز طور سے گھومتے
پھرتے اور جو خیرات نہ دیتا تو لوٹ مار کرتے تھے
غرضکہ عجیب طوائف الملوکی تھی۔ یہ حال …
رہا۔ … ۱۷۸۹ء میں مادھو راؤ سندھیا
کی اور ہمت گر کی ان بن ہو گئی۔ اور مرہٹوں نے
اسکو قید کر دیا۔ مگر وہ کسی … نکل بھاگا …
… ۔ اب مرہٹوں نے پھر زور
پکڑا۔ اور ان اطراف کے زمیندار ان کے
دست نگر رہے۔ … انگریز
… ۱۸۰۳ء
میں … جنرل ڈی بوائن جو کول
میں تعینات تھا۔ … کا علاقہ جو
بھیکم پور اور دریائے گنگا کے درمیان واقع
ہے نواب صدر یار جنگ مرحوم کے مورث
باز خاں صاحب مرحوم کو مستاجری پر دیا
گوسائیوں نے دتاولی کے شروانی خاندان کو
… میں لے لیا۔ مگر جب دتاولی کے برہمن
زمینداران مالگذاری ادا نہ کر سکے۔ تو دتاولی
کے شروانی مورث سردار خاں مرحوم نے
مالگذاری ادا کر کے یہ موضع حاصل کر لیا۔ جو اب
تک … ان کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔
ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شروانیان
میں بخلاف زمانہ سابق کے اتنی سکت نہ تھی
کہ وہ ان چیرہ دستیوں اور مظالم کا تلوار
سے مقابلہ کرتے۔ مگر ہاں مالی حالت کچھ
سنبھل گئی تھی۔ اب زمانے نے پھر پلٹا کھایا اور
کالے رنگ والوں کے بجائے گورے رنگ
کے مالک آئے۔ جن کے ڈر سے لوگ اپنے
گھروں سے نہیں نکلتے تھے۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں انگریز
کے مشہور جنرل لارڈ لیک نے کول میں مرہٹوں
کی فوج کو ہرا کر انکا قلعہ فتح کیا۔ اور شمالی
ہندوستان کا راستہ ان کے واسطے کھل
گیا۔ ۱۸۰۵ء تک مرہٹوں کا خاتمہ کر کے انگریزوں
نے شمالی ہندوستان پر قبضہ جما لیا۔ اور جب
ان کو ذرا سکون ہوا۔ تو ان اطراف میں دیہات
کی ملکیت کی سرسری تحقیقات شروع ہوئی۔
اور شروانی خاندان بھیکم پور کے وہ دیہات
جو طوائف الملوکی کے زمانے میں ان کے قبضہ
سے نکل گئے تھے۔ ان کو واپس دلائے۔ اور
حقدار بحق رسید کا مضمون ہوا۔ اور مرحوم
مغفور نواب صدر یار جنگ بہادر کے خاندان نے
اور نیز دتاولی کے شروانی خاندان نے علی گڑھ
ایٹہ۔ بلند شہر میں اپنے اپنے علاقے
بڑھا لئے۔ … کہ وہ غیر اشخاص کی
مالگذاری باقی رہنے کی علت میں نیلام ہوئے
مگر بعض غریب شروانیوں کے کچھ دیہات اسی
علت میں نکل گئے۔ پھر کچھ لوگ ایسے نکلے کہ
سرسری بندوبست کے وقت وہ انگریز حکام
کے سامنے نہ جا سکے تھے۔

یہ تجارت پیشہ قوم تو ہندوستان سے روپیہ
کمانے آئی تھی جس نے ادائے مالگذاری کے
معاہدے … اس لئے زمینداری
پائی۔ راقم الحروف کے خاندان کے ساتھ
بھی یہ عمل ہوا کہ اس کے مورث کچھ مدت تک
اپنی … زمینداری سے بیدخل رہے اسی
زمانے میں … مرحوم مغفور نواب صاحب کے
خاندان کی … اور داد و دہش مشہور تھی۔ اگرچہ
بعض مواضعات کی حالت خراب تھی۔ … دیہاتی
کم تھے۔ اور لگان جنسی تھا۔ اور … مالگذاری
سخت تھی۔ … آر۔ ہچنسن نے اپنی کتاب
… (علی گڑھ اسٹیٹسٹکس) بابتہ سنہ
۱۸۳۲ء تا سنہ ۱۸۵۵ء میں لکھا ہے کہ
مسلمان زمینداران عیش کرتے تھے اور خرچ
زیادہ کرتے تھے۔ فضول خرچی اور بدنظمی کا
نتیجہ ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ اور بعض شروانی
خاندان … کو محتاج ہو گئے۔ مگر اس
انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ تعلقہ بھوری ناہ
کے زمینداران یعنی نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم
مغفور کے مورثان کی حالت اچھی تھی اور ان کا
انتظام اور رعایا کے ساتھ برتاؤ اچھا تھا۔ اس
خاندان کے پاس ہچنسن کے قول کے مطابق دو سو
اکسٹھ (۲۶۱) مواضعات تھے۔ جن کی مالگذاری
چالیس ہزار روپے سالانہ سے کچھ زیادہ تھی
اس طرح خاندان دتاولی اس وقت قریب
بیس ہزار روپے مالگذاری ادا کرتا تھا۔ اس
کے بعد علی گڑھ اور بلند شہر کے اضلاع میں اور

آپ کا تعارف ایک انگریز کرنل سے کرایا جو افغانستان کے مختلف معرکوں کا زخم خوردہ تھا۔ ان خونیں معرکوں میں کرنل مذکور کے کئی لڑکے اور بیشتر اقربا کام آچکے تھے۔ ان معرکوں کے تذکرہ کے سلسلے میں کرنل کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ ہم نے پٹھانوں کی تلوار بہت دیکھی ہے ان کی بہادری کی داستانیں مشہور ہیں۔ نا سمجھی اور لاف زنی کے الفاظ تیر و نشتر کا کام کر گئے۔ داؤد خاں کرسی پر کھڑے ہو گئے! اور شمشیر آبدار میان سے کھینچ کر کہنے لگے اس سے قبل پٹھانوں کی تلوار کے جوہر تو نے دیکھے ہوں یا نہ دیکھے ہوں لیکن اب دیکھ لے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کلکٹر صاحب فوراً درمیان میں آ گئے۔ اور بڑی مشکل سے غصہ فرو کیا۔ اور عذر کیا کہ جنگ کے مصائب، افراط موت اور پٹھانوں کی پیہم فرقہ بندی نے کرنل کے دماغی توازن کو خراب کر دیا ہے اس لئے قابل معافی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آپ نے چوتھی رجب ۱۲۸۰ھ کو سفر آخرت اختیار کیا۔ حسب قول عالم صاحب ساکن مارہرہ قطعہ تاریخ حسب ذیل قطعہ وفات کہا ہے

اٹھ گیا کیسا رئیس نامور
کیا کہیں افسوس ہے کیا ہے جہاں
اب مسلمانوں کا دل بے چین ہے
مضطرب ہے غم سے جان ناتواں
کس نے دیکھے ایسے اگلی الفقار
اس کا ثانی دوسرا پیدا کہاں
راہ حق میں خوب بخشا مال و زر
حاتم دوراں تھے فیاض زماں
دیکھئے کیا حال شملکین ہو ر ہیں
اس جگہ تھے دین و دولت توأماں
سال غم مقبول رضوان نے کہا
ہو گئے داؤد خاں جنت مکاں

۱ ۲ ۸ ۰ ۲

ہدایت اللہ خاں صاحب

ہدایت اللہ خاں عرف حاجی صاحب داؤد خاں صاحب کے پوتے اور خان زماں خالصاحب جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ کے فرزند اکبر تھے۔ آپ بمقام بھیکن پور ۱۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے بچپن میں ہی زمانے میں داؤد خاں صاحب خانم بہت اللہ ہو گئے تھے مثل مشہور ہے کہ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی میں نظر آ جاتے ہیں چنانچہ آغوش مادری کے اندر بھی اقبالمندی کے آثار نمایاں تھے۔ قدرت نے حسن صورت و حسن سیرت کا مکمل پیکر بنا کر بھیجا تھا۔ صحیح طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ صورت زیادہ دل آویز تھی۔ یا سیرت زیادہ دلکش تھی۔ البتہ یہ بات صاف اور یقینی ہے کہ حسن صورت و سیرت کے اس لطیف امتزاج اور بعض عجیب خداداد صلاحیتوں نے آپ کی شخصیت کو صد درجہ پر کشش اور باوقار بنا دیا تھا۔ میانہ قد کشادہ پیشانی، کمان دار ابرو، بڑی حسین اور غلافی آنکھیں جن کے اندر بلا کی قوت مقناطیسی تھی۔ وہ شخص بڑا بہادر سمجھا جاتا تھا جو آپ سے ایک مرتبہ آنکھ ملانے کی تاب لا سکتا۔ اس سلسلے میں عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ جس کو بھرپور نگاہ سے دیکھ لیتے وہ بلا اوقات لڑکھڑا کر گر جاتا۔ صرف چند نام ایسے بتائے جاتے ہیں جو پہلی نظر کی تاب لا سکتے تھے۔ بدن کی جلد اتنی شفاف تھی۔ کہ بعض اوقات سامنے سے گذرنے والے شخص کا عکس پیشانی پر پڑ جاتا تھا۔ پان کھاتے تو پیک حلق سے اترتی نظر آتی۔ تمام اعضاء نہایت متناسب تھے۔ لیکن ہاتھ نسبتاً دراز تھے۔ حالت غیظ میں سر، مونچھوں اور داڑھی کے بال کھڑے ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب بہادری کی علامات ہیں۔ زندگی بھر نہ کبھی قہقہہ لگایا اور نہ کبھی کسی بڑے سے بڑے صدمہ پر آنکھیں پرنم ہوئیں۔ زیادہ لطف و انبساط کی حالت میں آنسو زیر لب پر اکتفا فرماتے۔

اہلیہ محترمہ کا بیان ہے کہ میں نے کبھی ہنسی کی حالت میں دانت نہیں دیکھے شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ نصف شب کے قریب تمام جسم پر چادر لپیٹ کر زنان خانے میں جاتے تھے حالانکہ تیز روشنی گوارا نہ تھی۔ حکم تھا کہ حرم کے اندر پہنچنے پر روشنی گل کر دی جائے۔ آپ نے دن میں کبھی اپنی اہلیہ کی صورت نہ دیکھی تھی چنانچہ ایک مرتبہ خلاف معمول وقت میں کسی شدید ضرورت سے جانا ہوا۔ تو اہلیہ محترمہ ایک نادیدہ انسان کو آتے دیکھ کر جوتیاں چھوڑ کر بے تحاشا اندر کو بھاگیں۔

جب بعد نماز فجر تسبیح عالی مرتبت کے سلام کو جاتے۔ تو موصوفہ چادر سے ملبوس تسبیح ہاتھ میں لئے بیٹھی ہوتیں۔ یہ اہتمام کرواتے کہ چہرے کے کل حصہ چادر سے مستور ہوتا۔ بیٹے باری باری سے چادر کے اندر ہاتھ کر کے قدم چھوتے۔ جب تک بیٹھنے کا حکم نہ ہوتا کھڑے رہتے۔ اس زمانے کی معاشرت اسی طور کی تھی۔

جرأت و قوت برداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کمرہ میں حجامت بنوا رہے تھے اتفاقاً پاس رکھی ہوئی بندوق چل گئی۔ ملازمین کو اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آپ کے بھائی نواب عبدالشکور خاں صاحب جلدی سے دبے پاؤں اندر گئے۔ تو عجیب منظر دیکھا۔ کہ خانصاحب لہولہان ہیں۔ اور حجام بے ہوش پڑا ہے۔ بندوق اتفاقاً چل گئی تھی۔ چھرے آپ کے جسم میں پیوست ہو گئے تھے۔ جنہیں اپنے ہاتھ سے موصوف نے آلات حجامت کے ذریعے نکال ڈالا۔ اور پیشانی پر بل نہ آیا۔ حجام محض آواز سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

آپ انتظام ریاست اور سیاست میں بافرد تھے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ کہ صبح کی نماز حجامت سے فارغ ہو کر بہ سواری اسپ اپنی سیر یا مرغی خانہ، اور گاؤ خانہ ملاحظہ کرنے موضع عالم پور جاتے تھے، جو بھیکن پور سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ واپس آ کر والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ پھر کچہری میں تشریف لے جاتے، اور کاروبار ریاست میں منہمک ہو جاتے، شام کے وقت بھیکن پور اور قرب و جوار کی کاشت کا ملاحظہ ہوتا۔ پندرہ سال تک برسر اقتدار رہے۔ جب حج کو تشریف لے گئے تو دوران حج میں قافلہ پر ڈاکہ پڑا۔ آپ کے تمام اسباب، نقدی و زیورات کو لوٹ لیا گیا۔ بہ ہزار دقت و پریشانی دو سال کے بعد ہندوستان کو واپسی ہوئی۔ بالآخر ۱۳۰۱ھ میں وفات پائی۔ پس ماندگان میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔ صاحبزادہ محمد خاں زندگی کی پندرہ بہاریں دکھا کر بیمار ہو کر راہی عدم بن گئے ایک صاحبزادی حاجی بیگم صاحبہ کی اولاد میں اپنی کے سامنے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ دوسری صاحبزادی کی ایک صالح ترین نشانی حاجی محمد صالح خاں صاحب مرحوم کے نام نامی سے مشہور ہو کر پردۂ غیب میں مستور ہو گئی۔ دوسری یادگار میرے والد محترم محمد خاں صاحب مدفیوضہ خاندان کے سر پر سایہ فگن ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مرحوم کا قطعہ وفات صاحب عالم صاحب ساکن مارہرہ نے حسب ذیل کہا ہے۔

خان عالی ہدایت اللہ خاں
صاحب جود در جہاں مشہور
رفت ازیں جا بہ جنت الفردوس
روح پاکش بہ قرب حور و قصور
ماتم سخت در جہاں افتاد
شد بہ درد غم دل ہمہ رنجور
پا تفے سال غم بہ من بنمود
برادر د زنام پاک مغفور

خان زماں خاں صاحب

خان زماں خاں صاحب اس گھرانے کے پہلے فرد ہیں۔ جو بھیکن پور میں پیدا ہوئے جمعرات ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۲ء کو انھوں نے زندگی کی پہلی صبح دیکھی۔ اپنے باپ باز خاں جیسے جہاندیدہ، پختہ مغز باغ نظر کے زیر سایہ پرورش پائی پھر داؤد خاں جیسے شفیق و کریم بھائی کے زیر صحبت زمانہ کے نشیب و فراز کو دیکھا۔ اور زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں سے روشناس ہوئے۔ نہایت ہوشیار، حلیم، مدبر، باوقار، لطیف مزاج اور باذوق انسان تھے، داؤد خاں صاحب کے دور صدور الصدوری اور روانگی حج کے زمانہ میں غیر منقسم ریاست کا انتظام نہایت عمدگی سے کیا۔ اپنے برادر بزرگوار کے وسعت ریاست اور ان کے کارناموں میں برابر کے شریک تھے۔ فن تعمیرات طبعی انداز تھا بھیکن پور کی مسجد اور ایک ساگر یائیدار کوٹھی آپ کے فطری ذوق کی یادگاریں ہیں۔

مغل سلطنت کا آخری دور تھا۔ ایک مرتبہ قیام دہلی کے زمانے میں شاہی جلوس نکلا۔ آپ لاخانہ پر استادہ تھے۔ اتفاقاً بادشاہ کی نظر آپ سے دوچار ہوئی۔ فوراً شاہی آداب کے ساتھ کورنش بجا لائے۔ شاہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ شام کو شاہی چوبدار آیا اور حکم طلبی سنایا۔ دوسرے روز حاضر دربار ہوئے۔ مردم شناس اور قدردان بادشاہ نے فرمایا کہ:-

ہاں - ہم تو تمہارے جوہر پہلی
نظر میں تاڑ گئے تھے تحقیق سے
یہ علاقہ تم علیگڈھ کے رئیس ہو

تھوڑی دیر ہی گفتگو کے بعد ارشاد ہوا کہ قلمدان وزارت سنبھالو۔ دو دن کی مہلت ہے غور کرنے کے بعد جواب دو۔ یہ شکر و سپاس کر کے جو واپس ہوئے تو سیدھے بھیکن پور پہنچے۔ اور اپنے شفیق بھائی داؤد خاں صاحب سے رائے طلب کی۔ تو انھوں نے فرمایا کہ "اچھا تم نے کیا سوچا۔" عرض کیا کہ جناب کی موجودگی میں میرے سوچنے کا سوال کیا ہے۔ البتہ ذاتی رائے یہ ہے کہ ڈوبتے سورج کے ساتھ جو بھی اپنے مقدر کے ستارہ کو وابستہ کرے گا۔ وہ خود بھی ڈوب جائے گا۔ فرمایا - "یار زماں تم نے بہت ٹھیک سوچا۔" ادھر یہ سوال ہوا کہ جب انتظار میں کئی دن گزر گئے۔ اور بادشاہ کو پتہ چلا کہ خانصاحب چلے گئے ہیں۔ تو شتر سوار کو مراسلہ بھیجا۔ اور شکوہ کے ساتھ طلبی ہوئی۔ داؤد خاں نے قدر افزائی کا مناسب شکریہ ادا کر کے بطور معذرت لکھ بھیجا۔ کہ خان زماں کی صحت خراب ہے اسی لئے بغرض علاج دہلی جانا ہوتا ہے۔ ابتدائی الحال معاف رکھا جائے۔ صحت ہونے پر آداب شاہی بجا لائیگا۔

اس ایک واقعہ سے موصوف کی اصابت رائے اور تدبر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ایک عجیب واقعہ اور ملاحظہ ہو۔ داؤد خاں صاحب اور خان زماں خانصاحب حقیقی بھائی تھے۔ لیکن مزاجوں میں بہت اختلاف تھا۔ بڑے بھائی دہی اور اس کے لوازمات کے عاشق تھے۔ دونوں وقت دہی کا استعمال لازمی تھا حج کے سفر میں بکریاں ہمراہ تھیں۔ تاکہ تازہ دہی روزانہ تیار مل سکے۔

فرمایا کرتے تھے کہ جس دن دہی نہ ملے گا وہی دن ہماری وفات کا ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا۔

ہو گئے تھے۔ چودہری ظہور اللہ خاں اور چودہری نور اللہ خاں جن کو اپنے نانا چودہری ... خاں صاحب کا علاقہ ترکہ میں ملا۔ ان ... بعد چودہری ظہور اللہ خاں کے ورثا کو حق کیا گیا کل جائداد کے واحد مالک چودہری نور اللہ خاں صاحب ہوئے جن کے ورثا اور کچھ اور زیادہ کے اب تک اس کے مالک و قابض ہیں۔

چودہری نور اللہ خانصاحب نے بڑی شان۔ وضعداری اور ثقاہت کے ساتھ بسر کی۔ نہایت سادہ روی۔ آہستہ خرامی اور معمولات روزمرہ پر پابندی آپ کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔

انگریز حکام سے ملاقات بہت کم کرتے تھے۔ پھر بھی رعب و وقار حکام پر رہتا۔ ... اور اہل برادری پر ناقابل بیان تھا۔ ... آپ کی ضرب المثل تھی۔ سود سے آپ کو بیزاری تھی۔ ایک موقع پر آپ نے ایک امدادی بنک میں کچھ روپیہ جمع کیا۔ اور شرط لگا دی کہ سود نہ لیں گے مگر کچھ عرصہ کے بعد جب بنک ختم ہوئی تو اس کا روپیہ مع سود آپ کے پاس آیا۔ آپ نے سود کا روپیہ نہ لیا۔ بلکہ ایک ٹھیکہ دار سے طے کر دیا جس نے خشت پختہ کا خرنجہ مسجد کے پیچھے سے بازار تک بنا دیا۔ تاکہ نمازی آرام و آسانی سے مسجد آ جائیں۔ وہ خرنجہ ابھی تک نہایت اچھی حالت میں قائم ہے۔

چودہری صاحب موصوف الہ آباد نمائش سنہ ۱۹۱۰ء میں موسیقی کے شنکار دل۔ ملازمین و ہمراہین کے ایک اسپیشل ریل گاڑی سے تشریف لے گئے تھے۔ وہاں پر آپ کے اور آپ کے ہمراہیان کے واسطے ایک خاص کیمپ آراستہ کیا گیا تھا۔ جہاں رسد اور سامان آسائش منجانب حکومت مہیا کیا گیا تھا۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں جب کہ دہلی دربار موقعہ تاجپوشی جارج پنجم منعقد ہونے والا تھا۔ اور آپ اس میں بحیثیت درباری مدعو تھے۔ اور جانے کا اہتمام فرما رہے تھے۔ کہ ایک مختصر علالت کے بعد اس جہان فانی سے سفر آخرت فرما گئے۔

پسماندگان میں اپنے تین بیٹے چھوڑے جن میں تعلقہ سہاور تقسیم ہوا۔ سب سے بڑے چودہری عزیز اللہ خاں صاحب تھے۔ جنہوں نے اپنے بزرگوار کی شان و شوکت کی یادگار میں قائم رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ حکام سرکار سے بہت عمدہ روابط بے تکلفی رکھتے تھے۔ اپنے پدر کی طرح تہواروں سے ستشنی تھے۔ آنریری مجسٹریٹ و منصف تھے۔ جو چودہری نور اللہ خاں صاحب اپنے واسطے کبھی پسند نہ فرماتے تھے۔ اگرچہ کلکٹر صاحبان بار بار پیش کرتے رہتے۔ تاہم وہ رونق اور چہل پہل جو کہ چودہری صاحب کے زمانہ میں تھی وہ چودہری عزیز اللہ خاں صاحب کے زمانہ میں نہیں رہی۔ اور ان کی وفات سنہ ... کے بعد

چودہری عبد الحمید خاں صاحب عرف منجھلے میاں جب جانشین ہوئے۔ تو انھوں نے اپنے مقدور بھر شان ریاست قائم رکھنے کی پوری کوشش کی زیادہ جائداد کے منافع سے جائداد کو ترقی دی پکی جائداد کو توسیع دی۔ اور شہری جائداد خرید نی عمارات کا آپ کو بڑا شوق تھا۔ بہت سی عمارات خود بنوائیں۔ اور دو سروں کو اراضیات دے کر لگوائے۔ چاہات پختہ تعمیر کرائے اور اشجار ثمر دار خود نصب کرائے۔

وقت انتقال سنہ ۱۹۳۶ء میں آپ کا انتزاع جمعہ تھا جس کے متعلق آپ نے خاص وصیت فرمائی۔ موصوف اپنے خاندان میں سب سے زیادہ ذی ہوش۔ قابل اور منتظم تھے بسن بلوغ ہی سے آپ نے جائداد کے نظم و نسق میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ جب آپ اپنے والد کے غیر معمولی اخراجات کی وجہ سے مقروض ہو گئے اور علاقہ کے تلف ہونے کے آثار نمایاں ہوئے تو آپ نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے اور علاقہ کے خرچ اور قرضہ کے صحیح حسابات مرتب کرا کے حکام کو مداخلت ... کرنے پر آمادہ کیا۔ اور خود انھا کے سربراہ کار ہو گئے۔ اور اپنی خوش نظمی اور تدبر سے چند ہی سال میں قرضہ ادا کر کے علاقہ واگذاشت کرا لیا۔

ایک زمانہ میں آپ بڑے اشتہ باز اور قادر انداز تھے۔ اور شکار کا شوق اپنے ساتھی شیخ اللہ خانصاحب رئیس دہوسنہ کی معیت میں اور بھی دوبالا ہو گیا تھا۔ چند سال ایک انگریز صاحب سے محض اسی شوق کے پورا کرنے کے لئے خرید لئے گئے تھے۔ جن گڑھی جنداں مخصوص طور پر شکارگاہ ہونے کے علاوہ لب ساحل ندی واقع ہے۔ موقع نہایت پر فضا ہے۔ اور جاچند کے بنگلے بلندی پر بڑا خوشنما منظر پیش کرتے ہیں۔ وہ بعد کو شیخ اللہ خاں کے نام ہی منتقل کر دیا گیا۔ اور ان کی مرت اور ... سنہ ۱۹۱۵ء کو شکار ہی میں گڑھی جنداں میں واقع ہوئی۔ منجھلے میاں پر خود اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور آپ نے شکار ... شوق کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔

بے موقعہ نہ ہوگا اگر میں ایک اور موقعہ کا تذکرہ کر دوں۔ جب کہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی بھی شکار پر مدعو تھے۔ اور ہرن کا شکار ہو رہا تھا اور تیر شیر کا جانور ایسا ہو رہا تھا کہ گری میں سے یکایک ایک نیلا اٹھا۔ اور وہ نواب صاحب موصوف کے اس قدر پاس سے گذرا کہ آپ کے شدید دھکا لگا۔ اور آپ گر گئے۔ منجھلے میاں موصوف نے نہایت چابکدستی سے ... اس وقت بندوق میں تھا۔ ایسے ... جسم پر مار کر وہ

وہیں دو زانو ہو گیا۔ اور سہاور لا کر اس کی نمائش کی گئی۔ ایسے موقع پر جب کہ اعزائے خاص مدعو ہوتے تھے۔ منجھلے میاں مرحوم کا دسترخوان بڑا وسیع ہوتا تھا۔ اور انواع اقسام کے لذیذ کھانوں کے علاوہ اگر آموں کی فصل ہوتی تھی۔ تو جس کثرت اور محبت سے وہ کھلائے جاتے تھے وہ انھیں کا دل جانتا ہوگا۔ جو شریک ہوتے تھے۔ مہمانوں کے علاوہ سہاور کے عزیز و قریب بھی ایسی دعوتوں میں فرد فرد ... ہو جاتے تھے۔

مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی سے چودہری عبد الحمید خانصاحب کو بڑی خصوصیت تھی۔ اپنی تصنیف "... الآخرة" کے آخر میں ایک ... عبد الحمید الی الحبیب لکھا ہے جس سے ان کے تعلقات خاص کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ بڑے علم دوست اور دیندار تھے۔ اپنا علاقہ وقف کیا۔ اور علوم دینی کی ترویج اور مسجد کی مرمت و تعمیر و شکست و ریخت کے لئے رقوم معین زائیں۔ اعزائے خاص کے لئے وظائف مقرر کئے۔ منجھلے میاں مرحوم کو اپنے عزیزوں کی تکلیف اور تفضل ... سے بڑا دکھ ہوتا تھا۔ ... حقیقت کو کسی صورت سے تلف ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

جب ان کے چھوٹے بھائی چودہری محمد شفیع خاں صاحب کا علاقہ مقروض ہو گیا۔ تو آپ نے ان کا قرضہ ادا کر کے اپنی زندگی میں ہی پاک صاف کر دیا۔ اپنی حیات کے آخری زمانہ میں خاص ہدایات کے ماتحت آپ نے اپنا مقبرہ اپنی کوٹھی نور باغ میں تیار کرایا۔ رمضان المبارک کی ... تاریخ کو حبیب منزل علی گڑھ میں آپ نے وفات پائی۔ اور سہاور میں مدفون ہوئے۔ مقبرہ سنگ سفید کا بنا ہوا ہے قابل دید ہے۔ ایک خوبصورت مسجد اس کے ملحق بنائی گئی ہے۔ سڑک سوروں سہاور پر واقع ہے۔

موجودہ مالک و رئیس قصبہ سہاور چودہری محمد شفیع خاں صاحب صورت اور سیرت میں اپنے برادر ... مرحوم اور پدر مغفور سے زیادہ مشابہ ہیں۔ اور ان کی جائداد کا دو تہائی آپ کو وراثتاً پہونچا ہے۔ سادگی قدامت پسندی۔ اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ہے تکبر اور تصنع ان میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ چودہری صاحب فی زمانہ بڑی غنیمت ہستی ہیں آئندہ کوئی یاد رکھنے والا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ صبح سے ... تک ... کا بازار گرم رہتا ہے۔ لوگ دھوکہ دے کر ہزاروں روپیہ لے جاتے ہیں۔ جس کی کبھی ادائیگی نہیں ہوتی۔ اور نہ آپ اس قسم کی چارہ جوئی کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ غریب اور چھوٹے اعزا احباب کا دربار

دن بھر رہتا ہے ... کے ... اور پینے کے چرچے رہتے ہیں۔ موسم کی چیزیں آم خربوزے وغیرہ بڑی محبت سے کھلائے ہیں۔ اور تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اور مخصوص طور پر رمضان شریف کے روزہ داروں کے افطار کا منظر برابر ایک ماہ تک قابل دید ہوتا ہے۔ جس میں سبھی بے روزہ دار بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ بقول شیخ سعدی علیہ الرحمۃ

ادیم زمین سفرۂ عام اوست
برایں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

اور یہ نہیں کہ جو سوچ جائے اس کے واسطے سب کچھ ہے۔ نہ جو نہ ہو سکے اس کو بھی نوازا جاتا ہے۔ اور بلایا جاتا ہے۔ اور یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے

پھر کون بلاتا ہے اور کون بلاتا ہے
ہے ساقی کے دم تک ہی یہ شوخئ مے نوشی

... کے اولاد نرینہ میں کوئی نہیں ہے صرف اناث یعنی دو لڑکیاں ہیں۔ ایک حاجی مولوی عبید الرحمن خاں صاحب شروانی ایم۔ ایل۔ اے۔ خلف اوسط نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حاجی ڈاکٹر حبیب الرحمن خاں صاحب مرحوم کی زوجیت میں ہیں۔ اور دوسری چودہری انوار اللہ خاں صاحب عرف اقبال میاں مرحوم خلف اصغر چودہری عزیز اللہ خاں صاحب مرحوم کو منسوب تھیں جن کا انتقال بعارضہ قلب مرحوم ... سنہ ۱۹۵۰ء کو ہوا۔ اور آنریری ... اپنی بیوہ اور برادر بزرگ چودہری احمد اللہ خاں کو وارث چھوڑا۔

کسی کا کندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

چودہری احمد اللہ خاں صاحب انگریزی تعلیم یافتہ علیگ ہیں۔ اور فرسٹ کلاس اسپیشل مجسٹریٹ ایک عرصہ تک رہ چکے ہیں لیکن بے لوثی۔ ایمانداری اور قابلیت کے ساتھ تجاویز لکھنے میں ضلع کے اندر آپ ہی اپنی مثال تھے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر آپ کے حقیقی ماموں تھے۔ اور ان کی بھی دختر نیک اختر آپ کے عقد میں ہیں۔ آپ کے دو صاحبزادے چودہری ممتاز علی خاں بی۔ اے۔ اور چودہری محمد اللہ خاں ہیں۔

سوا ان کے علاوہ آپ کے تین صاحبزادے اور ہیں جن میں سے بڑے مسٹر غلام جیلانی خاں عرف اعجاز میاں رئیس موہن پور۔ خلف الرشید حاجی مولوی محمد جان خاں صاحب رئیس دادوں کو منسوب ہیں۔ دوسرے چودہری مقبول اللہ خانصاحب۔ چودہری کفایت علی خاں صاحب

عہ نواب صدر یار جنگ مرحوم نے موصوف کے انتقال پر ایک مضمون لکھا تھا۔ جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ مورخہ یکم دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔

قطعات تاریخ وفات

نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم مغفور!

...ہے صدر یار جنگ بہادر کا انتقال — حسرت فزا مصائب دنیائے زشت میں
...ہے ان کی موت اصل میں علم و ادب کی موت — کیا کیجئے لکھا تھا یہی سرنوشت میں
...صبح و شام تھا انھیں جود و کرم سے کام — سچ پوچھئے تو جود و کرم تھا سرشت میں
...لی ادھر تو جان اُدھر بول اٹھا سروش — ہیں آج میہمان وہ قصر بہشت میں

۵۴ ۳ ۲ ۴ ۱ ۵۴

۱۳۶۹ھ

(مولانا) ضیا احمد ایم اے بدایونی

مایۂ ناز نعمت!

...نس پژمردہ، پژمردہ سی ہے جان حزیں — اب بہارآئی تو بھی کیف و طرب دل میں نہیں!
...خوشی میری طرف نظریں اٹھاتی ہی نہیں — اور اٹھاتی بھی ہے سہواً تو بچشم خشمگیں
...ناز اپنی جو تھی ایک نعمت چھن گئی! — کوئی تسکین دل مضطر کی صورت ہی نہیں
...طرف میں دیکھتا ہوں ایک سناٹا سا ہے — چل بسے افسوس قصر زہد و عرفاں کے مکیں!
...رت جود و سخاوت منبع فیض و عطا — پیکر علم و صفا اک صاحب ایمان و دیں!
...یل حق رسی ہے اجنبی ہوتے ہوئے — انکی رحلت کا مرے دل میں بھی غم ہے جاگزیں
...یا دنیائے دل میں یک پیدا انتشار — کیسے کیسے ظلم ڈھا دیتا ہے چرخ چنبریں

قطعۂ تاریخ وارث لکھ بچشم اشکبار

مرد مفلح صدر یار جنگ ہیں زیر زمیں

۱۳۶۹ھ

(ڈاکٹر) وارث القادری

تاریخ الوصال

۱۳۶۹ھ

...ت بگذشت از جہاں نواب شروانی کہ بود — فاضل دوراں، حبیب حق، کریم ابن کریم
...یار بخشش چو کردم آمد آواز سروش — راغب محزوں بگو قدفاز باً فوزاً العظیم

۱۳۶۹ھ

...نہ فخر اماثل آہ نواب حبیب — زیبائش بزم کمال و نازش اہل صفا
...ز انزوا زفنا چوں بست رخت ارتحال — بزم نشاط علمی ناگاہ شد بزم عزا
...تجوئے سال رحلت سر فرو انداختہ — آمد براغب صفوۂ تاریخ از فکر رسا

اکنوں بہجرش سے بے سرو پا شد ز تقدیر اجل

علم و عمل، ورع و صفا، فضل و شرف، فیض و عطا

۳۰ ۴۰ ۲۰۰ ۸۰ ۹۰۰ ۲۰۰ ۱۰ ۹

۱۳۶۹ھ

ہر سو کر شدہ مجروح غم و درد فراق — آہ از دار فنا رفت حبیب الرحمٰن
ملہم غیب پئے مرگ براغب فرمود — وا ہجر خلد بریں گشت حبیب الرحمٰن

۵۰ ۶ ۱۹

(حکیم سید نور الامین حسن راغب چپاری اسسٹنٹ)

یادگار سلف

ہزار افسوس چل بسے ہیں حبیب رحمٰن نبی کے نائب
وہ جن سے روشن تھی شمع ایمان وہ جن سے محکم ہوا تھا ایقان

وہ یادگار سلف تھے بیشک وہ تھے قدامت کی اک نشانی،
رہ شریعت کے چلنے والے رسول اکرم پہ جان قربان

وہ کیسی پاکیزہ ان کی مجلس شریک مجلس وہ کیسے کیسے
کبھی احادیث کا بیاں تھا کبھی زباں پہ تھی شرح قرآں

وہ پاکباز وہ محبت وہ سر سے پا تک ہزار نعمت
کرم وہ انکا وہ ان کی الفت وہ انکی شفقت وہ انکا احساں

یہ ہے کرامت، تھی ذات واحد میں جمع درویشی و امارت!
کہ ہم نے آنکھوں سے اپنی دیکھا لباس شاہی میں فقر پنہاں

خدا بھی راضی، رسول بھی خوش، ہے قابل رشک ان کی قسمت
ادھر وہ محبوب اہل دنیا، اُدھر بھی وہ ہیں حبیب یزداں

ہے فکر تاریخ مجھکو ایسی کہ ہو جو شایان شان انکی
تو لکھ دے اعجاز۔ دردو عالم بلند رتبہ حبیب رحمٰں

۱۳۶۹ھ

(صاحبزادہ) غلام جیلانی خاں اعجاز شروانی بی اے بیگ،

نواب مولانا محمد حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی

۵۰ ۱۹ ۶

ہوگیا یہ آہ کیسا انقلاب — چھپ گیا علم و ادب کا آفتاب
اب کسی جانب نظر آتا نہیں — چرخ ملت کا درخشاں ماہتاب
پاک طینت صاحب علم و عمل — زہد و تقویٰ میں نہ رکھتے تھے جواب
تھے صدیق محترم آزاد کے — اور رفیق شبلیٔ عالی جناب
سال رحلت کی تھی از بس کہ فکر — تھا یہاں ساوعت میں غرق اضطراب
سر اٹھا کر بول اٹھا ہاتف ثمر — لو وہ جنت کو چلے غفراں مآب

۱۳۷۴ - ۱
۱۳۶۹ھ

(محمد عمر خاں ثمر)

چودھری امیر احمد خاں صاحب مرحوم دادا ئے چودہری محمد علی خاں صاحب شہید سے سلسلہ زمینداری تربیا تر ہیں۔ بقیہ حالات خاندان کو جیسا کہ میں اوپر بھی عرض کر چکا ہوں سانحہ شہید ہو گیا۔

مجھ کو زبانی معلومات میں چودہری سمیع اللہ خاں صاحب اور حاجی روح اللہ خاں صاحب سے بھی کچھ مدد ملی ہے۔ اول الذکر اپنی یادداشت میں سہاورتیں اپنا نمبر نہیں رکھتے۔ بڑے کامدہاری ہیں۔ خشت پختہ کے کارخانوں کی بنیاد آپ ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ کاشت باغبانی اور تجارتی تجربات میں آپ اپنی مثال آپ ہی ہیں۔ عمر آپ کی اب ماشاءاللہ ۹۰ سال ہے بصارت میں فرق آگیا ہے۔ مگر دماغی کیفیت بالکل نارمل ہے۔

بے جا نہ ہوگا اگر میں اسی سلسلہ میں مستورات کا بھی سرسری طور پر ذکر کردوں۔ اس خاندان کی خواتین اور لڑکیاں نظراتاً بڑی قدامت پسند ہیں۔ اگرچہ اسکولوں اور مدرسوں میں باضابطہ تعلیم نہیں حاصل کرتیں۔ مگر گھر پر تعلیم قرآن خوانی کتب مسائل دینی پڑھائی جاتی ہے۔ معمولی لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ احمد خانہ داری پر زور دیا جاتا ہے اور پردہ پر بہت سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ قرآن حفظ بھی کرائے جاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ انہیں کسی قسم کی موجودہ دور کی آزادی نہیں ہے۔ جیسا کہ آزاد شوہری ان کو آزاد نہ کر دیں۔

شادی بیاہ کے متعلق کنواری لڑکیوں سے مشورہ نہیں کیا جاتا۔ اگرچہ کسی کسی طالبہ سے ان کے علم میں فرور لایا جاتا ہے بیوائیں اپنے عقد ثانی کی مختار ہوتی ہیں جب وہ کرنا چاہیں تو ان پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ عام طور پر لڑکیوں کی شادی کم سنی میں نہیں کی جاتی۔ کم و بیش ۲۰ سال تک کی ہو جاتی ہیں۔ لڑکوں کی ... سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

ذاتی تاثرات

(بقیہ صفحہ ۵۲)

قرآن کے مقابلہ میں کم نہیں عبارت اور ذخیرہ حسنِ کلام کا سبب ہے۔ وہ قابل صد فخر ہے ... بہرحال میری رائے میں مسٹر خلیل ... ادب سبھی نثر بھر کی کوئی اعلیٰ خوبی اور ... اور تعریف لیس کی۔ اس طرح یہ کہنا ... ہستی ... پڑھتے کا ... کے لائق ہے حق نہیں رکھتی ہے۔ ... خود اس کے قدر دانوں نے ... میں ... زیادہ ہیں۔ ... مستجد تملایا اور جگمگایا اور بس یہی

پوری تعریف مسٹر خلیل کی ہے۔ رات کو جگنو جگمگایا، تملایا۔ تھوڑی دیر میں شعلۂ مستعجلہ کے مانند گل اور خاموش، پھر تاریکی اور اندھیرا۔ اقتباس کے ذرا لمبے ٹکڑے سے مرحوم کی ادبیت، ذوق نظر، ذہنیت اور خاص روشنی پڑتی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کی ذہنیت کے حق میں وہ ایک ستون مستحکم تھے۔ اور ملت کے سامنے ان کی تحریریں اردو میں ادب صالح کا ایک کامل ترین نمونہ تھیں اب ایسی جامع شخصیت ڈھونڈھنے سے بھی کہاں نظر آئے گی۔ ؟

کل من علیہا فان سینکڑوں بار کی طرح ایک بار پھر پڑھ کر دل تھام لیجئے۔

دو صد سالہ تاریخ بھیکم پور

(بقیہ صفحہ ۳۹)

میرز فرمادیا۔ ایک طرف با اقتدار اور صاحب حشمت رئیس تھے روپیہ پیسے کی کوئی حقیقت ان کی نگاہ میں نہ تھی۔ تو دوسری طرف یہ سادگی اور قناعت تھی کہ اکثر پیوند لگے ہوئے کپڑے استعمال میں رہتے

تھے۔ ایک طرف سرسید بانی مسلم یونیورسٹی کے عقائد سے شدید اختلاف تھا اور دوسری طرف سرسید سے مخلصانہ تعلقات تھے۔ اور انگریزی درسگاہ کے قیام کے حامی تھے ہزاروں روپے امداد میں دیئے۔ آپ کے پانچ صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں بڑے صاحبزادے عبدالصمد خاں صاحب کی اولاد میں اب صرف میرے والد محمد عمر خاں صاحب بقید حیات ہیں۔ جنہیں آہنی جسم اور فولادی قلب اپنے دادا سے ورثہ میں ملا تھا۔ مگر اب بہتر سال کی عمر اور حوادث روزگار نے صحت کو خستہ اور قویٰ کو مضمحل کر دیا ہے۔

راقم الحروف موصوف کی تنہا یادگار ہے اور میرا اکلوتا بیٹا محمد ظل المنصور سلمہ تادم تحریر اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ قادر مطلق اسے شاد و آباد رکھے۔ اور اسلاف کی اعلیٰ خصوصیات ارزانی فرمائے۔ تاکہ اس کے نام سے خاندان کا نام روشن ہو۔ آمین۔ اپنی بابت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ من آنم کہ من دانم

حدیثِ دوست

(حسرت شروانی مرحوم)

زچشم مست تو مستم شراب راچہ کنم	نوتاب حسن تو سوزم کباب راچہ کنم
حدیث دوست بگوشم رسد زپردہ دل	حکایت نی و صورت رباب راچہ کنم
نکردہ جلوہ بت شوخ و باختم دل و دیں	اگر برافگند از رخ نقاب راچہ کنم
شمیم لطف بجانم در رود زمنزل دوست	ہوائے گلشن و بوئے گلاب راچہ کنم
تو آنم اشکہ بہ بیخودی بیالایم	سیاہ مستی عہد شباب راچہ کنم
یقیں بوعدہ و دانم کہ ہست فردائے	ہجوم آرزوئے بیحساب راچہ کنم
من وخیال رخ بینیازم از گلشن	من وجمال مہے آفتاب راچہ کنم

توال بسینہ نہاں داشت راز او حسرت
لب فسردہ وچشم پر آب راچہ کنم

تبت کتابیں

(بقیہ صفحہ ۴۱)

۲۔ عیون الاجوبہ فی فنون الاسولہ

(از علامہ قشیری)

ولادت۔ ماہ ربیع الاول ۳۷۶ھ وفات ۱۶ ربیع الآخر ۴۶۵ھ علوم تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، ادب، تصوف، خطاطی وغیرہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ استاذ ابو اسحٰق اسفرائنی کے درس میں چند روز حاضر رہے۔ استاد نے اپنے دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ لڑکا درس میں تو آتا ہے مگر اس کے متعلق کچھ یادداشت نہیں رکھتا ان سے کہا کہ یہ علم خالی سننے سے نہیں آتا اس کو یادداشت کے طریقہ پر لکھ لینا بھی ضروری ہے علامہ نے ان ایام میں جتنا ان سے سنا تھا مسلسل دہرا دیا۔ استاد کو اس پر بے حد تعجب ہوا۔ اور ان کے مرتبہ کو سمجھ کر ان کا اکرام کرنے لگے۔ اور ان سے فرمایا کہ تمہیں درس میں آنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ تم کو میری تصانیف کا مطالعہ ہی کافی ہے۔

فن تصوف میں ان کا پایہ بہت بلند ہے شریعت اور حقیقت کو متحد کرنے میں پہلا مرتبہ انہی کا ہے۔ ان کی تصانیف کے متعدد نسخے کتب خانہ حبیب گنج میں موجود ہیں۔ جن میں سے ایک رسالہ عیون الاجوبہ فی فنون الاسولہ اس اعتبار سے بے حد قابل عظمت ہے کہ اس کے ۱۲ ورق خود مصنف کے قلم مبارک کے نوشتہ ہیں۔ باقی اوراق ان کے کسی شاگرد کے ہاتھ کے ہیں۔ حقیقت میں یہ رسالہ اس وجہ کا ہے کہ اس کی طباعت فوٹو کے ذریعہ سے کرائی جائے تاکہ مصنف کا تحریری نمونہ بھی قائم رہ سکے۔

۳۔ مختصر الہدایہ

تصنیف شاہ اہل اللہ الدہلوی متوفی ۱۱۶۱ھ یہ نسخہ مصنف کے شاگرد شیخ صفی اللہ نے مصنف کی حیات میں لکھا ہے۔ خاتمہ کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"قد فرغت من تسوید ہذہ النسخۃ المیمونۃ المسمی بمختصر الہدایہ من تصانیف افضل العلماء والاذکیاء صاحب المقامات الکبریٰ حضرتی و مخدومی شاہ اہل اللہ دام اللہ برکاتہ الخ"

جابجا حاشیہ پر زیادات ہیں۔ جن میں بعض کاتب کے قلم کے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ اصل مصنف کی تحریر ہے۔ ... سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مسودہ سے یہ نقل کرائی ہے۔ پھر اس میں جابجا اضافے کرائے ہیں۔ اور کہیں کہیں خود اپنے قلم سے ایزادی کی ہے۔ اس لئے کہ دوسرا شخص بطور حاشیہ کے تو لکھ سکتا ہے۔ اصل مضمون میں اضافہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ (مولانا محی الدین احمل گنگوہی)

نوحۂ غم

(اختر زندانی)

کیا چشم آسماں سے بھی برسا ہے آج غم　　ہے سرزمین ہند جو شرمندۂ الم!
شام و سحر بھی دیکھتے ہیں آج کچھ اداس　　شب آئی ہے پہن کے ابھی ماتمی لباس
غم میں یہ کس کے اہل چمن بھی ہیں بیقرار　　نرگس کہ وہ بھی فرط الم سے ہے اشکبار
دنیا سے اٹھ گیا ہے جو اک رہنمائے قوم　　ماتم کرے زمانہ کہ تھا وہ فدائے قوم
پہونچا ہے آسماں پہ قیامت کا دل کو رنج　　ماتم کدہ ہے آج زمین حبیب گنج
پائیں گے اب کہاں تجھے اے صدر یار جنگ　　وہ مستند اصول وہ مخصوص ایک رنگ
بدلی نہ وضع تو نے نہ بدلا ترا مذاق　　رحلت تری حبیب مکرم ہے دل کو شاق
کس شان سے کیا ہے عدم کے لئے سفر　　حوریں کھڑی تھیں سب در جنت پہ منتظر!
وہ علم وہ عمل وہ ترا زہد و ارتقا　　سمجھا نہ زندگی میں تجھے کوئی با خدا
شبلی کا تھا ندیم صدیق ابو الکلام　　پاتے تھے فیض تجھ سے حقیقت میں خاص و عام
علماء کی انجمن میں کچھ افسردگی سی ہے　　تیرے بغیر بزم ادبا میں کمی سی ہے
یاد آئے گا بہت ہمیں لطف و کرم ترا　　بھولیں گے عمر بھر نہ کبھی یہ الم ترا
وہ لطف وہ کرم وہ عنایات اب کہاں　　تاریک ہے نظر میں یہ رنگینیٔ جہاں
یہ سانحہ بھی گردش دوراں عجب ہوا　　سچ ہے کہ آج ختم خرد و ادب ہوا

اختر خموش ہاں اسے منظور تھا یہی!
ہونا ہی تھا بس یہی مرضی خدا کی تھی!

نواب صدر یار جنگ

(خلیل الرحمن سالک علی گڑھی)

رہ گیا باقی جہان علم میں کیا خاک رنگ　　اٹھ گئے دنیا سے جب نواب صدر یار جنگ
متقی، و منطقی و فلسفی و کان علم　　اک مفسر اک محدث اک فقیہ بیدرنگ
نکتہ سنج و نکتہ دان و نکتہ پرور نکتہ گو　　بحر بے پایان علم و دین میں مثل نہنگ
شاہد حسن سخن دیوان ہیں مرحوم کے　　شاعروں کا جن کے آگے قافیہ رہتا تھا تنگ
اک نئے مضمون کی ہر بار چھپتی تھی کتاب　　یاد تھے تصنیف و تاریخ و ادب کے لاکھ ڈھنگ
لطف محفل لطف نغمہ لطف انداز کلام　　آپ کا حسن تکلم تھا کہ گویا جل ترنگ

سالک راہ شریعت واقف اسرار حق!
رہنمائے منزل دیں رہبر راہ فرنگ

تاریخ وفات بشر سنین حیات لسنہ عیسوی

از مولانا محمد معین الدین (افضل گڑھی)

ا وحد بجذ افیر اربعو ثمانین　　(پورے پورا اسی میں یکتا رہے)
۱۹۵۰ء

حزم فقیہا ستا وثمانین
۱۳۶۹ھ　　(چھیاسی سالہ محکم فقیہ)

ماتم حبیب شبلی!

(از جناب یحییٰ اعظمی)

محو آرام ہوئے جا کے قریب شبلی　　آہ رخصت ہوئے دنیا سے حبیب شبلی
دانش افروز کہن، یار ادیب شبلی　　ہر نوا جن کی تھی پیغام نقیب شبلی
قدر دان ادب و فلسفۂ نعمانی!
سرپرست ہنر کہنہ و نوشروانی

آج ماتم تھا انھیں سے شرف دانش و دیں　　آہ تھے بزم "معارف" کے وہی صدر نشیں
شکل دیکھو تو سراپا یہ قدم نور یقیں　　جن سے اس دور میں تازہ تھے سلف کے آئیں
ہو گیا ختم وہ دور رخ رنگیں افسوس
تیرہ و تار ہوئی محفل و دشیں افسوس

کس کو توفیق نے بخشا تھا وہ گلریز قلم　　کس کو قدرت نے دیا تھا وہ دل آویز قلم
گہر افشاں گہر آرا، گہر انگیز قلم　　نظم و نثر و ادب و فن بہم آمیز قلم
جس کے ہر نقش میں رنگینی، رعنائی تھی!
جس کے ہر حرف میں حسن و دل آرائی تھی

آج سنسان ہوا میکدۂ دانش و فن　　اٹھ گیا بزم سے جو ساقی صہبائے کہن
ہو گیا نذر خزاں حکمت عرفاں کا چمن　　وقف ماتم ہے جہان ادب و شعر و سخن
دیکھئے جن و بشر یک غم و ماتم ہیں سبھی
مجلس علم بھی "دانش کدۂ قومی" بھی

آہ تنہا نہیں یہ حکمت و فن کا ماتم　　آہ تنہا نہیں یہ شعر و سخن کا ماتم
ہے حقیقت میں یہ تہذیب کہن کا ماتم　　سچ جو پوچھو تو ہے اک گنج زمن کا ماتم
غم ہے وہ حکمت و اسرار کا عارف نہ رہا
غم ہے سردفتر ارباب "معارف" نہ رہا

اب کہاں ملتے ہیں اس وضع کے ارباب کمال　　اب کہاں دولت و تقویٰ کی یہ پاکیزہ مثال
قدر والا تھا کہ سرتا بقدم سرو جلال　　جس میں تھا صورت معنی کا دل آویز جمال
مظہر علم و ہنر پیکر زیبائے ادب
جس کی ہر فکر و نظر سرخوش صہبائے ادب

اک امیر اور حقائق کے یہ اسرار و نکات　　اک رئیس اور معارف کے یہ پاکیزہ صفات
کس نے پائی ہے یہ رخشندہ و تابندہ حیات　　ورنہ اک ذات گرامی کی نہیں ہے یہ وفات
کارواں حکمت و دانش کا رواں ہوتا ہے
قافلہ فضل کا آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے

دور تابندۂ تحقیق کی رحلت یہ ہے　　ثانی شبلی مرحوم کی رخصت یہ ہے
دفن سرتا بقدم اسرار کی دولت یہ ہے　　علم کے گنج گراں مایہ کی تربت یہ ہے
اے خدا تو اسے اب نور سے کر دے معمور
اس پہ ہوتا رہے دائم تری رحمت کا ظہور

ابا جی

مسٹر محمد عبدالصبور خاں شروانی بی اے علیگ مقیم پور نے اپنی خاندانی عظمت کی آخری یادگار ہی کے انتقال پر جو نظم ارسال فرمائی ہے اس سے موصوف کے جذبات کی پوری ترجمانی ہوتی ہے۔ مرحوم سے آپکا رشتہ جدی ہے کے علاوہ طالبانہ عقیدت اور ارادت بھی تھی۔

الوداع اے ذات اقدس الفراق اے جان پاک
عظمت اسلاف کو کرنا پڑا پیوند خاک

رخصت اے بحر العلوم، اے علم پرور، علم دوست
وقف تھی بہر ادب جبان خریں و گوشت پوست

یادگار عہد ماضی پیکر حسن و عمل!
علم نے تیرے کئے کتنے مسئلے آہ حل!

چشم بینا، دل منور، اور تو روشن ضمیر
تو فقیروں میں فقیر اور تو امیروں میں امیر

تیری ہستی ایک مشعل تھی ہمارے واسطے!!
روشنی میں جس کی طے کرتے رہے ہم راستے

ابر رحمت بن کے تو سایہ فگن ہم پہ رہا
تیرے ہی صدقے میں ہمدوش ثریا میں ہوا

دادا لیا لٹ گئی دولت مرے اجداد کی
گردش گردوں نے یہ نعمت بھی یوں برباد کی

علم و دانش سطوت و عظمت ہوئے رخصت تمام
وائے مجبوری، رہے باقی آرزوئے تشنہ کام

کارواں چلتا رہا اور کارواں جاتا رہا
گلستاں موجود لطف گلستاں جاتا رہا

اے گرامی قدر حسرت اے متاع علم و دیں
عقل وافر، چشم ظاہر، دل نشیں، روشن جبیں

رونق بزم جہاں بھی میرے گھر کی آبرو
دیدۂ افلاک کو تیری رہے گی جستجو!

وائے حسرت حضرت عالی ہنر جاتے رہے
رونق بزم جہاں صاحب نظر جاتے رہے

[illegible] آج وہ ایوان رفعت گر گیا
مٹ گئی بنیاد خلافت کاخ حشمت گر گیا

۱۳۶۹ھ

عارف خستہ کو یارب پیروِ اسلاف کر
اور حسرت کی لحد پر بارش الطاف کر

(عبدالصبور [illegible] شروانی)

حبیب واحد آگاہ

۱۹۵۰ء

حضرت آفتاب نواب صدر یار جنگ بہادر — ۱۳۶۹ء
جناب مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی — ۱۹۵۰ء

آفتاب عطار بیں اعظم حبیب گنج

۱۹۶۵۰

آفتاب علمیت نواب صدر یار جنگ
عاشق محبوب حق تھے اور رحمن کے حبیب

سوئے عقبیٰ آہ! اس دار فنا سے چل بسے
زیب بزم معرفت اللہ کے پیارے ہوئے

ہو گئی بے کیف ہائے! آج بزم دینیات
خاندانی اور شروانی آفتاب مٹ گیا

حیف سے میخانہ اشرف کے بادہ کش چلے
ہو گئے پسماندگان کے پست سارے حوصلے

مصرع تاریخ رحلت یہ تمنا نے لکھا!
خلد میں داخل نواب مرد زیرک ہو گئے

۱۳۶۹ھ — ۱۹۵۰ء

(منظور علی تمنا فاروقی بجنوری)

رباعیات

اے عالم علوی کے بسانے والے
فردوس کو مستقر بنانے والے
اب آپ ہیں طالب فیض عقبیٰ
دنیا میں جو تھے فیض اٹھانے والے

حرم پاک کے زائر تھے حبیب الرحمن
دین کے عامل و آمر تھے حبیب الرحمن
نعمتیں حق نے سبھی طرح کی بخشی تھیں انہیں
نامور ناظم و ناشر تھے حبیب الرحمن

تہذیب سے شایان مراتب کہنا
جیسا بھی جو ہو حاضر و غائب کہنا
اے حسرتی نادر الکلامی یہ نہیں
خاقانی ہند ہے مناسب کہنا

دلوں میں نہ وہ ارمان حبیب الرحمن
بزم احباب ہے ویران حبیب الرحمن
نوحہ غم ہے ہر ایک تار رباب ہستی
تلخ ہے عیش کا سامان حبیب الرحمن

رحمان کے حبیب ہیں حبیب الرحمن
رحمت سے قریب ہیں حبیب الرحمن
دارین میں نعماء الٰہی حاصل
کیا اچھے نصیب ہیں حبیب الرحمن

تھے کیسے خوش اخلاق حبیب الرحمن
اس وصف میں تھے طاق حبیب الرحمن
علم و عمل و زہد و ریاضت میں شریف
تھے شہرۂ آفاق حبیب الرحمن

خلد ابدی اور برکات ابدی!
عیش ابدی اور حیات ابدی
سب مل گئیں نعمتیں حبیب الرحمن
آغوش نبی کا اور ثبات ابدی۔

۱۳۶۹ھ

(حکیم) شریف الزماں شریف

حبیب خاصان خدا
۱۳۶۹ھ
بنعم فضل حبیب رحمن
۱۳۶۹ھ

آغوش نبی
۱۳۶۹ھ
افضل الزماں حبیب الرحمن
۱۳۶۹ھ

[illegible]

آہ! مولانا شروانی

(از جناب مولانا سید سلیمان ندوی)

اگست کی کوئی آخری تاریخ تھی۔ کہ لاہور کے کسی اخبار میں سرسری طور سے یہ خبر چھپی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہوگیا۔ خبر پڑھ کر دل دھک سے ہوگیا۔ اور اپنی دوری، مہجوری اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا۔ میں نے مرحوم کی زندگی ہی میں ان کے واقعات اور خاندان شروانی کے بعض احوال لکھوا کر دار المصنفین میں رکھ لئے تھے۔ اب جب ان کا سانحہ پیش آیا تو تقدیر کی مجبوری دیکھئے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی۔

مرحوم نے چھیاسی سال کی عمر میں تاریخ ۱۱ اگست سنہ ۱۹۵۰ء اس دنیائے رنگ و بو کو خیرباد کہا۔ اور سلف صالحین سے جا ملے۔

مرحوم سے میرے تعلقات اس قدر گوناگوں تھے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کو کہاں سے شروع کیا جائے۔ اور کیا کہا جائے۔ اور کیا چھوڑا جائے۔

میں نے موصوف کو سب سے پہلے سنہ ۱۹۰۱ء میں نصف صدی پہلے ندوہ کے اجلاس ندوہ میں دیکھا تھا۔ عہد شباب، مردانہ حسن و جمال، سفید رنگت، سیاہ خوبصورت داڑھی، اور سر پر زلفیں، بلند و بالا قامت لطیف و قیمتی لباس۔ جلسہ کے ہر اجلاس میں نیا جوڑا، زیب بدن۔ کبھی سر پر عمامہ کبھی گول ٹوپی۔ کبھی ترکی ٹوپی۔ جدھر نکل جاتے آنکھیں اٹھ جاتیں۔ انگلیاں اشارہ کرتیں، لوگ ایک دوسرے کو دکھاتے اور بتاتے۔ اسی طرح میں نے دیکھا۔ اور بتایا گیا کہ یہ علی گڑھ کے ایک رئیس عالم ہیں۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں جب میں ندوہ آیا تو مدرسہ ان کے ذکر جمیل سے پر شور تھا۔ انتظامی جلسہ سال میں چند بار ہوتے اور وہ ان میں جب آتے تو جلسہ کی اہمیت بڑھ جاتی۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں جب الندوہ نکلا اور وہ اس کے ایڈیٹر ہوئے اور میرے ایک دو مضمون اس میں نکلے تو تعارف بڑھا اور جب وہ آتے تو میں حاضر ہوتا۔ اور وہ اپنے بزرگانہ لطف و نوازش سے نوازتے سنہ ۱۹۰۷ء میں جب میری جماعت کی دستار بندی کا جلسہ ہوا اور خاکسار کی عربی تقریر نے حاضرین سے داد تحسین حاصل کی۔ اور حضرۃ الاستاد نے خوش ہو کر اپنے سر سے دستار اتار کر میرے سر پر رکھی تو اس جلسہ میں مولانا شروانی شریک نہ تھے۔ تاہم حضرۃ الاستاد نے خود اپنے قلم سے لکھ کر ان کو اس واقعہ کی بڑی مسرت سے خبر دی (یہ خط مکاتیب شبلی میں درج ہے) استاد کی یہ وساطت مولانا شروانی سے تقریب کا نیا ذریعہ ہی۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں جب مکاتیب شبلی کی تدوین کا خیال آیا تو استاد نے پھر مولانا شروانی سے تقریب کی۔ کہ ان کے پاس شبلی کے جو خطوط ہوں وہ سید سلیمان کو دے دئے جائیں سنہ ۱۹۱۲ء میں جب ندوہ میں حضرۃ استاد کے حسب ایما انگریزی پورا [illegible] کے انساب تاریخ کی غلطیوں کی تصحیح کا کام میرے سپرد ہوا تو پھر تازہ تقریب کی گئی۔

نومبر سنہ ۱۹۱۴ء میں جب حضرۃ استاد بیمار ہوئے اور حالت مایوسی کو پہونچی تو خاکسار حاضر خدمت تھا۔ سب نے پہلے میں نے اس شدت تعلق کی بنا پر جو ان دونوں دوستوں میں تھا۔ اس مضمون کا ایک مختصر کارڈ ان کو بھیجا۔ افسوس کہ الفاروق کا مصنف اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں ہے۔ ۱۸ر نومبر کو مولانا نے وفات پائی۔ اس کی اطلاع دی۔ اس کے بعد سے جو ان سے مکاتبات کا سلسلہ شروع ہوا تو آج سے دو برس پہلے تک اس وقت تک برابر قائم رہا۔ جب تک ان کی قوت حافظہ اور عام قوت جسمانی کام دیتی رہی۔ آج سے دو سال پہلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کی میٹنگ میں سب سے آخری دفعہ ان سے ملا۔ میں نے دیکھا کہ ان کا تیر سا قد نیم کمان بن چکا ہے۔ وہ چہرہ جو گلاب سا تر و تازہ اور شاداب رہتا تھا۔ پژمردہ اور مرجھایا ہوا تھا اسی وقت دل نے کہا۔ کہ یہ چراغ سحری بجھا ہی چاہتا ہے۔

میرا عمر بھر یہ دستور رہا کہ حضرۃ استاد کے مخصوص احباب اور دوستوں سے فروگذاشت کا تعلق رکھوں اور ہمیشہ ان کے سامنے اپنے کو چھوٹا سمجھوں۔ چنانچہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ میری طرف سے خوردانہ اور ان کی طرف سے بزرگانہ تعلق قائم رہا۔ میں انھیں مخدوم لکھتا وہ عزیز لکھتے۔ دار المصنفین کی تاسیس میں مرحوم کی بزرگانہ حمایت ہمیشہ پشت پناہی رہی۔ دار المصنفین کے پہلے صدر نشین مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عماد الملک اور تیسرے مولانا شروانی ہوئے۔ اس تعلق سے بھی ان سے خط و کتابت کا سلسلہ اکثر رہا کیا۔ ایک دفعہ جب احباب اور بزرگوں کے محفوظ خطوط گنے تو سب سے زیادہ جن کے خطوط میرے پاس نکلے وہ انہی کے تھے میں نے جب انھیں اس کی اطلاع دی تو اس پر مسرت ظاہر فرمائی۔ اور لکھا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے اس کا الٹا ہوتا تو تعجب ہوتا

وہ قدیم و جدید تعلیم کا بہترین مجموعہ تھے ابتدائی عربی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ عربی کی اونچی کتابیں حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے درس میں پڑھیں۔ انگریزی تعلیم میٹرک تک آگرہ اسکول آگرہ میں پائی۔ ان کی جوانی تک علم و فن اور دین و تقویٰ کے باکمال اکابر موجود تھے۔ وہ ہر ایک کے در تک پہونچے۔ [illegible] ہر ایک سے حسب استعداد کسب فیض کیا۔ شیخ حسین یمنی عرب [illegible] سے سند حدیث حاصل کی۔ قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی سے فیض پایا۔ بیعت قطب الوقت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی سے کی تھی۔ مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کی زیارت سے بھی فیض یاب تھے۔

ان کا سب سے پہلا مضمون جس نے لوگوں سے خراج تحسین حاصل کیا وہ بابر پر ہے۔ جو رسالہ حسن حیدرآباد میں چھپا تھا۔ اور حسن یوسف کو ایک اشرفی انعام ملا تھا۔ مولانا شبلی کی المامون پر ان کا تبصرہ ان کا پہلا تنقیدی کارنامہ ہے جو غالباً سنہ ۱۸۹۶ء میں شوق قدوائی کے اخبار آزاد میں چھپا تھا۔ ان کے رسائل میں دو بہترین تاریخی رسائل ہیں۔ یہ دونوں ندوہ کے سالانہ جلسوں میں پڑھے گئے تھے۔ پہلے کا نام علمائے سلف ہے۔ اور دوسرے کا نام نابینا علماء یہ دونوں انیسویں صدی کی یادگار ہیں۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں لاہور سے جب مخزن نکلا تو اس کی محفل میں بھی یہ شریک تھے حضرت خسرو کے غزلیات پر اس میں ان کا ایک مضمون چھپا تھا۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں الندوہ کے شریک ایڈیٹر ہوئے۔ تو اتفاق پر ان کے مضامین نکلے

علی گڑھ کی مجلسوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات سیرۃ الصدیق لکھ کر پیش کی۔ حیدرآباد کی میلاد کی مجلسوں کے وہ بانی تھے۔ ان میں سیرۃ پر مختلف رسائل لکھے جو چھپے اور پھیلے۔ معارف میں ان کے مضامین اور ان کا غزلیں اکثر زینت اوراق ہیں شعر و شاعری کا ذوق ان کو آغاز سے تھا حسرت تخلص کرتے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں میں مشق سخن کرتے تھے۔ اور پہلے حضرت امیر مینائی سے اصلاح اور فارسی میں مولانا شبلی سے مشورہ کرتے تھے۔ فارسی کے مشہور شاعر حضرت خواجہ عزیز سے بھی مولانا شبلی کے ذریعہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ان کے اخلاق و فضائل میں وضعداری بڑی نمایاں تھی۔ جس سے جیسا ملتے تھے تمام عمر اسی طرح ملتے رہے۔ جب لکھنؤ آتے تو منشی احتشام صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرتے تھے۔ اور تمام عمر میں کبھی اس وضعداری میں فرق نہیں آیا۔ پھر اہل علم میں جن جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا دستور تھا۔ اسی طرح وہ جا کر ملتے اور اتنی دیر بیٹھتے لکھنؤ میں فرنگی محل اور وہاں بھی مولانا محمد نعیم صاحب کی نشست گاہ میں ضرور حاضر ہوتے

ان کی جوانی تھی کہ ندوہ کا غلغلہ بلند ہوا۔ وہ مجلس تھی جس کی روحانی اور علمی صدارت جن دو بزرگوں سے متبرک تھی یعنی مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی۔ اور حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب دونوں ہی سے ان کو قلبی تعلق تھا۔ اس لئے وہ ندوہ کے ان اولیٰ ارکان میں تھے جن سے ندوہ کی مجلس عبارت تھی۔ وہ سب سے پہلے سنہ ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے اجلاس ناگپور کے صدر ہوئے۔ اور یہیں سی وقت روایت آصفیہ مرحوم کی صدارت امور مذہبی کی خبر عام ہوئی۔ جس کے بعد ان کا بارہ تیرہ برس کے قریب حیدرآباد میں قیام رہا۔ اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور دینیات کے افتتاح میں ان کی مساعی مشکور ہیں۔ حیدرآباد کا خان ہاں کے مقیم احباب سنائیں گے۔

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی وہ دو دفعہ ندوہ کے اجلاس کے صدر ہوئے۔ پہلی دفعہ امرتسر میں اور یاد آتا ہے کہ دوسری دفعہ لکھنؤ میں۔ مرحوم کی قومی اداروں میں سے علی گڑھ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دار المصنفین اعظم گڑھ سے خصوصیت کا تعلق تھا۔ مولانا شبلی مرحوم کے بعد غالباً سنہ ۱۹۱۵ء میں وہ انجمن ترقی اردو کے بھی ناظم ہوئے اور دو تین سال کے قریب خدمت کے بعد قرعۂ فال مولوی عبد الحق صاحب کے نام نکلا۔ ان اداروں کے علاوہ دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے بزرگوں سے بھی ارتباط رکھتے تھے۔ اور ان درسگاہوں کی بھی امداد فرمایا کرتے تھے۔

عجیب اتفاق ہے کہ ناوالنستہ سنہ ۱۹۲۶ء میں سفر حج میں بھی میرا ان کا ساتھ ہوا۔ یہ موتمر اسلامی والا موقع تھا۔ یہاں یہ سخت بیمار پڑ گئے۔ مگر بڑی ہمت کے ساتھ سارے ارکان ادا کئے۔ مدینہ منورہ کے قیام کے زمانے میں میں نے ان کا تعارف شیخ محمد ابراہیم خربوطی مدیر کتب خانہ شیخ الاسلام سے کرا دیا۔ یہ

نذرِ تبریک

به پیشگاهِ عمِ محترم نواب صدر یار جنگ بهادر مولانا حبیب الرحمن خان شروانی

(اقبال احمد سہیل عظمی)

(به موقع ورود مرحوم به دار المصنفین اعظم گڑھ)

قتیلِ ناوکِ عشقِ تو ام نمی دانی
که چاره سازی دردم تو نیز نتوانی

قضا که نظمِ دو عالم بدستِ قدرتِ اوست
بکشورِ هنرش داده است سلطانی

هما ز هر بنِ مو شورِ العطش خیزد
هزار خمکده و صلم ار بنوشانی

حمامِ سدره نیارد که بال بکشاید
به وادئی که کند همتش پرافشانی

به حیرت اشک برپزم ز جلوه بگریزم
منم چو قطرهٔ شبنم تو مهرِ تابانی،

مداد خانهٔ او را به صورت و معنی،
نشان دهند به ظلمات و آبِ حیوانی

میانهٔ من و تو ربطِ خاک و خورشید است
ز تو گریزم و گرد خودم، بگردانی

فروغِ دیدهٔ جانش ز جوهرِ اول
یکے ز مرتبهٔ دانش معلمِ ثانی

فرازِ مرتبهٔ عشق نیک می دانم
ز هرزه ها که سرودم خورم پشیمانی

حریفِ بزمِ کمالش هذیل و فارابی
گدائے خوانِ نوالش جریر و خاقانی

چه مهر و ماه که بامِ بلندِ همتِ ماست
هزار پایه فزون ترز کاخِ کیوانی

روایتے ز کتابش صحیفهٔ رازی
حکایتے ز خطابش کمالِ سحبانی

زمانه دامن بختم به موجِ نکهتِ دوخت
که هست مایهٔ آسایشم پریشانی

به نامه آئینه دارِ جلالِ فاروقی
به خامه شانه کشِ اجتهادِ نعمانی

من از متاعِ دو عالم غمِ تو برچیدم
گذاشتم به ملک لذتِ تن آسانی

چو سیرتِ نبوی برنگاشت خامهٔ او
فراگرفته جهان را بجلوه سامانی

خرابِ تلخیِ زهرابهٔ غمم کردست
فلک که داشت بمن چشمِ لطفِ پنهانی

ز بهرِ کسبِ سعادت برآستانهٔ او
نسیمِ روضهٔ رضوان کند مگس رانی

بنوش مشربِ من پے برد گر آبِ بقا
ز شرمِ او عرقش برچکد ز پیشانی

اگر جمالِ کمالش نقاب بردارد
ز مهر و ماه ستاند خراجِ رخشانی

ز خاکِ مرقدِ او ذره ذره بیفشارند
جهان شود همه ز آبِ حیات طوفانی

چو مجدم سحر خاور رسد به مرقدِ او
هزار سجده فرو بارد ش ز پیشانی

دو صد بهشتِ معانی به سینه پنهان است
مرا بدیده بنجد بهشت، رضوانی

کنون که عالمِ نور است از رخش روشن
به عاکفانِ حریمش سزد سلیمانی

فلک بدامنش آورد و ماه و انجم ساخت
غبارها که برانگیختم به جولانی

درین چمن که نویدِ بهار آمده است
رسیده است نسیمے ز فیضِ روحانی

به سینه کاوئ خود صد گهر برون فکنم،
وزان یکے لفزو نشم به لعلِ رمانی

به بختِ خویش بنازد بنا و دانش گاه
که سایه بر سرش افگند شبلیِ ثانی

چه گنجها که زیان کردم و هنوز مرا
ز فیضِ طبع بود دعوی بدخشانی

حریفِ بزمِ کهن هم صفیرِ نعمانی
جنابِ صدرِ شریعت حبیبِ شروانی

زکوٰة خامه بدر کردم و فلک میخواست
که قسمتش بسپارم به ابرِ نیسانی

جمالِ صورت و معنے فروغِ دانش و دین
که داغِ سجده همی تابدش به پیشانی

زبسکه کردهم شاهدانِ معنے را
هزار ره شکند رنگ بر رخِ مانی

چکد ز نسخهٔ کلکش شرابِ مینائی
سزد به نغمهٔ نقش خطابِ حسانی

مشامِ خلوتیانِ فلک شود شاداب
چو من ز خامه فشانم رحیقِ ریحانی

چو دیده بر رخش افتد ز دل ندا آید
فرشته ایست مگر در لباسِ انسانی

شرابِ خمکدهٔ پارس از بهم جوشد
اگرچه من نه صفاهانیم نه کاشانی

زبسکه خامهٔ تو جان دمد به قالبِ فن
زمانه نامِ شهادت مسیحِ دورانی

زبسکه خردهٔ جان می تراود از قلم
نویدِ زندگی نو دهم به قاآنی

به القای تو نازد شعارِ اسلامی
به اعتقادِ تو خندد بهارِ ایمانی

گمانِ خویش ستائی بمن همه گر بود
مدیحِ من همه راجع به ذاتِ نعمانی

غلامِ شبلیم و ننگ همتم باشد
به مدحِ اهلِ دول خامه را سبکرانی

گرت شگرفی نقشے در آورد به شگفت
رسد بخامهٔ نقاش آفرین خوانی

مرا تو یوسفِ گم گشته ام به یاد آری
اگر ثنائے تو گویم به آن تو شایانی

زمین جرعهٔ فیضانِ شبلی ست که من
به قطرهٔ بنویسم براتِ عمانی

بجاست نغمهٔ طبعم ز مرقدِ شبلی
چو آمدی سرِ بالین بفاتحه خوانی

ز فیضِ تربیتش این سهیل شد سینا
دگرنه تا سرِ نقدم به هیچ نستانی

تو عمِ معنویم هستی و بذاتِ تو باد
ترانه سنجی کلکِ سهیل ارزانی

تعلق چونکہ علمی اور روحانی دونوں تھا اس لئے بڑا سازگار رہا۔ آخر وقت تک قائم رہا۔ حرمین محترمین کی خدمت بھی سالانہ کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب دو سال ہوئے میں نے اپنے ارادہ حج کی اطلاع ان کو دی تو لکھا کہ اس دفعہ حرمین شریفین کی خدمت کی رقم آپ ہی کے ذریعہ جائے گی۔ مگر روانگی کے وقت نہ ان کو یاد رہا اور نہ میں نے یاد دلایا۔

ان کو نادر اور قلمی کتابوں کا بڑا شوق تھا۔ اور اس شوق کی تاریخ خود انھوں نے لکھ کر معارف میں چھپوائی ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کے ذریعہ سے اور ان کی پسند سے کتابیں خریدا کرتے۔ لکھنؤ میں عبدالحسین اور وہ احمد حسین قلمی کتابوں کے تاجر تھے۔ لکھنؤ آتے تو ان کے نوادر دیکھتے اور چھانٹ کر لے جاتے۔ یوں بھی کتابیں ان کے پاس پہنچتی رہتی تھیں۔ حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی بہت سی کتابیں حاصل کیں۔ میں جب ۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ سے واپس آیا تو عزیزوں اور بزرگوں کے لئے جو تحفے لایا مرحوم کے لئے تحقیق کے بیش قیمت خطا طوں کی وصلیوں کی عکسی تصاویر کا مجموعہ لا کر پیش کیا۔

پہلے تو اصل وطن علی گڑھ میں بھیکم پور میں تھا۔ اور بعد کو بھیکم پور سے کچھ دور اپنے نام سے حبیب گنج کے نام ایک گاؤں آباد کیا تھا۔ اور وہیں زنانہ اور مردانہ مکانات مسجد اور ایک کتاب خانہ کی عمارت بنائی تھی۔ زمینداری کے شغل کے بعد بھی کتب خانہ ان کی دلچسپی کا مرکز تھا۔

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد ہاتھ میں ایک بڑی سی لکڑی لے کر باغ میں سیر کو نکل جاتے۔ اس وقت ان کے دو سہ ہاتھ میں تسبیح ہوتی۔ لکھنؤ آتے تو صبح کو پیدل مشتی احتشام علی کی کوٹھی واقع خیالی گنج سے مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی کوٹھی پر دو گز رود یک پیدل جاتے۔ واپسی سواری پر ہوتی۔ دارالمصنفین آتے تو احاطہ کے اندر گردنے کے باہر روش پر ٹہلا کرتے۔

ایک دفعہ دارالمصنفین کا جلسہ انتظامیہ رمضان المبارک میں مقرر کیا۔ ہم نے عذر کرنا چاہا۔ تو جواب میں لکھا کہ کیا رمضان مسلمانوں کے کام میں مانع ہے۔ غرض تشریف لائے اس زمانے میں وہ چائے کے بجائے اونٹنیا پیتے تھے۔ میں کافی اور مسعود علی صاحب پیتے تھے۔ اور بعد کی ملاقاتوں میں اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔

دارالمصنفین کی مسجد مرحوم ہی کی کوشش سے نواب مزمل اللہ خاں مرحوم کی امداد سے مولوی مسعود علی کی نگرانی اور انجینئرنگ میں بنی پھر دارالعلوم ندوہ کی مسجد بھی برادرم موصوف ہی کی نگرانی اور انجینئرنگ میں بنی۔ مرحوم دونوں کو دیکھ کر برادر موصوف کے تعمیری ذوق کو بہت پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ جس سال علی گڑھ میں حبیب منزل بنوانے لگے۔ تو مولوی صاحب موصوف کو بلوا کر ان سے مشورہ کیا۔ انھوں نے جو مشورہ دیا اس میں سے سامنے کی رو کار عمارت سے فرماتے تھے کہ اگر یہ حصہ نہ بنتا۔ تو یہ عمارت کچھ نہ ہوتی۔

مرحوم کے اخلاق کی دو خصوصیتیں عجیب تھیں۔ ایک یہ کہ جس شخص سے جس جہت سے ان کو تعلق ہوتا وہ اس سے اسی جہت سے ملتے۔ اور اسی کے متعلق باتیں کرتے اس کی دوسری جہتوں سے ان کو کوئی تعلق نہ ہوتا۔ حکیم اجمل خاں مرحوم سے گہرے تعلقات تھے۔ مگر یہ تعلق قدیم قلمی خطوطات اور قدیم تہذیب و شرافت کے اذکار سے تھی۔ ان دونوں کی ملاقاتوں میں یہی تذکرے رہتے۔ کہیں بیچ میں سیاست کا نام بھی نہیں آتا۔

مولانا ابوالکلام سے بھی مولانا شبلی کے واسطہ سے ان کے تعلقات تھے۔ ان کی ملاقات اور مکاتبت بھی جو چھپ چکی ہے سیاست کے تذکرہ سے خالی ہے۔ میری زندگی مختلف دور تذکرے میں رہی جب یہ سیاست بھی مست۔ مگر کبھی کسی خط میں انھوں نے اس کے متعلق کچھ لکھا۔ اور نہ کبھی انھوں نے پوچھا۔

ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ ان کی مجلس میں کبھی کسی کی برائی یا غیبت نہیں ہوتی۔ کوئی کرتا بھی تو ٹال دیتے۔ خطوط میں بھی یہی احتیاط تھی۔ اگر ناگزیر طور سے کچھ ذکر آتا۔ تو اس طرح اشارہ کرتے کہ غیر اس کے سمجھنے سے قاصر رہتے۔

مرحوم کو بھی اور تاریخی یادگاروں کا شوق تھا۔ بعض بادشاہوں کے فرامین تلواریں یا خنجر ان کے پاس تھے۔ میں جب ۱۹۳۳ء میں کابل کے سفر سے واپس آیا۔ اس کے بعد مرحوم دارالمصنفین آئے تو قالینوں کا تذکرہ نکلا۔ میں نے عرض کیا کہ نادر شاہ شاہ کابل نے مجھے ایک قالین عنایت کیا ہے۔ ان کو دکھایا تو اس کو پسند کیا۔

ملا صاحب سے جو ان کے رفیق خاص تھے اور ہمیشہ سفر میں ساتھ رہتے تھے۔ فرمایا ملا جی یہ تو ہمارے کام کا مال ہے۔ ساتھ باندھ لو۔ چنانچہ وہ قالین ان کے نذر کر دیا۔ کہ شاہان بتا ہاں تی دہند، فقیروں کے یہاں اس کا کیا کام "البتہ شاہ" کی دی ہوئی تسبیح سنہ شاہ مقصود کی فقیر کے پاس ہے۔

مرحوم بزرگوں کے قصے لطیفے، حالات اور حکایتیں اس قدر ذوق و شوق و لطف سے مجلس میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ کہ اس وقت وہ بلبل ہزار داستان معلوم ہوتے تھے ان کی تقریروں کا بھی یہی رنگ تھا آواز گولپت تھی۔ مگر تقریر مسلسل اور تاریخی واقعات کے حوالوں سے پر تاثیر ہوتی تھی۔ ان کی انشا پردازی کا بھی ایک خاص رنگ تھا۔ نہایت ستھرا اور پاکیزہ، تکلف سے بری تصنع سے خالی اور دور سے پاک بزرگوں کے تذکرے اور باتیں کرتے تھے۔ زبان فطرتاً نہایت ادب شناس عنایت ہوئی تھی۔ لہجہ میں تختی اور آواز میں کرختگی مطلق نہ تھی۔ گرم سے گرم موقعوں پر بھی وہ حدود سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے۔

لطائف پر وہ اخلاق میں بڑے نرم اور مرنج مرنجان تھے۔ مگر جب کسی وقت کسی چیز پر اڑ جاتے تو پھر اس سے نہ ٹلتے تھے۔ چنانچہ حیدرآباد سے علیحدگی کا سبب یہی پیش آیا اس پر ایک شعر انھوں نے کہا۔ جو مجھے لکھ بھیجا تھا۔

شاہبازِ ہمتم ر لطفِ بدمرت شاہ ذات
دست دیگر ترک کردہ در ہوا پرواز کرد

یہ بھی ان کی سیرت کا قابل ذکر واقعہ ہے کہ باوجود ایک رئیس ابن رئیس ہونے کے اور حکام وقت سے اچھے تعلقات رکھنے کے سرکاری اعزاز و احترام اور خطاب و القاب سے بچتے تھے۔

ایک دفعہ ان کو شمس العلماء کا خطاب ملنے والا تھا۔ ان کو خبر ہوئی تو پوری کوشش کی کہ اس خطاب سے ان کو بری رکھا جائے۔ فرماتے تھے کہ حیدرآباد کا خطاب اس لئے قبول کیا کہ یہ ایک دولت اسلامیہ کی نشانی تھی۔

مرحوم کو دولت اسلامیہ سے بڑی نسبت تھی۔ اس کے اچھے واقعات اور مسرت بخش تذکروں سے خوش ہوتے۔ اور اس کے نفاق و اختلاف کی باتوں سے ہمیشہ کبیدہ کش رہتے۔ ندوہ کے باہمی اختلاف کے زمانہ میں باوجود اس کے کہ طرفین دوست تھے۔ دونوں سے بیگانہ رہے۔ اور جب مولانا شبلی کی وفات کے بعد مصالحت کا زمانہ آیا تو وہ سب کے آگے تھے۔

مرحوم گو سیاست سے سروکار نہیں رکھتے تھے۔ تاہم ملک کے کھلے واقعات سے بہت غمگین رہتے تھے۔ عمر کے ساتھ کچھ تلخی اور کچھ خانگی افکار نے بھی ان کے دل و دماغ کو متاثر کیا۔ مگر ضابطہ اور تحمل ایسے تھے کہ کبھی اس داستان کا ایک حرف زبان پر نہیں آیا۔ ان کے قویٰ میں سب سے پہلے ان کے حافظہ نے جواب دیا۔ اکثر باتیں بھول جاتے۔ جب کاروان خیال نکلا تو اس میں مولانا ابوالکلام کے جواب میں ان کا یہ بیان پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کہ مجھے یاد ہے کہ دو نوجوان غلام محی الدین اور ابوالکلام سفر عراق کو نکلے تھے۔ "وہ خیالات ابوالکلام ہوں گے۔" میں نے انھیں لکھا کہ یہ صحیح ہے۔ کہ سفر عراق پر (شاید ۱۹۰۶ء میں) دو نوجوان عراق کے سفر کو نکلے تھے جن میں سے ایک غلام محی الدین (مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی) تھے۔ مگر دوسرے ابوالکلام نہیں بلکہ حافظ عبدالرحمٰن امرتسری تھے اور اس وقت مولانا ابوالکلام امرتسر میں وکیل کے ایڈیٹر تھے۔

بیچارے غلام محی الدین مرحوم نے عراق میں انتقال کیا۔ ہندوستان خبر آئی۔ تو مولانا ابوالکلام نے وکیل میں اپنے حزن و غم کا اظہار فرمایا۔ آخر میں میں نے لکھا کہ آپ نے اس طرح تصدیق کر دینے سے افسانہ بھی تاریخ بن جائیگی۔

اس پر مرحوم نے خاموشی اختیار کی اور کچھ جواب نہیں دیا۔ یہ ان کی خاص عادت تھی۔ کہ جس بات پر گفتگو نہ چاہتے اس کے جواب سے اعراض کرتے۔ اسی سے ان کے ادا شناس ان کے مطلب کو سمجھ جاتے

مرحوم کو بزرگوں کی یادگاروں سے والہانہ شیفتگی تھی۔ پٹنہ کے اجلاس ندوہ میں غالباً حاجی شاہ منور علی ورھنگی بانی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے۔

ندوہ کے جلسہ میں وہ دستار سر پر باندھ کر آئے۔ جو حضرت حاجی صاحب کا عطیہ اور تبرک تھا۔ ایک تعلیم یافتہ کی تقریر پر جلسہ میں ایک ایسا پرعظمت جوش علماء نسلی اور عام مسلمین پر طاری ہوا۔ کہ جو جس کے پاس تھا۔ وہ ندوہ کے نذر کر دیا۔ شاہ منور علی صاحب نے وہی دستار اتار کر پھینک دی وہ دستار نیلام ہو کر بڑی قیمت پر فروخت ہوئی۔ وہ کون خوش قسمت تھا جس نے آگے بڑھ کر اس کی حسب حیثیت قیمت ادا کی۔ اور اس کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا۔ نوجوان حبیب الرحمٰن خاں شروانی! پھر اس کو وہ ہمیشہ اپنے لئے طرۂ سعادت سمجھتے رہے۔

ان کے آخیر دور کی یادگاروں میں استاد العلماء مولانا لطف اللہ صاحب کی سوانح عمری اور خطیب بغدادی پر فقہی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہے۔ جو معارف میں چھپے ہیں۔ اور اللہ بھی شائع ہوئے۔ انھوں نے مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کتاب المبین پر ایک تبصرہ لکھا۔ اور میرے پاس بھیجا۔ اسی زمانے میں فقیر کی تصنیف

حاشیہ: مولانا شروانی نے مجھ سے بیان کیا کہ ان کے والد ماجد محمد تقی خاں صاحب نے مرحوم کے نام پر گاؤں میں مسجد و کتب خانہ وغیرہ بنایا تھا۔ صرف مسجد موصوف نے بنوائی۔ عسکہ مرتب عبدالقادر مرحوم

سید صاحب بھول جاتے ہیں کہ غلام محی الدین[1] احمد
اور فیروز بخت نام اور ابوالکلام کنیت اور آزاد
تخلص خود مولانا ابوالکلام آزاد کے ہیں۔ پھر
حضرت سید صاحب غلام محی الدین کے ہمراہ
ابوالکلام کے بجائے حافظ عبد الرحمٰن امرتسری
سیاح ممالک اسلامیہ کا نام لیتے ہیں۔ حالانکہ
مولانا شروانی جن کے حافظہ کی کمزوری کا سید صاحب
کو رنج ہے۔ دونوں بھائیوں کے نام صحیح لکھ رہے
ہیں۔ اور حضرت سید صاحب جن کو اپنے قوت
حافظہ پر بھروسہ ہے۔ بدقسمتی سے دونوں
بھائیوں کے نام تک بھول گئے ہیں۔ اس
پر حضرت سید صاحب کا یہ فرمانا کہ غلام محی الدین
کے ہمراہ ابوالکلام نہ تھے۔ بلکہ حافظ عبد الرحمٰن
امرتسری تھے کیسی پہیلی بن گیا ہے۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ "آپ نے
بغداد کا ذکر چھیڑا۔ مجھ کو وہ وقت آ گیا جب
دو نوجوان ابوالکلام آزاد اور ابوالنصر آہ
نمایاں ہوئے تھے " . . . . اسی
سلسلے میں سنا کہ آپ بغداد چلے گئے۔"

سید صاحب فرماتے ہیں کہ غلام محی الدین
کے ہمراہ ابوالکلام نہ تھے۔ حافظ عبد الرحمٰن
امرتسری تھے لیکن جب حافظ عبد الرحمٰن امرتسری
کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ
حافظ صاحب مرحوم نے ممالک اسلامیہ کا
سفر ۱۹۰۵ء میں کیا تھا۔ ان کا سفر نامہ
بلاد اسلامیہ (طبع اول مطبوعہ مفید عام لاہور)
جو ۱۹۰۵ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس
وقت میرے سامنے ہے لیکن پوری
کتاب میں سفر عراق کا کہیں مذکور نہیں۔
ہاں ان کا ایک دوسرا سفر نامہ بھی ہے۔ مگر
جہاں تک مجھے یاد ہے وہ سفر نامہ ہندوستان
کا ہے۔ ممالک اسلامیہ یا عراق کا نہیں افسوس
ہے کہ وہ اس وقت میرے سامنے نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ جس وقت مولانا ابوالکلام
آزاد نے عراق کا سفر کیا ہو تو حافظ عبد الرحمٰن
صاحب بھی ہمراہ ہوں۔ یہ بالکل ایک الگ
بحث ہے۔ لیکن اس سے یہ کیسے ثابت
ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام کا سفر عراق
افسانہ ہے تاریخ نہیں۔

اچھا یہ حالت ہے کہ اگر ایک طرف مولانا
ابوالکلام آزاد کے علم و فضل و صبر و ضبط اور
بردباری اور استقامت کے سامنے گردن
خم ہے تو دوسری طرف مولانا سید سلیمان کے
علمی فتوحات سے فیض یاب ہونے والے
بے شمار لوگوں میں سے ایک ہونے کی بھی
ہمیں عزت حاصل ہے۔

اب قارئین کرام خود ملاحظہ کر سکتے
ہیں کہ حقیقت حال کیا ہے۔ ؟

---

[1] تذکرہ مشاہیر جلد ۲ صفحہ ۳۶

صدر یار جنگ

ذاتی تاثرات

(از جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی)

نام نامی پر نظر سب سے پہلے اس وقت
پڑی جب اپنا زمانہ اسکولی طالب علمی کا تھا
اور مولانا شروانی ایک خاصہ پختہ کار اہل قلم
اپنی جوانی کی آخری منزلوں میں تھے۔ اور علی گڑھ
منتھلی کے مضمون نگار تھے۔ یہ ذکر کوئی ۱۹۰۵ء
کا ہے چند ہی روز میں دیکھا کہ اسم گرامی الندوہ
(لکھنؤ) کے سرورق پر شریک ادارت کی
حیثیت سے پر چسپاں رہا ہے۔
ایک ایڈیٹر تو مولانا شبلی نعمانی تھے اور
دوسرے ان کے حبیب لبیب اور ہم قافیہ
مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔

الندوہ میں شروانی صاحب نے لکھا کیا!
تو برائے نام ہی لیکن نام بحیثیت ایڈیٹر کے
برسوں چھپتا رہا۔ کچھ ہم رنگی اس باب
میں مولانا شبلی مرحوم سے حاصل رہی۔
تخلص انکا بچہ کی زبان پر لیکن شاعری
کا نمونہ دیکھنا چاہئے تو کسی "ریسرچ اسکالر"
کی دستگیری کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔!
مضمون شاید چند سال کی مدت ادارت
میں ایک ہی لکھا "حیات خضر" دو نمبروں
میں۔ باقی ان کے نام کا تلازم مولانا شبلی
کے نام کے ساتھ ذہن میں خوب جم گیا۔

دو چار سال اور گذرے اور اب کالج
کی طالب علمی کے زمانہ میں جب تقریباً روزانہ
حاضری مولانا شبلی کی خدمت میں رہنے لگی
تو معلوم ہوا کہ کم از کم جہاں تک معاملات ندوہ
کا تعلق ہے۔ نواب شروانی اور شبلی نعمانی
کے درمیان چولی دامن کا سا تعلق ہے۔
ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ——!
علی گڑھ اور اعظم گڑھ کے درمیان ایک اور
وجہ ارتباط ایک اور رشتہ توافق و اتحاد۔

صوری زیارت سب سے پہلے ندوہ کے ایک
جلسۂ انتظامیہ میں ہوئی۔ سنہ غالباً ۱۹۱۱ء
تھا۔ ارکان میں دو پارٹیاں تھیں (اور مسلمانوں
کی کس انجمن یا ادارہ میں پارٹیاں نہیں!)
ایک فریق کے لیڈر مولانا شبلی تھے اور
دوسرے کے قاری شاہ سلیمان پھلواروی
اور مولوی خلیل الرحمٰن سہارنپوری ہم لوگ کالج
کے چند لڑکے بھی تماشائیوں میں شریک

کہ اگر کسی موقع پر پبلک کی مدد کی ضرورت پڑی تو
پبلک کے نمائندہ بنکر مولانا شبلی کو کمک
پہنچائی جائے گی۔ فلاں صاحب آئے اور
فلاں صاحب آئے۔ —— اپنے لئے
فخر کا یہ موقع کیا کم تھا۔ کہ ایسے معزز جلسہ میں
بیٹھنے کو مل گیا۔ تماشائی ہی کی حیثیت سے
سہی! —— یہاں تک کہ مولانا شروانی
آ گئے۔ حسن مردانہ کا نمونہ چہرہ پر شرافت
برستی ہوئی۔ متانت بلائے اپنی نیکی۔ مشہور یہ تھا
کہ یہ زبردست "شبلوی" ہیں۔ دیکھنے میں یہ
آیا کہ یہ اپنا دامن ہر فریقانہ آلودگی سے بچائے
ہوئے نہ گفتگو میں گرمی نہ لہجہ میں درشتی ایک
پیکر حلم و آشتی۔

سنہ غالباً ۱۹۱۵ء تھا کہ اپنی ایک نوعمری
کی کتاب (لغو، تو اب کہہ رہا ہوں اس وقت تو
وجہ نازش تھی) فلسفہ اجتماع کا مقدمہ الناظر میں
نکلا۔ اس میں دہلی کے ایک واقعہ سے متعلق
مولانا شبلی پر تعریض تھی۔ اس کی تردید اور
صفائی میں بطور شاہد عینی کے شروانی صاحب
کا مضمون الناظر کے دوسرے ہی نمبر میں موجود
لیکن تردید میں نہ تلخی نہ تعریض۔ بس صاف
اور سادہ بیان واقعہ۔ سیرت کی شرافت کا
اثر چہرہ ہی پر نمایاں نہ تھا۔ قلم بھی اسی رنگ
میں ڈوبا ہوا تھا۔

سنہ ۱۹۱۸ء کی شاید جولائی کا مہینہ تھا
کہ شروانی صاحب حیدرآباد صدر الصدور امور
مذہبی ہو کر نئے نئے پہونچے۔ ان کی مذہبیت
اور نیکی و دینداری کا ڈنکا بجا ہوا۔
میں اپنی زندگی کے اسی دور میں الحاد و بے دینی
کے سیئے کا طور پر رہا اور بدنام اور عین اسی
زمانے میں ایک کتاب کے سلسلے میں خاص طور پر
حیدرآباد کے تسلیم پریس کی زد میں آیا ہوا۔
شروانی صاحب عہدہ کے لحاظ سے بھی مجھ
سے کہیں اونچے مرتبہ پر۔ پہلی مرتبہ حاضری کی
کی نوبت ایسے مخالف حالات میں آ گیا تو
بہت ڈرتے ڈرتے لیکن پہلی ہی ملاقات میں
معلوم ہو گیا کہ ڈر بے محل اور اندیشہ بے جا تھا
خوب سے لے داس کا سایہ کی نہیں پڑنے دیا
کہ میری بدمذہبی اور بدعقیدگی ان کی شفقت اور

عنایتوں کی راہ میں کچھ بھی حائل ہو رہا ہے
—— اپنا رہنا اس کے بعد کچھ ہی دن اور
حیدرآباد میں ہوا۔ شروانی صاحب کی فرض
شناسی، دیانت، بے لوثی، مستعدی اور
کارگذاری کے چرچے سن سن کر جی خوش
ہوتا رہا۔

اگست میں رخصت پر لکھنؤ آیا۔ اور یہاں
سے استعفیٰ لکھ کر بھیجا۔ بیکاری کو ابھی دو ہی
مہینے ہوئے تھے کہ اپریل یا مئی میں سر امین جنگ
مرحوم (صدر المہام پیشگاہ مبارک) کا تار پہونچا
کہ اعلیٰحضرت نے یاد فرمایا ہے۔ فوراً آ جاؤ۔
اسٹیشن ہی پر حکم ملا کہ قیام سرکاری طور پر
صدر الصدور امور مذہبی ہی کے یہاں رہے گا۔
جانا اور رہنا پڑا۔ ۴۔ ۵ روز کے قیام میں مولانا
کو خوب قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ان
کی صحیح مذہبیت (جس میں تعصب و نفرت کا
شائبہ نہ تھا) دینی پختگی (جو کر خشکی سے ناآشنا
تھی) معتدل اور متوازن خوش اخلاقی، مہمان
نوازی ایک مرتبہ نظام اوقات کی پابندی۔
جدید اور قدیم رنگ کی خوشگوار آمیزش لباس
و طرز معاشرت کی نفاست، وضعداری ایک
ایک چیز کا مشاہدہ ہو گیا۔ اور ایک ایک چیز
دل میں اتر گئی۔

اعلیٰحضرت کے یہاں باریابی اور پھر سے
ماہوار تصنیفی وظیفہ کی منظوری کے سارے
مرحلوں میں مرحوم جس شفقت اور اخلاص کے
ساتھ قدم قدم پر رہنمائی فرماتے رہے اس
کا نقش آج تک دل پر تازہ ہے

اب تعلقات بڑھنے اور مراسلت خاصی کثرت
سے رہنے لگی۔ اور ذاتی، قومی، ملی، دینی
سب ہی مسئلے موضوع گفتگو رہے۔ اور ملاقاتیں
کبھی لکھنؤ میں ہوتی رہیں۔ کبھی علی گڑھ
میں اور کبھی حیدرآباد میں —— مرحوم
کو ندوہ کے ساتھ شغف تھا۔ اس کے رکن
کیا معنی رکن اعلیٰ تھے۔ پابندی کے ساتھ اس
کے ہر جلسہ میں شریک ہوتے۔ علی گڑھ سے
سفر کر کے لکھنؤ آتے۔ اور ہمیشہ اپنے محب
خصوصی مفتی احتشام علی علوی کا کوروی مرحوم کے
ہاں ان کی حیدری گنج والی کوٹھی میں ٹھہرتے۔
جب تک سفر کی قوت ذرا بھی باقی رہی اس
معمول میں نہ فرق آنے پایا۔ اور علی گڑھ تو گویا
ان کا گھر ہی تھا۔ یونیورسٹی کورٹ کا ہر میٹنگ
میں التزام کے ساتھ کیوں نہ آتے۔

مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر خواہ
کوئی خواہ کوئی۔ ہر تھوڑی مدت کے بعد بدلتے
رہتے ہیں۔ ابھی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں
پر ہیں۔ تو ابھی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں
کبھی سر سلطان کا تخت سلیمانی اتر رہا ہے تو آج
سر راس مسعود کے ورود مسعود کی تیاریاں ہو رہی ہیں
ابھی نواب سر ضیاء اللہ خاں کا طوطی بول رہا ہے
تو ابھی سر ضیاء الدین کا ستارہ اقبال عروج

پر ہے ۔ ابھی نواب محمد اسمٰعیل خاں ہاتھوں ہاتھ لائے جا رہے ہیں ۔ ابھی تو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی پیشوائی کے لئے فرش بچھ رہے ہیں کورٹ کے ممبر کچھ ان کے ساتھ اور کچھ "ان کیا دور پہوان" اور ان دونوں سے الگ صرف اپنے ساتھ ـــــــ شروانی صاحب کا مرکز ثقل ہر حال میں اپنی جگہ پر تھا ۔ ندوہ میں بھی ان کا یہی انداز اسی طرح تا ئم رہا ۔ کبھی ہوئے تھے مولانا شبلی اور منشی احتشام علی کی پارٹیاں آپس میں برسر پیکار ۔ لیکن شروانی صاحب کے تعلقات دونوں سے یکساں ہموار ۔ خوشگوار گویا دونوں کے درمیان ایک نقطۂ اتصال ۔ !

سنہ ۱۹۲۰ء و سنہ ۲۱ء کا زمانہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص ہیجان کا دور ہوا ہے ۔ تحریک خلافت و ترک موالات کا طوفان زوروں پر ۔ ملک کا سواد اعظم شیخ الہند مولانا عبد الباری فرنگی محلی اور علی برادران اور مولانا ابو الکلام کے ساتھ ساری فضا پر یہی حضرات چھائے ہوئے ندوہ اور علی گڑھ دونوں زد پر ، اور ندوہ غریب تو خیر اعلی اور معرکہ صرف علی گڑھ تھا ۔ شروانی صاحب اپنے گنتی چند افراد کے دوسرے کیمپ میں ، کچھ نہ پوچھئے کہ کیا کچھ سننا پڑا کیا کچھ سہنا پڑا ۔ جوش اور ہیجان کے وقت کس کو اپنی زبان و قلم پر قابو رہا ہے ۔ آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے ۔ اور کل نعیب الرحمٰن ، کے حبیب ، "شیطان" مشہور ہوئے ـــــــ یہ بندۂ خدا سب کچھ صبر و متانت ہی سے سنتا رہا ۔ سہتا رہا ۔

ایک زمانہ وہ تھا جب ۱۰ سال قبل جب ابو الکلام آزاد کا شمار حلقہ شبلی میں مبتدیوں میں تھا ، اور مولانا شروانی کے ہاں انکا تقرب خود ان کے لئے باعث فخر و مباہات تھا ۔ اب دیکھتے دیکھتے وقت وہ آ گیا کہ مولانا ابو الکلام لیڈری کے بام بلند پر تھے ، اور شروانی صاحب ایک اہل قلم اور چھوٹے موٹے رئیس کی حیثیت سے جہاں تھے وہیں قائم ـــــــ شرافت و شرافت کے امتحان کا اصلی وقت ، دلکشی و اتحاد کا نہیں ۔ مخالفت اور بیزاری ہی کا وقت ہوا کرتا ہے ۔ پٹھان تو اپنی تند مزاجی کے لئے بدنام ہیں ، اور شروانی پٹھانوں ہی کے ایک خاندان کا نام ہے ۔ صدر یار جنگ کی مثال نے دکھایا کہ جنھوں نے پٹھانوں کو حلم و متانت سے یکسر عاری قرار دیا ہے ۔ انھوں نے کلیہ قائم کرنے میں جلدی یا غلطی کی ہے ۔ محمد علی جوہر کا ایک شعر خفیف تصرف کے ساتھ ہے

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال

ہیں آپ کا حلم بھی کتنی شروانیوں میں ہم

مارچ سنہ ۱۹۲۲ء تھی کہ اس وقت کی خوش عقیدگی کے جوش میں ، ارادہ حرمین شریف

میں شرکت کا کر لیا ۔ لکھنؤ سے ساتھ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے قافلہ کا ہو گیا ۔ اور ان پر باوجود علم و فضل کے شاہانہ رنگ غالب تھا ۔ خیر صاحب اجمیر پہنچکر مولانا کی پارٹی کی خوب خاطر داریاں ہوئیں ۔ شروانی صاحب بھی یہاں آئے ہوئے تھے ۔ ذاتی طور پر آستانہ چشتیہ کے عقیدت مند تو تھے ہی ۔ لیکن یہاں اس وقت ان کی آمد سرکاری حیثیت سے تھی ۔ مملکت حیدرآباد کے صدر الصدور محکمہ امور مذہبی کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے ، اعزاز و تکریم کے ساتھ ہر طرف سے ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے تھے ، اور دیوان صاحب درگاہ کے مہمان خاص تھے ۔ رات کے وقت محفل سماع میں دیکھا ، عام لوگوں کی صف میں مسند سے دور ایک معمولی شریک محفل کی طرح بیٹھے ہوئے ان سے کہیں بہتر جگہ پر تو ہم لوگ قابض تھے ، وہ ذرا چاہتے تو بہتر سے بہتر جگہ ان کے لئے خالی کرائی جا سکتی تھی ۔ لیکن طبیعت میں یہ انکسار کہ ہر طرح قدرت رکھنے کے باوجود اپنے لئے مقام امتیاز کسی طرح گوارا نہیں ۔ ـــــــ ! خیر تواضع کے مشاہدہ کا یہی ایک موقع نہ تھا ۔ حیدرآباد ، اعظم گڑھ ، علی گڑھ ، لکھنؤ اور خدا معلوم کتنی بار اور مشاہدے اسی قسم کے پہلے بھی ہو چکے تھے ۔ اور بعد کو بھی ہوتے رہتے ۔

سنہ ۱۹۲۲ یا سنہ ۲۳ء میں علی گڑھ میں کسی عالم دین کا تقرر ہونے والا تھا ۔ انتخابی کمیٹی میں مولانا شروانی کے ساتھ یہ خاکسار بھی تھا ۔ انٹرویو کے وقت جب مختلف امیدوار آنے شروع ہوئے تو صدر مجلس (وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد) کرسی صدارت پر صدر یار جنگ کو بٹھا کسی ضرورت سے باہر چلے گئے ۔ ان حضرت نے کیا کیا کہ مُنّا خود بھی کرسی صدارت چھوڑ کر اپنی جگہ اس بے علم و عمل کو بٹھا دیا ۔ میں شرمندگی سے گڑا جاتا تھا لیکن ان کے شدید اصرار کے سامنے میرا انکار کیا کچھ چل پایا ۔ ! ـــــــ اور آخر زمانہ میں جب تک ذرا بھی سفر کے قابل رہے یہ تو بار ہا دیکھنے میں آیا کہ لکھنؤ میں ندوہ کی مجلس انتظامی کا جلسہ ہو رہا ہے ۔ اور حضرت صدر یار جنگ اپنی مستقل صدارت چھوڑے ہوئے اپنے ایک نیازمند ہی کی عزت افزائی کر رہے ہیں ۔ !

گفتگو بڑی پرلطف ہوتی تھی ۔ اور ہر فن (؟) علمی ، ادبی ، شعری ، مذہبی ، تعلیمی ، سیاسی ، جو موضوع بھی چاہئے چھیڑ دیجئے ۔ اور گفتگو اس مجلس سے سیری نہ ہو گی ۔ اللہ نے رئیس کے ساتھ ساتھ دل کا رئیس بھی بنا دیا تھا ۔ کھانے پینے کے تو خوب تھے ہی کھلانے کا ذوق بھی خوب رکھتے تھے ، اور جاڑوں کے موسم میں تیتر بگ کی دعوت بڑے اہتمام سے کرتے ۔ اس دعوت میں جو ایک بار بھی شریک ہو جاتا اس کا مزہ مدتوں نہ بھولتا ـــــــ تحریر میں

ادیب سے بڑھ کر انشا پرداز کی شان رکھتے تھے ۔ چست منجھا ہوا انداز بیان اور ہر طرح گٹھا ہوا ۔ الفاظ ضرورت سے نہ زیادہ نہ کم ۔ بس ٹھیک اتنے ہی جتنے موثر ادائے مطلب کے لئے ضروری ہوتے ۔ گویا ہوشیار اور فن کار معمار عمارت میں گڑھی ہوئی ۔ اینٹ چن کر اور گن گن کر لگا رہا ہے ۔ ! ـــــــ اور تحریر سے بڑھ کر اس کمال فن کا ظہور تقریر و گفتگو دونوں میں ، میدان میں خطاب عام ہو تو اور کمرہ کے اندر خطاب خاص ہو تو ۔ زبان حشو و زوائد سے ناآشنا میٹھے میٹھے بول گنے چنے ہوئے ۔ دلکشی و تاثیر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب حج و زیارت سے واپس آئے ہیں تو حالات سفر خصوصاً مشاہدات مدینہ منورہ سادہ اور بے ساختہ زبان میں اس انداز سے بیان کرتے کہ سماں بندھ جاتا ۔ خود بھی آبدیدہ ہو جاتے اور سننے والوں کو بھی رلا دیتے ۔

غیرت دینی اور حرارت ایمانی کے تو کہنا چاہئے کہ پتلے ہی تھے ۔ سنہ ۱۹۳۰ء یا سنہ ۳۱ء میں اردو کے ایک مشہور رسالے نے دینی و اعتقادی حیثیت سے بڑا سر اٹھا رکھا تھا ۔ ضرورت اسکی تھی کہ ملت اپنی اجتماعی قوت سے فتنہ کی سرکوبی کرے ۔ خیر وہ تو جوں توں کر کے ہو گیا ۔ شروع سنہ ۳۲ء میں ایک منزل ایسی آئی کہ قانونی کارروائی کے لئے حکومت وقت کی منظوری لینی ضروری تھی ۔ صوبہ گورنمنٹ کے ہوم ممبر نواب نزمل اللہ خاں مرحوم تھے ۔ ان پر مجرم کی طرف سے سفارشوں کا جادو چل چکا تھا ۔ ان اثرات کو باطل کرنے کے لئے درکار ایسی ہی زبردست شخصیت تھی ۔ اور وہ صدر یار جنگ کی ذات میں ہاتھ آ گئی ـــــــ بیچارہ نے سپچ دھج رہ کر وہ سب کچھ کر دیا جو ایک مرد مومن کو ان حالات میں کرنا تھا ۔

اسے چند سال گذرے تھے کہ ایک اور فتنہ کا سامنا کرنا پڑا ۔ آج سے ۲۵ سال قبل ہمارے جوار میں ایک نوجوان وکیل سجاد علی انصاری مرحوم تھے ۔ پڑھنے لکھنے کے بڑے شائق بڑے ذہین و شوخ نگار ذاتی طور پر خدا کے فضل سے پورے مذہبی لیکن مذہبی عنوانات پر قلم اٹھاتے تو معلومات کی سطحیت و بے مغزی کے ساتھ شوخیوں میں بھی حدود سے تجاوز کر جاتے علی گڑھ میگزین وغیرہ میں طالب علمی کے زمانہ میں مضمون لکھا کرتے ۔ اور ہم لوگ بھی داد دیتے ۔ جس طرح ہر نو مشق اور نونہال اہل قلم کو اسکی ہمت افزائی کے خیال سے داد دیدی جاتی ہے ۔ اللہ کا کرنا کہ سنہ ۲۴ء میں تو سجاد مرحوم کا عین شباب میں انتقال ہو گیا ۔ اور اس کے کئی سال بعد بعض خوش مذاق " بے فکروں نے ان کے مضامین اور ایک نامکمل ڈراما کو کتابی صورت میں چھاپ دیا ۔ اور علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے کارکنان کو خدا معلوم اس میں

کونسی ادبی خوبیاں نظر آئیں کہ کتاب کو داخل نصاب کر دیا ۔ اس خاکسار کو جب اس کا علم ہوا تھا تو اس کھلی ہوئی بدمذاقی پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا ۔ اور پہلے یہ ادب تعلیم یونیورسٹی کے استادوں کی خدمت میں عرض و معروض کیا ، مطلق پذیرائی نہ ہوئی ۔ ہار کر اور مجبور ہو کر بلند آواز سے چیخنا چلانا پڑا ۔ اور اب یہاں سے شرکت صدر یار جنگ کی شروع ہوتی ہے ۔ وسط سنہ ۳۲ء میں ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی ۔ جس کے یہ صدر تھے ۔ اس مجلس نے متفقہ طور پر کتاب کو نصاب سے نکلوایا ۔ حضرت کی پوری رائے صدق ۸ نومبر سنہ ۳۲ء میں اس سلسلہ کی تمام کارروائی میں درج ہو چکی ہے ۔ یہاں اس کے چند اقتباسات کافی ہوں گے ۔

علی گڑھ میگزین کی جو بھی عزت کی جائے بجا ہے اردو کے اعلیٰ میگزین میں نہ تھا ۔ جس میں مضامین کی اشاعت کو ، بلند خیالی یا پاکیزگی ادب کی ضامن نہیں ہو سکتی ۔ ،

سخت قابل افسوس اور خطرناک یہ پہلو ہے کہ سجاد فلسفہ ، اخلاق ، مذہب سب کو سخت بیزار ہیں ۔ مذہبی ادب کی منظومات کا ایک خاص ... خیال خود خاتمہ کر دیا ہے ۔ گویا ان کے یہاں کوئی اصول زندگی نہیں ۔ بے اصول زندگی محبوب و مقبول ہے ۔ ان کے یہاں تین محبوب ہیں ۔ عورت کا شباب لبریز لیکن وہ عفت و عصمت کی گندگی سے پاک صاف ہو ۔ ایک غرق شباب تجربہ جو کسی کمرہ پردہ تعیش دے رہی ہو ۔ دنیا اور پابندی سے سخت بیزار ہو ۔ کہ ناشائستگی کا بہترین نمونہ ہے ۔ اس کی تعریف میں ان کے تمام مضامین مطلب اللسان اور فکر نیر ہیں ۔ اگر کوئی نوجوان عورت نکاح کر کے عصمت و عفت کی زندگی بسر کرے ۔ تو وہ خارج از حیثیت ننگ انسانیت ہے ۔

دوسرا محبوب "معصیت لطیف" ہے مگر باوجود پوری کاوش کے مکمل نہ لگا ۔ کہ ان دو لفظوں کا اصلی مفہوم مضمون نگار کے ہاں کیا ہے پڑھنے والا جس گناہ سے لطف لینا چاہے اسکو محبوب قرار دے لے

تیسرا محبوب ان کا شیطان اور شیطنت ہے اول سے آخر تک شیطان اور شیطنت کو سراہا ہے ۔ خلافت کا کمینات قرار دیا ہے ۔ بلکہ پیدائش عالم کی اصل حکمت ۔

اس کے مقابلہ میں انبیائے کرام ۔ ملائکہ مقربین ۔ بلکہ ان کے ڈراما "روز جزا" کا خدا بھی پست و بے قوقعت ہیں ۔ حضرت جبرئیل اور دوسرے مقرب فرشتوں کی طرح اس ڈراما میں شیطان کے مقابلہ میں تضحیک کی گئی ہے اس کو پڑھ کر ڈراما نگار کی فہم و دانش پر سخت تاسف ہوتا ہے ۔ مذہب کے استخفاف سے مختصر خیال اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے ۔ مضامین زرلیخا ۔ رقد جزا میں جس طرح مقدس

ف اصل شعر میں بجائے حلم کے عقل ہے

سے اُن کی خبر برابر ملتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن ان کا خط ملا کہ وہ ۱۱ اگست سنہ ۱۹۵۰ء کو جمعہ کے دن صبح کے سات بجے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۳)

موت بنی آدم کی میراث ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ وہ طبعی عمر گذار کر وہاں گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ وفات کے وقت عمر ۸۴ برس تھی۔ یعنی کتاب مقدس کی مدت سے بھی چودہ برس زیادہ تو اس پہلو سے کوئی افسوس نہیں۔ یہ مرحلے ٹالے نہیں ٹلتے۔ ایک نہ ایک دن ضرور پیش آتا ہے۔ وہ رئیس ابن رئیس تھے لیکن انھوں نے اپنی عمر رئیسوں کی لغویات میں ضائع نہیں کی۔ علم کو اس طرح حاصل کیا جس طرح اسکا حق ہے۔ پھر ملک کا علم و فن شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جو ان کا ممنون نہ ہو! معنوی اعانت سے شاد کام اور شفیق باعث ہوا ہو۔ یہ بھی قابل فخر بات ہے لیکن افسوس ہے تو اس بات کا کہ اب ان جیسا انسان نہیں ملنے کا۔ جس دور کی وہ یادگار تھے وہ دور تو ختم ہو گیا۔ اب ان کے سے انسان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ایک آدھ اور صورت جو اس دور کی یادگار باقی ہے وہ بھی جھلملاتی شمع ہے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گل۔ اس کے بعد گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ زمانہ نے اپنا ورق الٹ دیا ہے۔ آج محبت اور خلوص قدیمی اور وفا، اخلاق اور قدردانی، علم اور فن، دین اور دنیا، غرض ہر چیز کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ مرحوم اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ جسے ہم ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو وضعداری سے بہتر لفظ نہ ملے۔ وضعداری، ایک قانون ایک ضابطہ کا نام تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا آپ جس طرح کل اشخاص سے آج ملتے ہیں اسی طرح آج سے پچاس برس بعد بھی ملیں گے۔ زندگی کا جو اصول آپ نے بنا لیا ہے اب کوئی طاقت آپ کو اس سے ادھر ادھر نہیں کر سکتی۔ آپ کی دوستی دو دن کی نہیں، سو برس تک قائم ہوگی۔ وہ موافقت بھی۔ یہ نہیں کہ جدھر ہوا ہوئی اسی طرف ہو گئے۔ اسے ہم وفاداری، استقلال، استواری سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

مرحوم اسی اصول کی چلتی پھرتی تصویر تھے اب یہ تصویر پھر نظر نہیں آئے گی۔ میر کا ایک شعر یاد آگیا۔ اسی پر ختم کرتا ہوں۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
کہتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

تصویرِ عبرت
(یعنی)
نور جہاں کا مقبرہ!

بزم اک لاہور میں ہے خادمانِ قوم کی
جنکے دل سے داغ ہیں جو ہے فکرِ شانِ قوم کی

حسرتِ بیدل بھی اسکے شاملِ محفل ہوا
رنگِ محفل سے سرور بیکراں حاصل ہوا

بلبلانِ قوم کے جب چہچہے سب سن لئے
شہر خاموشاں میں جا نکلا میں عبرت کیلئے

پھرتے پھرتے مرقدِ نور جہاں آیا نظر
مقبرہ تھا وہ کہ تھا تصویرِ عبرت سر بسر

کل تھا جس کی شان پر عالم کا دل آیا ہوا
آج عالم بیکسی کا اس پہ ہے چھایا ہوا

جس کے رتھ کو ہانکتا تھا بادشاہِ روزگار
گردشِ گردوں سے یوں تاراج ہو اسکا مزار

چوٹ سی دل پر لگی اجڑی وہ حالت دیکھکر
حالت ہی پہ آبنی بگڑی وہ صورت دیکھکر!

دل کی آنکھیں کھل گئیں غفلت کا پردہ اٹھ گیا
بیخودی نے مجھکو دکھلایا تماشا اک نیا

شکل اک آئی نظر استادہ باقرِ شہی
جو عجب حسرت سے روضہ کی طرف تھی دیکھتی

اسکی پیشانی سے رعبِ سلطنت تھا جلوہ گر
اس کی چتون سے برستا تھا غضب کا کرّ و فر

دل نے آہستہ کہا یہ ہو جہانگیرِ غیور
مقبرہ میں سونے والی اسکے دل کی تھی سرور

دیر تک تو ضبط بیتابیٔ دل کرتی رہی
جوشِ بیتابی سے وہ مجبور آخر ہو گئی

آہ کھینچی ایک اُس نے با دلِ اندوہگیں
یوں کیا اظہارِ دردِ دل باوازِ حزیں

کیا اسی بیگم کا ہے یہ خوار خستہ مقبرہ
برسوں ڈنکا جس کا ملکِ ہند میں بجتا رہا

میں نے جس کے سر پہ قرباں چترِ شاہی کر دیا
جسکی جوتی کے تلے اورنگِ شاہی دھر دیا

جسکے قدموں پر فدا کر دی تھی میں نے سلطنت
جسکے آگے سر جھکا دیتے تھے اہلِ مملکت

جس کی صورت جلوۂ فردوس کی تصویر تھی
جس کی رنگینی بہارِ خطۂ کشمیر تھی

آہ وہ ایامِ عشرت اور وہ لیل و نہار
بلبلِ آمل چہکتا دیکھ کر جن کی بہار[1]

جس کی رنگیں بزم رشکِ روضۂ فردوس تھی
بیکسی سے اسکے روضہ کی ہو کیا صورت بنی

ظالموں نے قبر کا تعویذ تک چھوڑا نہیں
کونسا گوشہ ہے تربت کا کہ جو توڑا نہیں

نازکی سے خجل ہوتی تھی جسکی پنکھڑی
حیف وہ خاموش آغوشِ لحد میں ہے پڑی

قصر میں بچھتا تھا جسکے فرشِ دیبا و حریر
آہ فرشِ خاک پر سوتی ہے وہ ماہِ منیر

جھگڑے میں نازنینوں کے جو کرتی تھی بسر
آہ اُس کی قبر پر اب بیکسی ہے جلوہ گر

سیج پر پھولوں کے سوتی تھی کبھی جو نازنیں
پھول دوست کبھی اسکی قبر پر چڑھتے نہیں

جس کی پابوسی کی کرتے آرزو گلہائے تر
خشک کانٹوں کا پڑا ہے ڈھیر اسکی قبر پر[2]

حسن جسکا تازگی بخشِ گل و گلزار تھا
آہ قسمت میں لکھا اسکی لحد کے خار تھا

قصر میں جلتی تھی جس کی شمعہائے عنبریں
حیف روشن اک دیا بھی قبر پر اسکی نہیں

نام روشن ہے جہاں میں آہ جسکا سر بسر
نام کو بھی روشنی آئے نہ اُس کی قبر پر

کر دیئے جس نے بہت سے صاحبِ نام و نشاں
اس شکستہ مقبرہ میں وہ پڑی ہے بے نشاں

جس نے صدہا خلعت دیبا و اطلس دیدیئے
حیف ترسے اس کی تربت ایک چادر کیلئے

لونڈیوں پر جس کی تھی پوشاک کل زربفت کی
آج دیواریں ہیں اسکے روضہ کی ننگی کھڑی

یہ کہا اور ہو گئی چپ ایک لمحے کے لیے
پھر ادا اک شانِ استقلال سے یہ جملے کئے

کیا ہوا گر ظالموں نے توڑ ڈالی قبر تک
روشن اس کا نام دنیا میں رہے گا حشر تک

حسرت شیروانی

[1] ملک الشعرا طالب آملی

[2] جب راقم نے فاتحہ پڑھی تو نور جہاں کی قبر پر کانٹوں کا انبار پڑا ہوا تھا۔ شروانی

اور ناہلوں یک قلم ممانعت کر دی گئی۔ سیندھی تاڑی شراب وغیرہ کی دکانیں شہر پناہ سے باہر نکالدی گئیں۔ اور شہر پناہ کے اندر مسکرات کا بابر سے لانا جرم قرار دیا گیا۔

اہالیان خدمات شرعیہ کا جیسے قاضی وغیرہ احتساب ہوا۔ امتحان لیے جانے لگے سندیں دی گئیں۔ ان کے لڑکے تکمیل تعلیم دین کے واسطے مدرسہ نظامیہ حیدر آباد میں بھیجے اور دار الاقامہ میں رکھے گئے۔ قاضیوں کے دفاتر از سرنو ترتیب دیئے گئے۔ رویت ہلال کی شہادت کا بڑی احتیاط کے ساتھ اہتمام کیا گیا۔ مسجدوں میں تنخواہ دار اماموں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ موذن، جاروب کش، جانمازوں برقی پنکھوں، پانی کے نلوں، حوضوں، طہارت خانوں، غسل خانوں، بڑی مسجد میں تنخواہ دار خطیبوں وغیرہ کا اضافہ کیا گیا۔

عید گاہ میر عالم کی درستی اور توسیع ہوئی جہاں اب بیس بیس ہزار مصلیوں کا عید کی نماز میں ہجوم ہونے لگا۔ اس عید گاہ کو شروانی صاحب کی صدر الصدوری میں یہ فخر پہلی دفعہ نصیب ہوا۔ کہ اعلحضرت نظام دکن میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ نے عید گاہ کے دوگانے اسی عید گاہ میں ادا کرنے شروع کیے۔ اور امراء و اراکین سلطنت عید کی نماز کو بیاں حاضر ہونے لگے۔ اضلاع میں دینی مدارس، اور اصلاحی تبلیغی انجمنیں قائم کی گئیں۔ انگریزی مدرسوں میں دینی تعلیم کا خاص نگرانی کے ساتھ انتظام ہوا۔ واعظین مقرر کیے گئے۔ جو اضلاع کے دورے کرتے اور وعظ کہتے کو شہر مدارس تک بلائے جانے لگے۔ ہفتہ وار مذہبی رسالے جاری کیے گئے۔ مدارس حفاظ قائم ہوئے۔ محکمہ اوقاف کی تنظیم ہوئی۔ اکثر مذہبی سے متعلق اراضیات فائدہ کیے۔ اچھے لوگوں کو دی گئیں۔ یا نگرانی سرکار میں لی گئیں۔ مہتمم اوقاف و مساجد کے عہدے قائم کیے گئے۔ درگاہوں کی آمدنیاں خانقاہ متو لیوں سے نکالی گئیں۔ ماہ صیام میں چائے خانے آبدار خانے، ہوٹل دن میں بند کر دیئے گئے۔ مسلخوں میں ذبیحہ کی نگرانی کی گئی۔ حاجیوں کے قافلہ کا خاص انتظام کیا گیا۔ اور سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ غیر آباد مسجد بلاد کے بیع خرتی سے بچائی گئیں۔ مختصر یہ کہ شروانی صاحب کی صدر الصدوری میں مذہبی رنگ کچھ ایسا چڑھا تھا کہ ولایت کے تعلیم یافتہ ہائیکورٹ کے جج اور حکموں کے ججی کے اقتدار اولوا دو طلب کے ساتھ ساتھ مجالس وعظ و میلاد میں خوب خوب تقریریں کیں۔

شروانی صاحب نے ایسے نازک مذہبی جذبات و تعصبات کے زمانہ میں جدیا یہ زمانہ بہت تمام مذاہب کے انتظام کی باگ

ایسے دانشمندانہ طریقے سے ہاتھ میں لے کر کام کیا۔ کہ ان کے خلاف کسی مذہبی گروہ کی آواز بلند نہ ہوئی۔ اور یہ ان کے عاقلانہ انتظام کا کھلا ثبوت ہے۔

عادت کی فلسفیت

مذہبی حسن عمل کے ساتھ شروانی صاحب کی عادت میں ایک خاص فلسفیت کا بھی مجھے تجربہ ہوا ہے۔ یعنی ذرہ دکھلاوے اور نمائش کے انسان نہیں کسی فوری جذبہ سے ان میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اکثر باتیں وہ نہایت بے پروائی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ نہ سب سے بڑی خوشی کے موقع پر وہ از خود رفتہ ہوتے نہ بڑے سے بڑے حادثہ یا نقصان پر وہ شکستہ دل اور مغلوب ہوتے تھے، اسی فلسفیانہ مزاج کی پرداز کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ سفر کے بڑے بڑے مصارف جو میرے اہتمام سے ہوتے تھے، باورچی خانہ روزمرہ کا دستر خوان اور تمام حیدر آباد کے خانگی انتظاموں میں ہیچ بیکار۔ غصہ، غضب اعتراض، اپنی وجاہت کے اظہار، غرض ایسی کسی بات کا میں نے ان میں نشان تک دیکھا مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ان کی ہر ادا پر عاشق ہوں۔ ایک سطحی خیال کا آدمی تو یہ باتیں دیکھ کر کہے گا۔ کہ شروانی صاحب میں قوت انتظام نہیں۔ لیکن ایک نگاہ غائر دیکھے گی کہ ان تمام باتوں پر ایک اصل فلسفی کی طرح وہ توجہ نہیں کرتے۔ اور ان کو قابل التفات نہیں پاتے، اور شروانی صاحب کو سمجھنے کے لئے بڑی گہری مشاہدہ کرنے والی آنکھ کی ضرورت ہے۔ تعلیم اسلام ان میں کچھ ایسے طریقہ سے پیوستہ ہو گئی ہے کہ جن معاملات کو ہم جیسے لوگ منجانب اللہ صرف زبانوں سے کہنا سیکھتے ہیں شروانی صاحب ان معاملات کے منجانب اللہ ہونے کا یقین رکھتے ہیں

"قرون اولے کے مسلمانوں کو اگر آج کل کے بگڑے ہوئے لوگ دیکھتے تو ان کو (خاکم بدہن) احمق و خبطی کہتے۔ اور وہ برگزیدہ لوگ آجکل کے بندگان زر اور غلامان دنیا کو حیوان مطلق یقین کرتے۔ حدیث شریف تو یہ تعلیم دیتی ہے کہ

خدمتگار کا قصور دن میں ستر بار معاف کرو دولت وہ جمع کرتا ہے جس میں عقل نہیں۔ سب سے بہتر وہ ہے جس کا برتاؤ اپنے گھر والوں سے بہت اچھا ہو۔ بچوں پر مہربان ہو۔ یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرو۔ بدزبانی نہ کرو۔ غصہ سے دور بھاگو۔ خوش خلقی مسلم کی سب سے اچھی صفت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جیسا اس معیار پر ہم شروانی صاحب کو جانچتے ہیں اور پورے چھ سال ایک عیب جو جاسوس کی طرح ان کو دیکھا ہے اور اپنے روزنامچوں کی تیاری میں تیار نے پایا

کی ہیں لیکن مجبور ہوں کہ فیصلہ شروانی صاحب کے حق میں دینا پڑا ہے۔ ہمارا روئے سخن ایسے مسلم رئیس کیطرف نہیں ہے جو بات بات پر خدمتگاروں یا ماتحتوں کو اپنے زجر و توبیخ محاسبہ اور سخت گیری سے خائف و ترساں رکھتا، جرمانے کرتا۔ یا ہر طرف کر کے اپنے ناچیز وجود کو ایک بڑی ہستی ظاہر کرتا اور خود فریبی کے مرض میں مبتلا ہے۔ یا اپنی دولت کی بدولت اخلاقی مصیبت کا شکار ہے۔ اور اس کا ہمسایہ اس کے شر اور دراز دستی سے امن میں نہیں ہے۔

رائے کی مضبوطی اور جرأت اخلاقی

حیدر آباد میں مجھے یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ جاہے کتنی ہی خطیر و کثیر مالیت کا دیوانی کا مقدمہ ہو لیکن تجویز میں انھوں نے پہلی دفعہ جو رائے لکھ دی اس سے پھر نہ ہٹنے اور ججوں کے اصرار پر کہ ایک فقرے میں ذرا سی تغیر کر دی جائے کہ سب کی رائے کا اتفاق ہو جائے۔ شروانی صاحب نے یہی جواب دیا کہ رائے ایک دفعہ دی جاتی ہے تجویز اعلیٰ حضرت معظم کے ملاحظہ میں بھیج دی جائے" اور اپنی رائے میں جو پہلی دفعہ لکھدی تھی ذرا بھی تغیر و تبدیل نہ کی۔ ایسا نامر حبیب گنج سے حیدر آباد کے ججوں کو حسب الحکم میں نے خود دیا تھا۔ اخلاقی جرأت کا یہ حال دیکھئے کہ سات لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا مقدمہ ہے۔ فریقین میں ایک طرف تو اعلیٰ حضرت معظم کے خاص اسٹاف کا بڑا حضوری افسر ہے، اور دوسری طرف ایک نادار بیوہ ہے۔ یہ مقدمہ پہلے ایک بڑے دربار کے حق میں اس طرح فیصل ہو چکا ہے کہ بیس مفتی علماء بیوہ کے خلاف فتویٰ لکھ چکے ہیں۔ درباری افسر کو ڈگری مل چکی ہے۔ لیکن اب وہ پرانی اور بھاری مثل اعلحضرت آخری توثیق کی غرض سے شروانی صاحب کو بھیجتے ہیں۔ شروانی صاحب تجویز لکھتے ہیں۔ اور بصیغہ اشد راز وہ تجویز مجھے دی جاتی ہے۔ میں اسے صاف کرتا ہوں اور تجویز پر شروانی صاحب کے دستخط لے کر سر بمہر لفافہ میں یہ تجویز مع مثل کے اعلحضرت معظم کو بھیجدیتا ہوں۔ تجویز یہ لکھی گئی ہے کہ بیسوں فتاوی پر جو اسٹاف افسر کے موافق مفتیوں نے لکھے تھے خط تردید کا قلم پھیر دیا جاتا ہے اسٹاف افسر ہرایا جاتا ہے۔ بیوہ کے حق میں ڈگری دی جاتی ہے۔ نہ بیس فتاویٰ کا لحاظ فرمایا جاتا ہے نہ اسٹاف افسر کی وجاہت و مروت راہ انصاف میں حائل ہوتی ہے۔ نہ نہ اسٹاف افسر کا خوف کہ دربار سلطانی کا ہر وقت کا حاضر باش ہے۔ آخر فقرہ اس تجویز کا یہ تھا "شرعی حکم تو یہ ہے آئندہ اختیار سلطانی" بعد کو معلوم ہوا کہ اعلحضرت نے اسی تجویز پر عمل

فرمایا، جو شروانی صاحب نے دی تھی گذارش یہ ہے کہ بیس متوطنوں کی تردید کسی معمولی فقیہ کا کام نہیں نہ ایک ہندوستانی دربار میں ایسی جرأت اخلاقی آسان ہے۔

جب کبھی کی سرکار عالی میں شروانی صاحب نے سفارش کی تو اپنی صائب رائے سے اتفاق کو ایسا ملحوظ رکھا کہ وہ سفارش کبھی نامنظور نہ ہوئی ہاں ایک دو مثالوں میں ایسا ضرور ہوا کہ شروانی صاحب نے مثلاً تیس روپیہ ماہوار کی سفارش کی تو اعلحضرت نے تیس کو پچاس فرما دیا لیکن تیس کو پچیس یا بیس کبھی نہ کیا۔

کیسی ہی بڑی سفارش کے ساتھ کیسی ہی رائیں یا تقریظوں سے آراستہ کوئی تالیف و تصنیف قلمی شروانی صاحب کے پاس آتے جس کے متعلق مولف یا مصنف کو سرکار عالی کی سرپرستی انعام یا وظیفہ کی بڑی توقع ہو لیکن وہ کتاب ناقص ہو۔ تو شروانی صاحب کبھی تو ایسا کرتے کہ اس پر رائے لکھتے ہی نہ تھے انکار کر دیتے تھے لیکن اگر لکھنے تھے تو اس کتاب کے نقص نکال کر دکھا دیتے تھے۔ اور سفارشوں یا تقریظوں کا مطلق لحاظ نہ کرتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سب سے زیادہ لائق عالم تقریظ نگار کو بلا کر وہ کتاب اس کے سامنے رکھ دیتے۔ اور پوچھتے تھے کہ ایسی ناقص کتاب پر یہ تقریظ آپ نے لکھی ہے۔ اور تقریظ نگار کو معذرت کرنی پڑتی۔ کہ مولف کتاب نے اس کو جان سے تنگ کر دیا تھا۔

فطرت کی صنعت کاری کا اثر

اس عنوان میں سب سے پہلے یہ دکھانا ہے کہ کوئی عمدہ شعر ہو شروانی صاحب پر وجدانی حالت طاری کر دیتا تھا۔ یہ کلیہ باور رکھنے کا ہے کہ حساس دل پر شعر کا اثر ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی دل اخلاق حسنہ کا گنجینہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس سے اخلاق حسن کی کیا توقع کیجئے
شعر سے یعنی نہ جس بے حس کو لذت آ جئے

شعر بھی نیچر کی سحر کاریوں میں سے ایک سحر کاری ہے۔ اسی شاعرانہ طبیعت کا انسان تیز محسوسات رکھتا ہے۔ پھر عیب و ہنر نیکی بدی، جھوٹ سچ سب ہی باتوں کا اسے احساس ہوتا ہے۔ حسن و قبح سے وہ متاثر یا متنفر ہوتا ہے کسی بے حس دل کو پتھر کا ڈول سمجھو۔ اور ایسے دل والے سے کوئی توقع نہ رکھو۔ یہ بے حسی ہی تو ہے۔ جو آدمی کو کنجوس، فریبکار، بے حیا، سنگدل، کذاب ریاکار، نمائشی یا ابن الوقت بنا دیتی ہے۔ خودداری اس سے معدوم کر دیتی۔ اور صرف جاہ طلبی اس کا نصب العین بنا دیتی ہے۔

چنانچہ فطرت کی صنعت کاری کا اثر جو میں نے خود شروانی صاحب پر دیکھا ہے یہ ہے کہ وہ بھونگیر کے دورے میں جاتے ہیں، میں ساتھ ہوں۔ بھونگیر کے آسمانی قلعہ پر جو صرف

فجر کی نماز جماعت میں بھی یہی دیکھا کہ عموماً وہ سب مصلیوں کے بعد مسجد سے باہر آتے۔ مغرب کی نماز کے بعد تسبیح پڑھتے۔ وہ ملاقات کے کمرے میں بیٹھتے۔ ملاقاتی ہوتے تو ملاقات کرتے ورنہ اخبار دیکھتے۔ رات کا کھانا عشا کی نماز پڑھ کر کھاتے۔ اس کے بعد مطالعہ شروع ہوتا اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک ہوتا رہتا۔ بعض اوقات میں کمیٹیوں کی شرکت، مدارس نیز دینیات کے معاینے، تقریبات۔ دعوتوں وتقریروں۔ وعظوں غرض ان سب ہی ضروریات کے لئے وقت نکال لیا جاتا۔

لطیفہ میں نے حیدرآباد میں اکثر دیکھا کہ مغرب کی نماز کی جس وقت شیروانی صاحب امامت کر رہے ہوتے تھے تو امراء وقت بعض بڑے عہدہ دار جن کا عموماً سررشتہ تعلقات سے تعلق تھا۔ ان میں ایسے بھی تھے کہ جو ولایت میں انگریزی تعلیم پائی تھی۔ نہایت آسودہ اور نے علم مغرب کی نماز میں شریک ہونے کے بجائے کرسیوں پر بیٹھے سگریٹ پیتے رہتے تھے ایک دن میں نے شیروانی صاحب سے کہا کہ آپ ان مسلمانوں کو ہدایت کیوں نہیں فرماتے کہ نماز کا احترام کریں۔ اور جماعت میں شریک ہوا کریں۔ اس پر شیروانی صاحب نے مجھے یہ جواب دیا۔ منتظم صاحب ان لوگوں کو ابھی ٹھوکر نہیں لگی ہے۔ ایک ٹھوکر میں یہ سیدھے ہو جائیں گے کسی کی ہدایت کی ضرورت نہیں اس کی تصدیق بہت جلد ہو گئی یعنی چند ہی روز کے بعد میں نے ایک کو ایسا نمازی پایا کہ ریل میں بھی ان کی تسبیح اور جا نماز کا پورا اہتمام رہتا تھا۔ یہ ٹھوکر کھائے ہوئے تھے۔

کثرت مشاغل شیروانی صاحب کی تحریر دل کے مجھ سے مجھ پر سوال طاری ہو جاتا تھا۔ ہر ایک مثل وہ خود پڑھتے اور سب احکام او تجویزیں اپنے قلم سے لکھتے امور مذہبی اور صدارت العالیہ کا کام انجام دینے کے ساتھ وہ عدالت العالیہ کے فاضل اور اہم دیوانی کے مقدمات میں ججوں کے افسر بنائے جاتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبوں کے وہ رکن تھے۔ کتب خانہ آصفیہ، دارالعلوم نظامیہ شعبہ تالیف وترجمہ دار الاشاعت کتب درسی کا احتساب، مختلف مصنفین مولفین کی تصنیفات وتالیفات اعلیٰحضرت معظم کو ناقدانہ تحریری رائے کا بھیجنا۔ مدارس کے معائنے دورے، الکنہ مذہبی کی پڑتال وغیرہ، مذہبی جلسوں میں وعظ۔ ادھر ہندوستان میں وقف کر بل۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلم یونیورسٹی کے شعبوں کی رکنیت۔ تعلیمی کانفرنس کی شرکت، صدارت کے خطبات۔ ندوۃ العلماء کے اہم امور میں عملی شرکت اپنے عظیم الشان تعلقہ اور کتب خانہ کی داشت ونگرانی۔ کثیر خط وکتابت سلسلۂ تالیف، دیوانوں۔ تذکروں اور مثنویوں

پر مبسوط مقدمات لکھنا۔ سواء خط کے مستقل رسالے بنا دینا۔ رسالوں میں مضامین لکھنا۔ اس کے ساتھ کتابوں کا مستقل مطالعہ۔ گویا وقت کا ہر ہر لمحہ کام میں لگا ہوا۔ اور ہمیشہ یہی دیکھا کہ وہ اپنے کام کرتے تھے جو کرنے کے لائق ہوتا تھا۔ نہ وہ کام جس کے کرنے کو جی چاہے۔ مطالعہ کا اندازہ کسی قدر اس سے ہو سکتا ہے کہ حبیب گنج کے کتاب خانہ سے میں نے بہت دفعہ کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھیں اور بہت سی پڑھیں لیکن کوئی کتاب ایسی نہ ملی جس میں پنسل یا قلم سے شیروانی صاحب کے مطالعہ، صحت یا رائے وغیرہ کے نشانات نہ پائے ہوں۔ ان کی معیت میں چھ سات سال کے دوران میں ہر سال حیدرآباد سے ہندوستان تو دو دفعہ آنا اور واپس جانا ہوتا تھا۔ اس طولانی سفر میں ان کا عزیز شغل مطالعہ رہتا تھا روزانہ اخبار ماہوار رسالے وغیرہ سب ہی کچھ پڑھ لیتے تھے۔ کتب خانہ آصفیہ سے ان کا مطالعہ کے لئے کتب تاریخ سیر اور تفسیر میں برابر منگاتا اور واپس کرتا تھا۔

دیانت اور تقوی حیدرآباد میں سرکاری کام ختم کر کے اپنے خانگی اور نجی کام میں شیروانی صاحب نے کاغذ روشنائی قلم اپنے ذاتی استعمال... کئے خود ان کی ذات کا تو ذکر ہی کیا ہے ان کی پیشی کے دفتر میں کسی اہل معاملہ کو یہ کبھی ہمت نہ ہو سکی کہ کسی ناجائز مطلب کے نکالنے کے واسطے رشوت تو درکنار کوئی معمولی سوغات یا تحفہ پیش کر سکتا۔

کسی بڑے امیر کی ایسی تقریب میں جہاں رقص وسرود ہو شیروانی صاحب کبھی شریک نہ ہوئے اور جہاں ایسا احتمال ہوتا وہاں دعوت دینے والے امیر سے بذریعہ تحریر پوچھا جاتا تھا کہ "کوئی ایسی ویسی تفریح تو نہیں ہے" چنانچہ جب حیدرآباد کے امراء کو یہ بات معلوم ہو گئی۔ تو ایسی تقاریب میں جہاں یہ خرافات ہوتے تو ہوتے وہ شیروانی صاحب کو مدعو کرتے ایسے ڈنروں، دعوتوں اور جلسوں سے جہاں کوٹ، پتلون۔ نیڈیاں انگریز اور ہندوستانی جنٹلمین جمع ہوتے شیروانی صاحب کو طرح پرہیز رہا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب کوئی "جنگ" یا "ملک" شیروانی صاحب کی ملاقات کو آیا تو سرکاری کام سے مجبوری تھی۔ مگر ان کو ایسی ملاقاتوں سے وہ لطف نہ آتا تھا جو علما سے ملاقات میں آیا کرتا تھا۔

بزرگان دین یا ان کے مزارات کا احترام کوئی شیروانی صاحب سے سیکھے میں نے ان کو حبیب عیدروس صاحب کے حضور میں حاضر ہوتے بھی دیکھا ہے۔ اور گلبرگہ شریف میں حضرت بابا گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر اور پھاڑی شریف کے حضرت شاہ شرف الدین اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے مزار پر،

خلد آباد شریف میں بھی شیروانی صاحب کی محوی حالت دیکھی ہے۔ اچھی قوالی کا ان پر یہ اثر ہوتا کہ وہ قطعی ساکت ہو جاتے۔

جمعہ کے دن کا خاص احترام ہوتا تھا۔ آج شیروانی صاحب سرکاری کام کو ہاتھ نہ لگاتے نماز جمعہ کی حیدرآباد میں خاص طور سے تیاری کی جاتی۔ عمدہ لباس، ملبا، عمامہ عطر میں بسے ہوئے اور اس پر شیروانی صاحب کا حسن صورت بس کچھ نہ پوچھیے حیدرآباد کی مکہ مسجد میں ہمیشہ جمعہ کی نماز پڑھتے۔ پہلی صف میں امام سے پیچھے ان کی جگہ خالی رکھی جاتی۔ لیکن میں نے ہمیشہ دیکھا کہ اگر تین چار صفیں بھر جانے پر وہ مسجد میں پہنچے تو پھر مصلیوں کو چیرا اور پھاند کر وہ اگلی صف میں کبھی اپنی خالی جگہ پر جانے بلکہ نہایت خاموشی سے کسی مناسب جگہ پر پیچھے ہی بیٹھ جاتے

حیدرآباد میں میں نے ہمیشہ دیکھا کہ اپنی تنخواہ جو دو ہزار تین سو روپے ماہوار تھی شیروانی صاحب نے کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھی۔ وہ روپیہ کی حقیقت سنگ ریزہ کی برابر سمجھتے۔ اکثر مقروض رہتے اور حبیب گنج سے برابر روپیہ منگاتے رہتے، کبھی وہ ایسے خالی ہاتھ ہو جاتے کہ مسافر نو مسلم حاجتمند کی امداد کو اپنے خادم سے قرض لیتے۔ بنا کر اپناتے تو عموماً استعمالی پرانے جو پرانے گفتنی پرانے ہو لیتے تقسیم کر دیئے جاتے یہ بات بھی میں نے اچھی طرح دیکھی کہ ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے عالموں کے وہ سب سے بڑے قدردان تھے۔ اس گروہ کی وہ انتہائی عزت کرتے تھے۔

لیکن ایک چیز کی شیروانی صاحب کو میں نے قدر و ہوس یا حرص دیکھی۔ وہ چیز نایاب بھی اور کمیاب، پرانی قلمی یا مطبوعہ کتاب وہ کسی قیمت پر نہ چھوڑتے تھے۔ مجھے صحیح اندازہ نہیں کہ کتابیں جمع کرنے میں انھوں نے کس قدر روپیہ صرف کیا۔ حبیب گنج کے اپنے کتاب خانہ میں ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا "منتظم صاحب یہ کتابیں میری چوالیس برس کی سعی کا نتیجہ ہیں۔"

تمام عمر میں شیروانی صاحب نے صرف ایک[۸] عمارت بنائی ہے۔ وہ بھی ان کی نہیں "خانہ خدا" ہے۔ حبیب گنج میں جا کر اس خانۂ خدا کی جلوہ ریزی دیکھو۔ خصوصاً جب کہ بھادوں برس رہی ہو اور کالی گھٹائیں چڑھی ہوں یا طلوع آفتاب سے پہلے یا چاندنی رات میں۔

رمضان المبارک میں شیروانی صاحب اپنی کوٹھی کے احاطہ میں ہمیشہ بہترین حافظوں سے دو قرآن مجید جماعت کے ساتھ سنتے، اور حافظوں کو نہایت معقول نذرانے اور خلعت دیتے جماعت میں ان سے بائیں ہاتھ کو میری جگہ مقرر تھی۔ وہ عموماً عطر میں ایسے بسے ہوتے تھے کہ تیز خس کے عطر کی خوشبو سے جماعت مہک جاتی۔ اور کبھی کبھی مجھ کو چھینکیں نہ تکتیں

یہی حالت افطار کے موقعوں پر ہوتی اور افطار کے جلسہ میں سب سے زیادہ بشاش وہی ہوتے، رمضان کا فریضہ وہ نہایت اہتمام اور خوشی سے ادا کرتے۔ وہ نہ تمباکو کھاتے ہیں نہ حقہ پیتے ہیں۔

ربیع الاول شریف میں مجالس عید میلاد شروع ہوتیں یہ سلسلہ ربیع الثانی تک حیدرآباد میں جاری رہتا۔ اور جس پیمانے پر یہ مجالس ہوتیں حیدرآباد کو یہ بات پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ شیروانی صاحب ان جلسوں کے صدر ہوتے۔ ان جلسوں میں انھوں نے نہایت معرکۃ الآرا وعظ کئے۔ اعلیٰحضرت بھی بعض جلسوں میں شرکت فرماتے، شیروانی صاحب ان ایام میں حیدرآباد کے مسلموں میں محبوب ترین ہستی تھے۔ ربیعین میں راتوں کو تعمیر اور سنیما خانے عموماً مسلمانوں سے خالی ہو جاتے، اسلام نے ایک عملی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ بعض مجالس کے حالات میں نے منظوم کئے ہیں اور اکثر وعظوں کے نوٹ میرے روزنامچوں میں محفوظ ہیں۔

حیدرآباد میں خدمات کا مختصر کارنامہ

جن لوگوں نے شیروانی صاحب سے پہلے حیدرآباد کے محرم، رمضان، اور ربیعین وغیرہ دیکھے ہیں اور حالات مذہبی پر نظر کی ہے اب وہ اسی حیدرآباد کو شیروانی صاحب کی صدر الصدوری کے زمانے میں دیکھیں، اور دونوں حالتوں کا مقابلہ کریں۔ اگر صدر المہام فینانس جو اب ایک مسلمان ہے۔ مسٹر گلانسی عیسائی انگریز سابق صدر المہام فینانس کی طرح مالی معاملات میں صیغہ امور مذہبی کے ساتھ کشادہ دلی سے پیش آتا تو میں بڑے بڑے اسلامی رفاہ وترقی کے واقعات دکھا دیتا۔ کیونکہ میں اسی امور مذہبی کے صیغہ کا سب سے بڑا سررشتہ دار تھا۔ اور ہر بات میرے ہاتھ سے ہوتی تھی، لیکن پھر بھی اس گئی گذری مالی حالت میں شیروانی صاحب نے جو کچھ کر دکھایا وہ نہایت اختصار کے ساتھ حسب ذیل ہے۔

محرم کی بدعات شنیعہ یعنی مسلمانوں کا شیر، ریچھ، بھیڑیے بننا۔ تاڑی سیندھی کے نشہ میں چور ہجوم وہنگامہ آرائیاں اور بدمستیاں کرنا عورتوں کی اس بدمستی میں بے حرمتی کر ڈالنا وغیرہ ایسی سب باتوں کی ایسی جڑ کاٹ دی کہ پھر ان باتوں کا عود کرنا ناممکن ہو گیا۔ تاڑی وسیندھی پیتے جانا اور اسی حالت میں میلاد خوانی کرنا ڈھلکی بھونڈی اردو میں نعت خوانی۔ بانی مجلس کا تاڑی اور سیندھی دیگر ان بدبخت میلاد خواں کو رات بھر تینا پلاتے چھوڑنا اور خود گھر میں جا کر سو رہنا معدوم کر دیا گیا۔ یہ اس طرح کیا گیا کہ ان میلاد خوانوں کے طائفے صدارت العالیہ میں طلب کئے گئے۔ ان کی جانچ کی گئی اہل کو میلاد خوانی کی باضابطہ اجازت دی گئی۔

[۸] سنہ ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس روڈ پر حبیب منزل بنوائی جو اپنی لفاست وخوبی میں اپنی نظیر آپ ہے۔

مکاتیبِ شروانی

بنام ڈاکٹر مولوی عبدالحق

سید الطاف علی صاحب بریلوی بی - اے (علیگ) سابق سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ و حال سکریٹری آل پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (کراچی)

(کلی ہوئی) انجمن ترقی اردو کا تقسیم کے بعد جب چراغ گل ہوا تو انجمن کا پورا پچاس سالہ سامان دفتر اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا تمام تر ذاتی سرمایۂ علم و ادب بھی دست برد اغیار کا شکار ہو گیا۔ یہ درد انگیز داستان بہت طویل ہے۔ بہرحال کسی کسی طرح انجمن علی گڑھ میں منتقل ہوئی۔ اور راقم کی دیرینہ خواہش اور کوشش سے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر دفتر کی عمارت سلطان جہاں منزل اس کا مستقر قرار پایا۔ ہزارہا مطبوعہ اور نادر قلمی کتابوں، سیکڑوں رجسٹروں اور فائلوں اور متفرق کاغذات کا ایک انبار بارہ ٹرکوں میں آیا۔ سکھ ڈرائیور بڑی بے دردی سے عمارت کے پاس سڑک اور برآمدے کی سیڑھیوں پر ان سب چیزوں کو پھینک کر چلے گئے۔ جناب قاضی عبدالغفار صاحب جدید ناظم انجمن اور ان کے رفقاء کئی ماہ کی محنت شاقہ کے بعد کتب خانہ اور دفتر کو ترتیب دے سکے۔ صبح سے شام تک کاغذات چھانٹے جاتے۔ اور رات کو ردی کا ڈھیر نذر آتش کیا جاتا۔ یہ عمل ہفتوں جاری رہا۔ جلنے والی ردی میں سے جب ادھر کو گزر ہوتا تو جو چیز میرے مطلب کی ہوتی مجھے مرحمت ہو جاتی۔ میری یہ فتوحات ۶۳ خطوط پر مشتمل ہیں۔ جو مشاہیر ملک اور نامور اہل علم و ادب نے جناب مولوی صاحب کو وقتاً فوقتاً تحریر فرمائے تھے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر (۱۲) ڈاکٹر برکت علی قریشی (۳) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (۱) سر عبدالرحمن (؟) مسعود (۱) حافظ محمود شیرانی - (۱)، سید احتشام عالم مارہروی (۲) ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری (۱) صفدر مرزاپوری - (۱) مرزا فرحت اللہ بیگ (۱) نیاز فتحپوری (۱) علامہ سلیم پانی پتی (۱) ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱) سر سید علی امام (۱) مولانا عبدالماجد دریابادی (۳) نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی (۱) مولوی عبدالعزیز فلکپیما (۱) سر تیج بہادر سپرو (۱) پنڈت سندر لال (۱) گاندھی جی (۲)

دنیائے علم و ادب میں ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کا جو مقام ہے نیز حال ہی میں "غبار خاطر" اور "کاروان خیال" سے جو شہرت دوام ان کو حاصل ہوئی - اس کی بنا پر ایک ہی مکتوب الیہ کے نام ان کے خطوط کا مجموعہ ایک نادر سرمایہ سے کم نہیں۔ علاوہ بریں مکتوب الیہ بھی ایک مرکزی شخصیت ہیں۔ اس لئے قلم کی شوخی خیالات کی ندرت اور حسن بیان کی رعنائی قابل دید ہے نواب صاحب اپنی تحریر میں اختصار و ایجاز کے بادشاہ تھے۔ اس خصوصیت کو نگاہ میں رکھ کر اگر خطوط کو دیکھا گیا تو ان کا لطف دوبالا ہو جائیگا۔

الطاف نہ قرا جناب مولوی عبدالحق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کل الطاف نامہ پہنچا ممنون کرم ہوں۔ حیدر آباد میں ڈیڑھ سو افسر کا قصیدہ تحریر ہو رہا ہے۔ نا شعری نئیں کم سے کم خطوط پچاس کی ہر ہوتی ہے۔ گویا عیسائی ارباب ہر مرداپنی مسیحائی دکھانے کے لئے اچھے نامے خطوط کو مردہ کرتے ہیں۔ اور پھر زندہ کر کے مکتوب الیہ سے مدد لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ مجاز اور کافی تحریر ہوتا ہے۔ کاغذ کا پرچہ بیچارہ کیا ہے قوموں کے اور ملکوں کے زندہ و مردہ ہونے کے شعبدے آج کل شب و روز دکھائے جا رہے ہیں۔

زندہ کنی عطائے تو
ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو
ہر چہ کنی رضائے تو

مقدمہ آپ کو پسند آیا۔ اس سے اطمینان ہوا۔ مزید اطمینان اس سے ہوا کہ تاخیر کی تلافی بھی ہو گئی۔ ایک امر حق ظاہر کرنا ضروری ہے۔ مقدمہ نگاری کا اگر کچھ سلیقہ ہے تو وہ آپ ہی سے سیکھا ہوا ہے۔ آپ کے متعدد مقدمے میں نے مطالعہ کے ساتھ پڑھے ہیں اور ان سے جو فیض حاصل ہوا۔ اس کا وہ ظہور ہے جو آپ کے پیش نظر ہے۔ مجھ کو دلی مسرت اس سے ہوئی کہ ایک سرمایۂ ناز باکمال کا دامن الزام سے پاک ہو سکا۔

پیارے میاں کو بحمد اللہ افاقہ برابر ہو رہا ہے۔ صبح ٹمپریچر ۹۷ ۴/۳ تھا۔ ہر روز تھوڑا تھوڑا ٹمپریچر کم ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ جلد بفضلہ طبیعت اعتدال پر آ جائے گی۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ اورنگ آبادی انگور آپ کا کرم یاد دلاتے ہیں۔

نیاز مند - حبیب الرحمن

مکرمی السلام علیکم - شکر کرم - بحمد اللہ بخیریت یہاں پر آ گیا۔ اس عرصہ میں ایک مرتبہ نکات الشعرا الطاف نامہ آنے سے پہلے نکال کر دیکھا چکا ہوں۔ تاخیر کا بار بھی محسوس کرتا ہوں۔ مگر فرصت ساتھ نہیں دیتی۔ بلحاظ موسم صبح کو سرکاری کام ہوتا ہے۔ شام کا وقت کمیٹیاں لے لیتی ہیں۔ گذشتہ ہفتہ میں مدرسہ نظامیہ کتاب خانۂ آصفیہ۔ جامعہ عثمانیہ سرسری دیکھاں کیں، دوشنبہ کو تعطیل تھی۔ صبح کا وقت مکہ مسجد میں جلسہ امتحان حفاظ نے اور شام کا عرس نے لیا۔ موسم کے لحاظ سے راتیں لکھنے پڑھنے کی نہیں ہیں۔ دو روز سے مروج الذہب کے ترجموں کو دیکھ رہا ہوں یہ داستانِ مصروفیت ہے۔ تاہم گوشۂ خاطر نکات الشعرا کی طرف ہے۔ دل چاہتا ہے کہ عنقریب آپ کو اطلاع دوں۔ کہ میں نے لکھنا شروع کر دیا۔

یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش ست
تو بدیں آرزو مرا برساں

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ کیا ملاقات کی کوئی صورت ہے۔

نیاز مند حبیب الرحمن

حیدر آباد ۲۴ شعبان المعظم ۱۳۳۹ھ

یک شنبہ

حیدر آباد ۲۷ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ

مکرمی - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل تذکرۂ حسن کا نسخہ ہدیۃً پہونچا عصر سے مغرب تک پڑھا۔ مغرب سے عشاء تک اب صبح سے پڑھ کر یہ خط لکھ رہا ہوں ابتدائی حصہ بطور مطالعہ پڑھا باقی سرسری دیکھا۔ نگاہ طرز ادا سے آگاہ ہو گئی۔ میر اور حسن میں جو فرق ہے۔ وہ ہویدا ہو گیا۔ میر صاحب کے یہاں مطالب ہیں اور مضمون۔ میر حسن کے یہاں عبارت آرائی ہے۔ اور رائے۔

جس قدر دل پر میر اثر کے کلام نے اثر کیا کسی کلام کا نہیں ہوا۔ اس شعر کو سنئے کیا قیامت ہے ؎

کچھ سے کچھ کر دیا ترے غم نے
پھر جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

سوا دلی کے اہل دل کے کوئی یہ شعر کہہ سکتا ہے۔ اس شعر کو پڑھ کر کل مغرب کی نماز پڑھی دل نے وہ لطف پایا جو کمتر پایا ہوگا۔ ستم ظریف کہتے ہیں کہ ہماری شاعری لغو ہے۔ کیا اثر کا کلام آپ کو ملا ہے۔ نہ ملا ہو تو تلاش کیجئے۔ اگر تلف ہو گیا تو اردو کا بڑا سرمایہ ہاتھ سے جاتا رہا۔

رامپور کو خط لکھ دیا ہے۔ جواب آنے پر انشاء اللہ آپ کو پھر لکھونگا۔

نیاز مند

حبیب الرحمن

مکرمی السلام علیکم

امید ہے کہ آپ مع الخیر اورنگ آباد پہنچے اردو خطبۂ صدارت کے متعلق مطالعہ اور انتخاب میں مصروف ہوں۔ مسلمان مؤلفین و شعراء کا تو خاصہ ذخیرہ دستیاب ہو گیا۔ ادھر ادھر سے بھی باتیں ہاتھ لگ جاتی ہیں۔ مثلاً جولائی سنہ حال کے اسلامک کلچر میں اٹھارویں صدی کے وسط میں آسام میں اردو زبان کے رواج کا واقعہ مندرج ملا۔

ضرورت ہے کہ مسلمان مؤلفین و شعرا کے ہمعصر ہندوؤں کے کلام کا پتہ لگے۔ تاکہ نمونہ بالمقابل لکھ کر دکھلایا جائے۔ کہ دونوں کی زبان ایک تھی۔ آپ اس میں رہنمائی کر کے ممنون فرمایئے۔ اگر آپ کے یہاں کچھ کتابیں ہیں تو مؤلف کے نام و حال مختصر کے ساتھ نمونہ کلام عنایت ہو۔ آپ نے ولی رام ٹ ہمدانی کے کلام و احوال کی سنانے تفتیش کی تھی۔

ایک بات اور ہے دکن کی عالیہ خدمات ادب کے سلسلے میں نستعلیق ٹائپ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگر مختصر سا نوٹ اس کے متعلق کہ کس طرح اس تجویز نے رفتہ رفتہ ترقی کی۔ کہاں تک مرحلہ طے ہوا۔ منزل کسقدر باقی ہے۔ تحریر فرما دیا جائے۔ تو عین کرم۔

زحمت تو بار دی جاتی ہے۔ مگر کام آپ کا ہے۔ جو ہوئے گئے پڑا ہے۔ حیدر الحکیم نے رحلت فرمائی۔ شرر کے بعد یہ اور صدمہ اردو کو پہونچا۔ ان کا جانشین جامعہ کو مشکل سے ملے گا۔ کیونکہ ان کا سا علم اور ان کی سی صحبتیں کسی کو نصیب ہوں تو جانشین بنے۔ بظاہر تو

ایک پتھر کی چٹان پر کسی پرانے زمانہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ صرف تفریح اور تاریخی تحقیقات کی غرض سے پہونچے۔ کہ اس رفیع الشان چٹان پر ہم چڑھنا شروع کرتے ہیں۔ راہ میں ٹہرتے اور دم لیتے جاتے ہیں۔ آخر میں جب ہم بڑی بلندی پر پہنچتے ہیں۔ شروانی صاحب چٹان کے ایک شگاف میں پانی بھرا پاتے ہیں جس میں نیلوفر کے صرف دو پھول کھلے ہوئے ہیں یہ پھول دیکھتے ہی شروانی صاحب پر عجیب حالت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اس بلند پہاڑی کی خشکی، پہر میاں پانی، پانی میں نیلوفر نیلوفر کی شادابی پر حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ انکا برقی خیال صانع حقیقی کی قدرت اور صنعت کی طرف جا پہونچتا ہے۔ وہ اس مقام پر ہر بر واہ تے ہیں۔ اور اسی مبحث پر عجیب موثر پیرایہ میں گفتگو کرتے ہیں۔

حبیب گنج کے اپنے بے نظیر باغ کے چمن میں وہ ٹہل رہے ہیں جنوری کا مہینہ ہے۔ گلاب ایسا کھلا ہوا ہے کہ چمن میں گویا آگ لگ رہی ہے۔ بس وہ کسی شاداب پھول اس کے گہرے ہلکے رنگوں اور اس کی نزاکت پر غور کرتے، اور صانع حقیقی کے کمال اور قدرت کے خیال میں غرق ہو جاتے، پھر مجھ کو ایک ایک باریکی اور مصور قدرت کی قلم کاری سمجھاتے پھرا اور اسی حال میں میں سودا کا یہ شعر پڑھتا ہوں۔

رنگ گل ہے بے طرح دہکے ہے حسن اڑا ابر باہ
آشیاں میرا بھڑک لگتی ہے اب گلشن کہ تو

چمن کے حقیقی حسن نے ان پر شور سنکر ان کا دل ایک اضطرابی ولولہ سے بھر جاتا ہے کسی سایہ دار درخت کسی بیل کسی پھل میں بس گویا خود صانع حقیقی کی قدرت گویا شروانی صاحب پر حچھے گئے تھے ہم دو سروں سے کے دیت کمیٹی کے کنارے بھی کھڑے ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ جہاں تک نظر جاتی ہے زرد پھولوں کا ایک زعفران زار ہے۔ نظر دوڑ جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ روحانی لذت اس سے شروانی صاحب ہی کو ہوتی ہے۔ کیونکہ جمال میں ۰ جمال آرا کا مشاہدہ فرما رہے ہیں۔

حیدرآباد کی کوٹھی امید منزل کے احاطہ میں عزیزی عبدالوحید خاں نے پتھر سے ایک دفعہ ایک چڑیا مار دی، ایسی حسین چڑیا ادھر شمالی ہندوستان میں نہیں ہوتی۔ اس شہید بے گناہ کو شروانی صاحب نے دیکھا اور انھوں نے ایک عجیب انداز سے فرمایا "وحید کس دل سے تم نے اسے مارا۔ کیا اس کا حسن بھی اس کا سفارشی نہ ہوا کس قدر تاسف کا مقام ہے۔ کہ قدرت کا یہ حسین نقش کوئی یوں مٹا دے"

یہ ذرا ذرا سی باتیں ہیں جو شاید عبدالوحید خاں کو یاد رہی ہوں گی۔ نہ شروانی صاحب کو خیال رہا ہوگا۔ لیکن میرا جاسوس روز تا مچہ اس حسین چڑیا کی شہادت پر ہمیشہ مرثیہ خواں رہے گا۔

اور شروانی صاحب کی رقیق القلبی پر گواہی دیگا مختصر یہ کہ میں نے شروانی صاحب میں ایسی ایسی پاک صفتیں دیکھی ہیں کہ جن کی غالباً ان کو خود خبر نہیں۔ اور اگر اپنے روزنامچوں سے ان کی پوری تفصیل کروں تو یہ اعتراف ایک بڑی کتاب بن جائیگا۔

اور تو اور شروانی صاحب کا یہ طریقہ تعلیم خیرات تو دیکھو کہ غریب بچوں کو حبیب گنج کی گڑھی میں خود اپنے ہاتھ سے پیسے نہیں بانٹتے۔ بلکہ اپنے چار برس کی عمر کے پوتے سے یہ پیسے بٹواتے ہیں۔ یعنی پوتے کو خیرات دینے کی تعلیم گہوارے میں دی جاتی ہے۔ مرحبا۔

نمود و نمائش سے نفرت اور عام اخلاق

شروانی صاحب کو رواجی شہرت کی نہ آرزو ہے نہ جستجو اس کی کثرت سے مثالیں میں نے دیکھی ہیں یعنی بڑے صاحبزادے خان بہادر محمد عبید الرحمن خاں سلمہ اللہ تعالےٰ کی شادی ہوئی۔ تو یہ شادی بڑے اونچے پیمانے پر ہوئی تھی۔ لیکن کسی انگریز کو دعوت یا گارڈن پارٹی میں میں نے نہ دیکھا۔ شمس العلماء کا خطاب انھوں نے نہ لیا۔ اور سرکاری تجویز ابتدا ہی میں نامنظور کر دی۔

سرکار آصفیہ کے خطاب نواب صدر یار جنگ کی انھوں نے اس لئے قدر کی کہ اسلامی سرکار سے اس کا واسطہ تھا۔ اور یہی نقطہ نظر اس موقع پر ملحوظ تھا حقیقی شہرت کا صحیح مفہوم وہ سمجھتے رہے ہیں۔ احسان کر کے نہ احسان جتاتے ہیں نہ محسن کے سے کبھی تیور اختیار کرتے رہے ہیں۔ تعلیم اسلام کا ان پر گہرا عملی رنگ چڑھا ہوا ہے کتب سیر اور احادیث میں شمائل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انھوں نے بے کار مطالعہ نہیں کیا ہے صرف ادائے فرض اور مخلوق کے ساتھ بھلائی ان کی زندگی کا مقصد ہے جس میں ریا اور نمائش کو دخل نہیں۔ اور اس زمانہ میں سب سے بڑی اور سچی یہی تعریف ہے۔ جو کسی کی کی جا سکتی ہے۔ ان کی نیکیوں میں ایسی قوت ہے کہ "اہل" ہم نشیں پر اپنا رنگ چڑھا دیتی ہے اور یہ بات شروانی صاحب کے اخلاص اور صداقت کا بین ثبوت ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ شروانی صاحب بھی صرف ایک انسان ہیں۔ فرشتہ نہیں۔ دنیا میں جتنی بڑی ہستی کا انسان ہوتا ہے اسی قدر اس کی طرف نگاہیں اٹھتی ہیں اور اس گروہ میں ایک بھی انسان ایسا کم کو تاریخ میں نہیں ملتا جس کو سب نے اچھا کہا ہو۔ اچھے انسان کی یہ پہچان ہے کہ لسے صاحب تمیز، انصاف کی اہلیت رکھنے والے

اور بے غرض لوگ اچھا کہیں۔ انسان کسی دوسرے انسان کو اکثر اپنے ذاتی جذبات یا اغراض کی عینک سے بھی دیکھا کرتا ہے اور کبھی اغراض رشک وحسد یا خود اپنے نفس کی خباثت سے۔ عینک غبار آلود ہو جاتی ہے جس سے نورانی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں بلکہ دھندلی اور گرد آلود نظر آتی ہیں بس خطا نورانی چیزوں کی نہیں ہوتی۔ تقصیر غبار کی عینک کی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس اعتراف میں جس پہلو کی شروانی صاحب کی تصویر نہایت دیانت داری سے دکھائی گئی ہے وہ ناظرین کے سامنے ہے۔ اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اب ناظرین دوسرے دولت والے امیر کبیر مسلمانوں سے جن سے ناظرین اچھی طرح واقف ہوں۔ شروانی صاحب کا مقابلہ کریں اور اگر یہ مقابلہ و موازنہ کرنے والے انصاف فرمائیں گے۔ تو ضرور ایک سبق آموز نتیجہ پر انشاء اللہ تعالےٰ پہونچ جائیں گے۔

آخر میں نازک خیالوں سے میری یہ گزارش ہے کہ میں نہایت تنہائی پسند اور قریب قریب وحشی انسان واقع ہوا ہوں۔ امراء کے پاس حاضر ہونے کو بہت سے عقلمند موجب فخر یقین

کرتے ہیں۔ لیکن میں امراء سے بہت ڈرتا ہوں شروانی صاحب سے میری عادت اچھی طرح واقف ہیں۔ بڑی سادہ لیکن نہایت معروف زندگی انھوں نے ترتیب دی ہے صرف اوائے فرض کو میں نے خوشامد کا قائم مقام یقین کیا ہے۔

لیکن اس بیگانہ روش پر شروانی صاحب نے مجھ پر بڑی بڑی مہربانیاں فرمائی ہیں بس یہ اعتراف صرف وہ وجوہ سے میں نے کیا ہے کہ کچھ تو ادائے شکر گذاری کا فرض پورا ہو جائے اور دوسرے ناظرین یہ دیکھیں کہ بڑے فضل و علم اور مرتبہ اور دولت کا اصل مسلم کیسا ہوتا ہے۔ امراکو میں اپنی طرح فقیر اور درماندہ سمجھتا ہوں جن کو میری ہی طرح بھوک پیاس لگتی ہے اور میری طرح ان کے درد سر بھی ہو سکتا ہے اور یہ میں نے شروانی صاحب سے سیکھا ہے جنھوں نے حیدرآباد کی ایک عظیم الشان مجلس میں اپنی تقریر کے درمیان میں فرمایا تھا۔ صاحبو! اپنے نفس سے محاسبہ کرنے کی عادت ڈالو یہی تم کو بتلائے گا کہ تم جسقدر بڑا اپنے تئیں خیال کرتے ہو۔ اسی قدر زیادہ تم درماندہ عاجز اور محتاج ہو۔ یہی عادت آدمی کو انسان بناتی ہے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے"

اسرار حسرت

(حسرت شروانی مرحوم)

پھول فرقت میں تری خار ہوئے جاتے ہیں | ہلکے پھلکے ہیں مگر بار ہوئے جاتے ہیں
کھو جاتے ہیں تری یاد میں کونین کو ہم | کام کی بات ہے بیکار ہوئے جاتے ہیں
تلے جاتے ہیں مگر قتل پہ ابروئے مژگاں | کیسے نشتر ہیں کہ تلوار ہوئے جاتے ہیں
یاد آتی ہے جو رہ رہ کے وہ چشم مخمور | آج توبہ پئے سرشار ہوئے جاتے ہیں
دھوم ہے دست شفا کی تری چشم بیمار | اچھے اچھے ترے بیمار ہوئے جاتے ہیں
فیض قاتل سے یہ ہے جوش شہادت طلبی | خضر بھی زیست سے بیزار ہوئے جاتے ہیں
تابش حسن سے خیرہ ہے نگاہ مشتاق | وہ عیاں ہیں مگر اسرار ہوئے جاتے ہیں
نگہ ناز سے ساقی کے ہیں دل چکنا چور | ٹوٹتے ٹوٹتے انبار ہوئے جاتے ہیں

ٹپکی پڑتی ہے نگاہوں سے مری حسرت دید
فاش حسرت مرے اسرار ہوئے جاتے ہیں

عہ مسٹر ریاض الرحمن خاں شروانی ایم۔اے جواب خدا کے فضل سے ۲۷ سال کے ہیں۔ شاہد شروانی

خطوطِ مشاہیر!

بنام نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب حسرت شروانی

چند مشاہیر کے مکاتیب درج ذیل کرنیکا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ناظرین کرام نواب صاحب مرحوم کی شخصیت کا اندازہ کرسکیں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوب خلوص کے سوا باقی سب خطوط تقریباً نصف صدی قبل کے ہیں۔ اور ان حضرات کے ہیں جو اپنے وقت کے محترم اور اکابر مشاہیر میں سے تھے۔ خود امام الہند جب شیفتہ علیہ التمام کی منزل میں تھے۔ مرحوم کا شمار مشاہیر ہند کی صف اول میں ہوتا۔ اور جب سفر آخرت اختیار کیا تو امام الہند جبل شہرت کے زروۂ اعلیٰ پر متمکن تھے۔ ——— "شاہد شروانی"

سخنور گرامی گہر —
سلام مسنون اخلاص و سپاس مشحون۔ مکرمت نامہ آیا ممنون التفات فرمایا۔ سب سے مقدم آپ کی تحریر جواب مسئولات میں آئی جس کو دیکھ کر بحمد اللہ نہایت مسرور ہوا۔ اور واجب ہوا کہ تہ دل سے شکر گزاری کرے۔ اہل الرائے کی رائیں کمیٹی میں پیش ہوکر، رد و قبول کا فیصلہ ہوگا کمیٹی دفتر امیر اللغات میں سکرٹری ان کو منتقل کرتا جائے گا۔ کمیٹی جب فیصلہ کرے گی تو امر منفصل نمبر ار مولف ہوگا۔ میں آخر میں مکرراً آپکی عمدہ توجہ کی سپاس گزاری کرتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ آپ اپنی عمر اور عنوان، حالات اور حالات کیفیات سے فورکر آگاہ کریں۔ اس لئے کہ ممنون اپنے محسن کے حالات سے بے خبر نہ رہے اور نیچ کے حالات سے بھی واقف ہوجائے۔

والسلام بالاکرام

سراپا تقصیر امیر نفقیر
ار دسمبر ۱۸۸۸ء

گرامی گہرا۔ سلام مسنون اخلاص و دعا مشحون۔ سواد تحریر سراپا تنویر، سرگش دیدۂ منتظر ہوئی۔ کم فرصتی سے جواب نہ دے سکا۔ کیفیت آپ کی معلوم ہونے سے بہت مسرور ہوا۔ کہ تھوڑی عمر میں بہت کچھ آپنے سیکھا ہے۔ اللہم زد

اگرچہ مجھ کو کثرت کار سے فرصت نہ تھی، مگر یہ غزل اور سہرا میں نے دیکھ دیا اور کچھ تھوڑا ثبات کیا کہ پہلی بار آپ نے بھیجا ہے اگر عذر کردں تو شاید خاطر نازک پر گراں گزرے۔ امید ہے کہ مجھ پیرانہ سال خستہ حال کو آپ اپنی عمر اپنے اقبال اپنے کمال کا ترقی خواہ تصور کریں۔ اور کبھی کبھی یاد فرمایا کریں۔ اور اپنے ابا و عم زاد و جد ہا کی خدمت میں میرا سلام کہیں۔ والدعا۔

امیر نفقیر مینائی
۱۵ر دسمبر ۱۸۹۹ء

دہلی ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۸ء

صدیق مکرم۔! نامہ گرامی کے لئے شکریہ خواستگار معافی ہوں کہ جواب میں تاخیر ہوئی ۱۵ر دسمبر دالی اطلاع صحیح نہیں ہے۔ ابھی کوئی تاریخ متعین نہیں ہوئی۔ جب کبھی موقعہ پیدا ہوگا آؤنگا۔ اور ملاقات سے شاد کام ہونگا۔

حبیب منزل میں قیام کی دعوت کے لئے شکر گذار ہوں۔ لیکن کیا اس کی ضرورت تھی؟ آپ دعوت دیں یا نہ دیں اگر کہیں ہوسکتا ہوں تو وہ صرف آپ ہی کا کاشانۂ محبت ہے۔

دریں شہر سعدی سے شناسیم و بس
ملا صاحب کو سلام شوق۔

ابوالکلام

مخدوم و مکرم خانصاحب۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ لاہور ہوتا ہوا مجھے یہاں ملا۔ میں ایک معیت میں مبتلا اس وقت لاہور سے ایک ہزار میل کے فاصلہ پر برٹش بلوچستان میں ہوں۔ آپ بھی خدا کی جناب میں دعا کریں کہ اسکا انجام اچھا ہو۔ آپ کا خط حفاظت سے صندوق میں بند کردیا ہے نظر ثانی کے وقت آپ کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اگر آپ میری ہر نظم کے متعلق آپ اس قسم کا خط لکھدیا کریں۔ تو میں آپ کا نہایت ممنون ہونگا

آپ کا اقبال
از فورٹ سنڈیمن، برٹش بلوچستان
۲۳ر مئی ۱۹۰۳ء

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ خانصاحب

السلام علیکم۔ آپ کا نوازش نامہ آج صبح ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج مجھے اپنے ٹوٹے پھوٹے اشعار کی داد مل گئی۔ بعض بعض جگہ جو تنقید آپ نے فرمائی ہے بالکل درست ہے۔ بالخصوص لفظ "جیجو" کے متعلق مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے۔ میرے اصل مسودہ میں جو ایک دوست نے لکھا تھا غلطی سے "تو" کی جگہ "جو" لکھا گیا۔ وہیں سے کاتب نے نقل کی۔ (میری ہستی ہی تو تھی الخ) مجھے خوب یاد ہے۔ کہ میں نے "تو" ڈکٹیٹ کرایا تھا۔ "طور پر تم نے جو اسے حضرت موسیٰ الخ" اصل مصرع

"طور پر تو نے جو اسے دیدۂ موسیٰ دیکھا"

ہے۔ کاتب نے یہ سمجھ کر پیغمبروں کے نام کے ساتھ حضرت آیا کرتا ہے یہ لفظ لکھ دیا۔ اور اصل کو زور عادت کی وجہ سے نظر انداز کردیا مجھے خوب معلوم ہے کہ اس نظم کے بعض دیگر اشعار میں بھی کچھ قابل اعتراض باتیں ہیں۔ اس سال مجھے امید نہ تھی کہ میں کوئی نظم پڑھ سکوں گا۔ بی اے کے امتحان کے پرچوں سے فراغت نہ ہوئی۔ طبیعت کو یکسوئی کس طرح نصیب ہوتی۔ یہ نظم جلسہ سالانہ سے تین روز پہلے لکھی گئی۔ اور ہفتہ کی شام کو مطبع میں بھیجی گئی۔ رات کو کاتب نے لکھی اور جلدی میں بندوں کی ترتیب میں بھی غلطی کر گیا۔

میں نے اس کا ایک مصرع بھی اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا۔ بلکہ جلدی میں جو کچھ ذہن میں آیا ڈکٹیٹ کرتا گیا۔ ان حالات کی وجہ سے بعض بعض اشعار میں کچھ نقص رہ گئے لفظ "جیجو" کے بارے میں خصوصیت سے آپ کا مشکور ہوں۔ کیونکہ یہ بات میرے خیال میں مطلق نہ تھی۔

آپ نے جو ریمارک اس کے اشعار پر لکھے ہیں ان کے لئے آپ کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ لوگ نہ ہوں تو ہم لقد شعر کہنا ہی ترک کردیں۔ اگرچہ جلسہ میں ہر طرف سے دگر حسب معمول ان کی تعریف کرتے تھے۔ مگر جو مزا آپ کی داد سے ملتا ہے اسے میرا دل ہی جانتا ہے افسوس ہے کہ آپ تشریف نہ لاسکے۔ میرزا بھی تشریف لائے تھے۔ چودھری خوشی محمد تھے۔ مولانا گرامی بھی تھے۔ غرضکہ محفل احباب کے سب اراکین مشیدہ موجود تھے۔ اگر آپ ہوتے تو ایک ادھوری رات خوب گزر جاتی۔ "حبیب" کی موجودگی شعراء کے لئے کافی سامان ہے۔ اور بالخصوص جب کہ حبیب شعر فہم اور شعر گو بھی ہو۔

ایف۔ اے کے امتحان کے پرچے مضمون تاریخ یونان و روم کے دیکھ رہا ہوں سامنے بنڈل رکھا ہے۔ اور نتیجہ بھیجنے میں چار دن کا عرصہ باقی رہ گیا ہے۔ لہذا مجبوراً بس کرتا ہوں۔ معاف کیجئے گا۔

آپ کے مخزن میں میری دو غزلیں نئی طبع ہونگی۔ امید ہے کہ آپ پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔

مولانا گرامی میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں، پوچھتے ہیں خط کس کو لکھ رہے ہو میں کہتا ہوں "حبیب" کو تو آپ فرماتے ہیں میرا بھی سلام لکھدو۔ آخر شاعر ہیں نا؟

والسلام
آپکا مخلص۔　　اقبال

ڈیر خانصاحب

ندوۃ العلماء چمن ہے۔ تو آپ اس کے پھول ہیں اور اگر زیادہ بامعنی ہونا چاہوں تو آپ اس کے بلبل ہیں۔ میں نے آپ کی تصنیف کی بہت قدر کی۔ نہ صرف اس سبب سے کہ وہ محض انڈکس نہیں ہے جس میں علماء اور کتب اردو یا دو امصار کے نام لکھ دیئے گئے ہوں۔ جن سے اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہو کہ مؤلف مصنف کو بہت سی کتابیں حوالہ دینے کے لئے میسر آئیں۔ اور شاید ورق گردانی میں اس نے محنت بھی کی۔ لیکن پڑھنے والے کی نہ عقل بڑھے۔ نہ دائرۂ معلومات مفیدہ۔ بجز اس کے کہ وہ مؤلف کو داد دے اور کچھ فائدہ نہ حاصل کرسکے۔ بلکہ اس میں مزیداً یہ واقعات بیان کئے گئے ہیں جن سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ مجھے تو فائدہ ہوگا ارادہ کر لیا۔ کہ زیادہ محنت کیا کروں گا آپ کی عبارت اکثر جگہ داد طلب ہے۔

آپ کو مبارک ہو کہ ایک مسلمان نے اقرار کیا۔ کہ اس نے فائدہ اٹھایا اور یہ اقرار آپ کی خاطر سے نہیں۔

دوسری بات سنئے اس سے آپ زیادہ خوش ہوں گے۔ پڑھتے پڑھتے مجھ کو خیال آیا۔ کہ مصنف کی نجات کو یہ تصنیف کافی ہے کیا اچھی جماعت کے ذکر سے آپ نے اپنی طبیعت کو بسا لیا۔ اس کی خوشبو انشاءاللہ آپ کی روح کو گود میں لئے رہے گی۔

یہ سب کہتا ہوں لیکن اسکے ساتھ ہی خیال دل سے نہیں نکلتا کہ اب ہم اس حالت میں ہیں کہ یہ تدبیریں جو ان پر جو سوچ رہے ہیں بالکل ہی بیکار و غیر مؤثر ہیں۔ یہ نہایت مشکل ہے۔ ملول تو باتیں ہوں۔　　اکبر حسین　　۱۸۹۸ء

ماتم ہی کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان کی حیات
کے حالات اردو میں شائع ہوں گے۔
نیازمند ۔ حبیب الرحمٰن
حیدرآباد ، ۷ راگست ۲۸ء

کرم فرمایم
السلام علیکم ۔ کسی موقعہ پر ایک سنائیں جی
کہہ رہے تھے "یہ شہر بکواس کا ہے" دل
ڈرتا ہے رات کی بات بکواس ہو کر رہ نہ
جا رہا ہے۔ اس لئے عرض ہے کہ اگر شاد
مرحوم عظیم آبادی کے مسودات کلام غیر مطبوعہ
آپ کو تنہا میں دستیاب ہو جائیں۔ اور
انجمن ترقی اردو کی اشاعت کرے تو مصارف
طبع کے لئے پانچ سو روپئے تک میں ان شاء اللہ
پیش کردونگا۔

نیازمند حبیب الرحمٰن
امید منزل ۱۴ رشعبان ۱۳۴۸ھ

---

۲۵ راپریل ۱۹۳۴ء
مکرمی السلام علیکم
تسلیکرم ۔ ۲۱ ر ماہ حال کا الطاف نامہ
مل گیا ۔ حبیب خاطر اور مستعدی اب بھی شکر ہے
قائم ہے۔ اور ادائے خدمت تک باکہ جان
کے ساتھ رہے گی۔ ؎
حافظ پیر سنم ز ازل در گوش ست
تا ہمائیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود
کانفرنس پوری مستعدی سے کام کریگی
مصارف ادا ہوں گے۔ ان شاء اللہ مطمئن رہیئے
پرسوں شام علی گڑھ کا ارادہ ہے۔ کورٹ
کی میٹنگ ہے۔ اسی موقع پر یہ انتظام بھی
کیا جائیگا۔ سوالات ساتھ لئے جاتا ہوں۔
انگریزی اردو ڈکشنری کی تکمیل کی خوش
خبری سننے کے لئے دل منتظر رہے گا۔ ایک
کام ہو جائے گا۔
حیدرآباد کے لئے میں خود بھی مشتاق
ہوں۔ اس پر احباب کی یاد فرمائی۔ آتش
شوق تیز تر۔ برسات کے موسم میں آنے کا
ارادہ ہے۔ آموں کا بھی لالچ ہے۔ یہ
نوعیت تو امسال خالی ہے۔ آپ کے قیام
اورنگ آباد ۔۔ یہاں کے بہت سے پرلطف
مناظر اور دلنشین صحبتیں یاد دلا دیں۔ خوب
جگہ ہے۔ خصوصاً وہ نایاب میوے جن
کی ڈالیاں ہیتم اعات پیش کیا کرتے ہیں
نیازمند حبیب الرحمٰن

---

۱۵ رمئی ۱۹۳۴ء
کرم فرمائے مکرم
السلام علیکم
شکر یاد فرمائی۔ فرزند نشت ایسی کہ
ڈاک کی رسید کافی سمجھی۔ مگر فرزند گذشت
ابھی کہ عنایت نامہ پایا۔ ساتھ ہی ام ۔ے

اموں کا مژدہ امسال آم یہاں نام کو ہے۔
اس لئے عزیز البشر ہے۔ اس پتہ سے پارسل
بھیج دیجئے۔ علی گڑھ کو بھی بند دلیجی منشی
اللہ داد خاں۔ مگر پارسل آتش شوق تیز
تر کرے گا۔ اس لئے ہر ہفتہ ایک پارسل
آئے۔ کسی کنجڑے کو مامور کر دیجئے۔ کہ ہفتہ
میں کسی معینہ دن یہ پارسل نشان بالا پر بھیج دیا
کرے۔ پہلا پارسل آپ کا تحفہ ہوگا۔ باقی
بہ قیمت ۔ شوق انیہ کا بھلا ہو۔ اصل مطلب
دور جا پڑا۔ نہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔
مطلب یہ ہے کہ تحقیقی رسالہ آگیا۔ سلیقے
رکھا ہوا ہے۔ دو مقالے اور آگئے تھے کل
ختم کرکے آج روانہ کر رہا ہوں۔ آج سے
چاند دیکھوں گا۔ آج چاند کی ۳۰ تاریخ ہے
آپ نے مسلم یونیورسٹی کا تازہ واقعہ
پوچھا۔ دونوں طرف فرو گذاشت ہے۔
ایک طرف غیر ذمہ دار جوش تھا۔ جو توڑ پھوڑ
کا شائق ہے۔ دوسروں کو تو امید میں جکڑتا
ہے۔ مگر خود آزاد رہتا ہے۔ دوسری
طرف پیش بینی و تدبر کی کمی رہی۔
ایک سال ادھر سے طے ہوا تھا کہ عالیجناب[1]
ختم ہوتے ہی پرو وائس چانسلر اور رجسٹرار
علیحدہ ہو جائیں۔ جدید رجسٹرار کا خرچ مقرر
ہو۔ اس موقع پر وائس چانسلر کے کام کا بار
محسوس کرکے وائس چانسلر نے چاہا کہ موجودہ
رجسٹرار پانچ سال کے لئے اور رکھے جائیں
انجمن کے سب طرف یہ اطلاع رکھی گئی نہاں
تاریخ رجسٹرار کی معیاد ختم ہوگئی۔ اجلاس
میں اس ضمن میں پنج سالہ توسیع پیش کی۔
جو ناجائز ہونے کی وجہ سے زیر بحث
آگئی۔ رجسٹرار کی گراں باری مسلم ہے۔ مگر
وائس چانسلر اعتماد کرکے اپنی مدد کے لئے
ان کو اصرار سے چاہ رہے ہیں۔ ووٹ
ہو بحث بسیار ٹھہرا۔ بیلٹ سے برآزاد
خیال کی بلند آہنگی کی شکست تھی۔ ۲۱ موافق
۲۶ مخالف ۔ قیاس اہل نظر کا ہے کہ اس
مدت نے بے وفائی کی۔ اس کے بعد ہی جیب
سے ٹائپ شدہ اسٹیٹمنٹ نکال کر پڑھ
دی گئی۔ جس میں استعفیٰ تھا۔ ؎[2]
یہ ہے روئداد اتنی داد فریاد۔ مگر ڈان
ننتا ہے۔ آج کل موسم یہاں بہت ہی
خوشگوار ہے۔ خصوصاً راتیں۔
نیازمند حبیب الرحمٰن

[1] مولوی فخرالدین رجسٹرار مسلم یونیورسٹی
[2] سر راس مسعود مرحوم کا مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے استعفیٰ۔

---

۲۶ رمئی ۱۹۳۴ء
مکرم و کرم فرما ۔ السلام علیکم
عنایتنا پر عنایت کا شکر مکرر۔ الطاف
نامہ ملا۔ پارسل بھی آگیا۔ اور ایسا محفوظ کہ

آم معلوم ہوتے تھے کہ ابھی درخت سے اترے
گئے ہیں۔ تین دانے نکلے۔ دیکھ کر طبیعت
خوش ہو گئی۔ آج دوپہر کو ان شاء اللہ کھائے
جائیں گے۔ اس کی فصل امید کا گیا کہنا ہے
باغبانی عبدالحق کے ہاتھ میں ہو۔ حق یہ ہے
کہ آم کی بہار آگئی۔ خزاں بہار سے بدل گئی
اور یہ کمال باغبان کا ہے۔
مبارک ہے کام سے تو حیدرآباد کی
ہوائیں یہ شگفتگیاں دلوں میں پیدا کر رہی ہیں
کانفرنس میں کام شروع ہو گیا۔ چار سو روپے
خرچ منظور کیا گیا۔ اسکیم تو تیار ہو گئی اس کی
بابت میں نے ہدایت کی ہے کہ مسودہ آپ کی
خدمت میں بھیج دیا جائے۔
مسلم یونیورسٹی کی دقتوں کا حل ابھی خیال
سے باہر ہے۔ گرمی یہاں دو روز سے ترقی
کر رہی ہے۔ راتیں خنک ہیں اچھی ہیں۔
اس آم کی قسم کیا ہے۔ ڈاکٹر سراج حسین
صاحب ہیں مزم یاد آتے ہیں ملاقات ہو تو
میرا سلام مسنون
نیازمند حبیب الرحمٰن

---

۱۰ رجون ۱۹۳۴ء
سراپا لطف و کرم ۔ السلام علیکم
الطاف کا متواتر نزول ہے۔ ابر کرم برس رہا ہے
آموں کی بہار ہے الطاف نامہ بہار کا سنگھار ہے دو
پارسل اور پہونچے زبان شکر سے قاصر بھی سرنگوں ہے
شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو
دونوں قسم کے آم یاد رہیں۔ در انگالیکہ یہاں النادر
کالمعدوم کا مفہوم ہے۔ "رضا لیند" نے دماغ میں
ایک لطیف یاد تازہ کی۔ نواب صدر یار جنگ بہادر
کی بیگم اخلاق دہیت صورت آنکھوں میں پھر گئی
کیسی خوبیوں کے انسان ہیں۔ ملاقات ہو تو میرا
سلام کہہ دیجئے گا۔ حیدرآباد کا ارادہ برسات
کے آغاز میں ہے۔ خدا کرے پورا ہو۔
اسکیم ملاحظہ ہوئی ہوگی۔ آپ کی ہدایت پر عمل ہوگا
گرمی یہاں بھی رخصت ہو چکی ہے۔ وہ برساتی ہیں
راتیں گلابی سرمائی شروع ہے الخیر ارجون کو ولایت سدھار
نیازمند حبیب الرحمٰن

---

۲۱ رجون ۱۹۳۴ء
حبیب گنج ضلع علی گڑھ
کرم فرما جناب مولوی صاحب
السلام علیکم ۔ مقالہ دیکھ رہا تھا۔ گرمی
نے دماغ کو معطل کیا۔ اب شکر ہے ترشح
نے اعتدال دکھایا۔ دماغ تازہ ہے۔ ان شاء اللہ
ختم کرتا ہوں۔ اسے دوسرے لکھوں یا نمبر
تجویز کئے جائیں۔
صورت ثانی میں کس قدر نمبر ہیں۔ پاس ہونے
کے تینوں مدرجوں کے لئے کتنے کتنے۔
سودا کا ایک شعر یاد آیا۔ زندگی کا اصول
ہو سکتا ہے۔ ؎

برنگ آئینہ میں اور سینہ صاف ہوا
جو سینہ دل میں کسی شکل سے غبار آیا
میں نے اصلاح دی ہے۔ سودا کہیں سن
نہ لیں ہر کہیں لاانفہم میرا قلم دان ۔ ان کا
دیکھ شگفت ۔ ہاں اصلاح ہوئی یہ ہے
"برنگ" "مثال" ع
مثال آئینہ میں اور سینہ صاف ہوا
کچھ اصلاح بے مثال ہے۔
الحمد للہ خیریت ہے۔ آپ کی خیریت کی
تمنا۔ مسعود مرحوم کو علیگڑھ اور انگریز سلطنت کے
خیریت انگلستان روانہ ہو گئے۔ دلوں پر اثر
ہے۔ کہ علی گڑھ کو بری طرح چھوڑا۔
نیازمند حبیب الرحمٰن

مکرمی مولوی صاحب السلام علیکم
عید مبارک
کلکتہ سے ابھی خبر آئی کہ علی گڑھ کانفرنس
کا اجلاس وہاں ۲۹ ر ۳۰ ر ۳۱ ردسمبر
کو ہونا قرار پایا۔ اسی کے ساتھ ان کی درخواست
ہے ۔ کہ اردو سیکشن بھی وہاں ہو۔ اب
کہئے کیا ارادہ ہے۔ جواب آنے پر کلکتہ
کو سیکشن کی بابت جواب دیا جائے گا۔ مولوی
سید ہاشمی صاحب کو سلام و مبارکباد عید
علی گڑھ ۱۶ رنومبر ۲۹ء
نیازمند حبیب الرحمٰن

بنام سید محمود واحد جیلانی معتمد بزم اردو ... اردو
کالج بہ تقریب یوم اردو جنوری ۱۹۴۰ء
عزیزم سلمہ!
پہلے یہ بتاؤ کہ یوم اردو سے کیا مراد ہے
اس کا پروگرام کیا ہے۔ اس کے بعد میں خیال
قائم کرونگا۔ دل میں ادب کا درد پیدا کرو
پھر یوم اردو مناؤ
والسلام
نیازمند حبیب الرحمٰن
حبیب گنج ۷ ردسمبر ۱۹۳۹ء

دیکھو حضرت درد کیا فرما گئے ہیں ؎
ہوں فتادہ برنگ نقش قدم
رفتگاں کا مگر نشاں ہوں میں

پہلے مصرعہ کی خاکساری ، دوسرے کی نوعیت
قابل دید و داد ہے۔ رفتگان کے نشان
بنو ایسے کہ تم کو دیکھ کر اور تمہارے نقش
قدم پر چل کر لوگ حضرت درد کی بارگاہ ادب
میں باریاب ہو جائیں۔
یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ یہی میرا پیام ہے۔
اور یہی میرا سلام
والسلام
حبیب الرحمٰن

تبرکات

نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم کے مختلف عنوانات پر مضامین کا مجموعہ "مقالات شروانی" کے نام سے ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء میں چھپا تھا۔ جو اسی سال ختم ہو گیا اس مجموعہ سے مرحوم کے قلم کی گلکاریوں کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے کاش صحیح ترتیب و تہذیب کے ساتھ اسکا دوسرا ایڈیشن ورثاء مرحوم کی توجہ کا جلد رہین منت ہو سکے۔ اس مجموعے میں چند وہ مضامین جنکا تعلق کسی نہ کسی نوعیت سے مرحوم کی ذات سے ہے پیش کئے جا رہے ہیں۔ مرحوم کا قلم بہت محتاط تھا اسلئے انہیں صحیح معلومات کا خزانہ کہا جا سکتا ہے۔ شاہد شروانی۔

ایام طالب علمی میں کتاب مختصر المعانی علامہ تفتازانی کی پڑھی۔ اس میں علامہ کا یہ قول بلاغت کے بیان میں پڑھا۔

"کمال بلاغت اس میں ہے کہ واقعات کے بیان میں جوہر بلاغت نمایاں ہوں۔ اس لئے کہ واقعہ نگاری میں بیان واقعات کے تابع ہے لہٰذا میدان بیان تنگ ہے۔ افسانہ و خیالی مضامین کی نگارش میں بیان آزاد ہے اور افسانہ و مضامین تابع، لہٰذا میدان وسیع"

اس قول کو دل نے لیا۔ لکھنے کا شوق واقعہ نگاری میں پورا ہوا۔ افسانہ و خیالی مضامین لکھنے سے طبیعت کنارہ کش رہی۔

خود ستائی معیوب ہے۔ تاہم بعض نکتہ سنج ارباب ذوق نے جو خیال میری تحریروں کی بابت ظاہر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں بحمد اللہ کامیاب ہوا

خاندان

ہمارا خاندان شروانی ہے۔ جو لودی اور غلزئی کے بھائی شروانی کی اولاد میں ہیں۔ سلطان بہلول لودی کے وزیر اعظم محمد خاں شروانی تھے جن کا خطاب مسند عالی تھا) وہ ہمارے مورث ہیں۔ عمر خاں شروانی کے خاندان میں سلاطین لودیہ کی وزارت عظمیٰ کئی پشت تک قائم رہی شیر شاہ سوری کے عہد میں اقتدار حاصل رہا۔ شیر شاہ نے ہمایوں بادشاہ کا اخراج ہندوستان سے کیا۔ اور ہندوستان کی سلطنت پر قبضہ۔ اس وجہ سے مغل سلاطین پٹھانوں کے مخالف ہوئے۔ اور فوج سے خارج کر کے ان کو آوارہ کر دیا۔ اکبر بادشاہ اور شاہجہاں کے عہد میں ہمارے بزرگ دلی سے اس نواح میں آئے۔ اور زمینداریاں قائم کیں۔ جو آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے ترقی کے ساتھ قائم ہیں۔

ہمارے پردادا صاحب محمد باز خاں تھے ان کے تین صاحبزادے تھے۔ حاجی محمد داؤد خاں مورث نواب محمد مزمل اللہ خاں بڑے۔ منجھلے محمد خان زماں خاں ہمارے دادا۔ موصوف انتظام ریاست اور کاغذات ریاست میں ماہر تھے۔ شاہ عبد العزیز صاحب سے بیعت تھی۔

مسائل اور بعض رسوم شادی و غم کے متعلق شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث مرحوم سے لکھوا کر اس کے مطابق خاندان کے رسوم کی اصلاح کی۔ جو قریباً ایک صدی سے بفضلہٖ تعالیٰ آج تک قائم ہے۔

چھوٹے بھائی حاجی غلام محمد خاں دادوں کے مورث تھے۔ بھائیوں میں سے سب سے پہلے انھوں نے انتقال کیا۔ دادا صاحب مرحوم نے ان کے فرزند محمد ہادی یار خاں صاحب کے بلوغ تک ان کی ریاست کا کام کیا۔ خان زماں خاں صاحب کے تین فرزند تھے۔

حاجی محمد ہدایت اللہ خاں جو عابد زاہد تھے، انتظام ریاست میں ماہر، علم دوست تھے شباب میں انتقال کیا۔

منجھلے حاجی محمد عبد الشکور خاں صاحب عربی کے عالم تھے۔ ملا حسن شمائل ترمذی وغیرہ کتابوں تک باقاعدہ تحصیل کی تھی انتظام ریاست میں پوری مہارت تھی۔ ۷۵ برس کی عمر ہوئی۔ علوم کے پورے خادم تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ۔ دار العلوم دیوبند۔ سہارنپور مدرسہ امدادیہ مراد آباد وغیرہ کی ہمیشہ خدمت کی۔ طلباء کو وظائف دیئے۔ سر سید کے ساتھ مل کر محمڈن کالج کی بھی خدمت کی۔ اگرچہ ان کے عقائد کے خلاف رہے۔ آخر زمانہ میں حج کیا۔ زیارت مدینہ طیبہ سے مشرف ہوئے۔ واپسی میں بمقام جدہ رحلت کی۔ وہیں مدفون ہیں۔

چھوٹے بھائی محمد تقی خاں صاحب میرے والد تھے۔ ان بھائیوں کا باہمی اتفاق مشہور تھا۔ یہ ریاست ہمیشہ مشترک رہی۔

والد مرحوم کو مردانہ فنون، بنوٹ، لکڑی ورزش کشتی کا شوق رہا۔ نیز بندوق کے شکار کا۔ اسی کے ساتھ ادب اردو سے ذوق تھا۔ شروع میں مجھ کو غالب کی انشاء اردو ئے معلیٰ پڑھنے کے واسطے عنایت کی تھی۔ اسی سے مجھ کو ادب اردو کا ذوق پیدا ہوا

والد مرحوم نے ایک کتاب سراپا معشوق اردو میں فراہم کر کے چھپوائی تھی۔ اس میں سر سے پاؤں تک جملہ اعضاء کے متعلق اساتذہ کے اشعار جمع کئے تھے۔ اس کا قلمی نسخہ میرے کتاب خانہ میں بھی ہے۔ والد مرحوم کو غدر سے پہلے اور بعد دلی جاتے، وہاں رہتے اور وہاں کے عمائد مثلاً مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ اور حکیم احسن اللہ خاں صاحب وغیرہا سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اس وجہ سے خورد و نوش نشست برخاست، لباس، ذوق صحبت میں پورا اثر دلی کی صحبت کا تھا۔ مجھ کو اپنے والد مرحوم اور عم محترم دونوں کی صحبت تربیت کا فیض حاصل ہوا۔ ادب، شکار لباس اور خورد و نوش اور فنون مردانہ بنوٹ لکڑی وغیرہ کی مشق نتیجہ ہے والد مرحوم کی تربیت کا۔ والد مرحوم ہمیشہ دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔

علم عربی کی تحصیل اور پابندی مذہبی عم محترم کی نگرانی میں تربیت کا نتیجہ ہے۔ ریاست کے انتظام سے واقفیت مرحوم کی تعلیم و تربیت سے حاصل ہوئی۔

جزاهما اللہ تعالیٰ عنی خیرا لجزا

انتظام ریاست

(ریاست مشترکہ و خاص)

۱۸۹۳ء مطابق ۱۳۱۰ھ میں تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔

گھر آ کر ریاست کا کام سیکھنا اور دیکھنا شروع کیا۔ معاملات ریاست میں عم محترم مرحوم کی نظر بہت وسیع اور عمیق تھی۔ موصوف کی نگرانی میں کام کیا۔ علاقہ ہردوئی میں اکثر قیام رہا۔ وہاں کاشتکاروں کی آراضی اور اس کے پیداوار کے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ کچے کے کھیتوں کی مساحتیں کیں۔ اس زمانے میں نیل کا کاروبار پورے عروج پر تھا۔ اس کی کاشت کرائی۔ مال تیار کرایا۔ پھر جا کر کلکتہ بھیجا۔ اسی سلسلے میں ایک مرتبہ کلکتہ کا سفر کیا۔

۱۹۰۵ء مطابق ۱۳۲۳ھ میں والد مرحوم کا انتقال ہوا۔ موصوف اپنے بھائی کے ساتھ ملکر ریاست کا کام کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کا اتفاق مشہور عالم تھا۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد میں نے بھی عم محترم کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس اسلوب سے کہ پہلے موقعہ پیران کی خدمت میں میر اولاد حسین کارندہ کے زبانی عرض کی کہ اب بھی حضور اسی طرح ریاست کے مالک ہیں جیسے کہ والد مرحوم کی حیات میں تھے۔ اس سے جو تردد کہ والد کے انتقال سے عم محترم کی طبیعت میں پیدا ہو گیا تھا رفع ہو گیا

چنانچہ بعکس پور صبح کو جا کر میں کام کرتا تھا۔ قبل دوپہر واپس آتا تھا۔ والد مرحوم کا بھی طرز عمل تھا جولائی ۱۹۰۷ء مطابق ۱۳۲۵ھ اثناء سفر حجاز میں مراجعت کے وقت جدہ پہونچ کر عم محترم کی رحلت واقع ہوئی۔ اس وقت عزیزوں اور حکام کی متفقہ مشاورت اور تحریک سے کل ریاست کا کام میرے سپرد ہوا تاکہ قرضہ ادا کیا جائے۔ بعد ادائگی قرضہ ریاست تقسیم ہوگی۔ چونکہ عم محترم ریاست کے کارگزار تھے۔ اس لئے قرضہ سب ان کے دستخطی رقعوں کا تھا والد مرحوم کا ایک بھی نہ تھا۔

والد مرحوم کا اصول قرض کشی کے بالکل خلاف تھا۔ اس لئے بھائی کی قرض کشی پر نہ صرف معترض تھے بلکہ بیزار تھے۔ وقتاً فوقتاً اس کا شکوہ والد صاحب کی زبانی میں نے بھی سنا تھا اپنے معتمد وکیلوں کی یہ رائے تھی۔ کہ اگر میں قرضہ سے انکار کردوں تو میرے ذمہ قرضہ عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ قرضہ سودی تین لاکھ روپے تھا۔ جس کا سود ۹ر اور ۱۲ر سیکڑہ تھا۔

بفضلہٖ تعالیٰ میری طبیعت نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ کہ میں سبکدوش ہو کر سارا بار دوسرے عزیزوں کے ذمہ ڈال دوں۔ دو لاکھ روپے برادر عزیز عبد الجلیل خاں کے ذمہ تھا۔ اور ان کی ریاست کا حصہ گورنمنٹ کی جانب سے میرے ٹھیکہ میں تھا۔ اس طرح مجھ کو ۵ لاکھ روپیہ سودی ادا کرنا تھا۔

عم محترم مرحوم کی فیاضی مشہور روزگار تھی۔ نیک کاموں میں (مثل عربی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کے اہل حاجت کی خدمت وغیرہ میں) بے دریغ روپیہ صرف فرماتے تھے۔ بفضل ربانی تھا کہ کام ناقدینی سے کہ تمام مصارف خیر جاری رکھے اور سارا قرضہ مثل پانی کے بہہ کر بہت آسانی سے ادا ہو گیا۔ یہ حضرت پیر مرشد قدس سرہٗ کی دعاء خیر کا نتیجہ تھا۔

ساڑھے چھ برس اس نہج سے ریاست کا انتظام جاری رہا۔ بالآخر بعض عزیزوں کو یہ طریقہ گوارا نہ رہا۔ اور ریاست کی تقسیم انھوں نے چاہی نواب مزمل اللہ خاں مرحوم کو درمیان میں ڈالا شروع میں مجھ کو یہ ناگوار ہوا۔ خصوصاً نواب صاحب کی وساطت۔ لیکن بالآخر میری یہ رائے قرار پائی کہ میری کارگزاری یا عدم کارگزاری، دیانت یا خیانت اگر کھل سکتی ہے تو اسی طریقہ سے لہٰذا میں نے بھی تقسیم پر آمادگی ظاہر کردی۔ اور نواب صاحب مرحوم کل شرکار کی جانب سے ثالث باضابطہ قرار پا گئے۔

موصوف نے بہت محنت سے ثالثی کے فرائض انجام دیئے۔ اپنے فیصلہ میں میری دیانت داری کا اعتراف کر کے کل شرکار کے حصے تقسیم کر دیئے تقسیم کے بعد بھی چونکہ قرضہ باقی تھا۔ لہٰذا اکثر حصہ اپنی اپنی جائداد کا شرکاء نے میرے ہی قبضہ میں چھوڑا تاکہ میں ان کا قرضہ ادا کرد

مخدومی!

مہمان ناخواندہ عزیز تر از مہمان خواندہ ہو چکا۔ باوجودیکہ آجکل تحقیق فرصت کے سبب مطبوعات جدیدہ کے مطالعہ کے لئے بالکل فرصت نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ترتیب نصف کے رسالہ علماء سلف کو دیکھ گیا افسوس ہے کہ مجھے اس عمدہ تصنیف پر مفصل ریمارک کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ مگر مختصر یہ ہے کہ اس رسالہ نے میرے دل میں آپ کی محبت اور عظمت بہ نسبت سابق کے اضعاف مضاعف کر دی ہے۔ مسلمانوں کے لٹریچر میں اپنی طرز کی یہ پہلی کتاب ہے۔ شاید کوئی ناواقف آدمی یہ کہے کہ کیا مسلمانوں نے فن رجال میں ایسی صدہا کتابیں نہیں لکھیں۔ مگر ایسا خیال کرنا سخت غلطی کی بات ہے۔ آپ نے درحقیقت وہ کام کیا ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر سموئل نے سلف ہلپ کے لکھنے میں کیا ہے۔ اس نے بھی ہزاروں بائیوگرافیاں پڑھ کر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ جس سے بہتر آج تک کوئی کتاب انگریزی میں اس طرز کی نہیں لکھی گئی۔ مسلمان علماء کے حالات لکھنا ... بات ہے اور تمام بائیوگرافیوں کو دیکھ کر چند عنوان تجویز کرنے اور ہر عنوان کے مناسب اس دفتر طول اللذیل سے مضامین انتخاب کرنے اور ان کو جدا جدا عنوانوں کے تحت درج کرنا نہایت محنت اور لیاقت اور غور و فکر کا کام ہے۔ آپ کی تصنیف میں اور مسٹر سموئل کی کتاب میں صرف فرق یہ ہے کہ اس نے سلف ہلپ میں کتاب کا موضوع صرف علماء میں محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اس میں تمام رفارمر اور موجد و مخترع اور سٹیٹسمین اور سپہ سالار وغیرہ شامل ہیں اور اس رسالے میں صرف علمائے سلف کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ اگر آپ اس کے دائرہ کو زیادہ وسیع کر دیتے تو یہ بالکل اسی قسم کی کتاب ہو جاتی جیسی سلف ہلپ ہے۔

اس کتاب میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ مگر میں نے صرف ایک خوبی کا جو کہ تمام تصنیف کی جان ہے ذکر کرنا کافی سمجھا ہے میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ انگلش لٹریچر سے واقف نہ ہوتے تو ایسی تصنیف کا خیال ہرگز آپ کے دل میں نہ گزرتا۔ بس تا وقتیکہ ندوۃ العلماء انگریزی تعلیم کی ضرورت پر زور نہ دے گی اس کی چیخ و پکار سے کوئی معتد بہ نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ میرا یہ بھی خیال ہے کہ صرف انگریزی تعلیم جب تک کہ اس میں مشرقی تعلیم کی چاشنی نہ دی جائے گی ہرگز مفید آدمی پیدا نہیں کر سکتی۔ مجھے ایک انگریزی تعلیم یافتہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جو مسلمان علماء کے حالات پر ایک

ایسی کتاب لکھ دے جیسی کہ آپ نے لکھی ہے۔

میرے نزدیک یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کی ایک ایک دو دو جلدیں ہر مدرسہ اسلامیہ میں رہنی چاہئیں۔ بلکہ محمڈن کالج کے طلبا بھی اس سے مستفید ہوں۔ تو بہت مناسب ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کتاب آپ نے اپنے خرچ سے چھپوائی ہے یا ندوۃ العلماء نے اس کو چھپوایا ہے۔

مسلمان اور خاص کر پرانے خیالات کے مسلمان ایسی کتابوں کے خریدنے میں بہت ممسک ہیں اس لئے مدارس اسلامیہ میں اس کو مفت تقسیم کرنا چاہئے۔ آخر میں میری یہ دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ ہمارے تمام رئیسوں اور رئیس زادوں کو اسی طرح زیور علم دنیا قت و حسن اخلاق سے آراستہ کرے۔ جیسا کہ اس نے شروانی رئیسوں میں آپ کو زیور علم و فضل و اخلاق سے آراستہ کیا ہے۔ اور آپ کو جملہ مکروہات روزگار سے محفوظ رکھ کر صد ہا سال تک زندہ و سلامت رکھے۔ زیادہ نیاز

خاکسار۔ الطاف حسین حالی عفی عنہ

از پانی پت

۱۰ر ستمبر ۱۸۹۸ء

جناب مولوی صاحب مخدوم مکرم!

لکچر اور نظم اور عنایت نامہ تینوں ایک ساتھ موصول ہوئے۔ تصویر عبرت، تو اول میں نے مخزن میں دیکھا تھا۔ پھر تہذیب النسواں میں دیکھا۔ اور اب لکچر کے ساتھ اسکو بھی اول سے آخر تک پھر پڑھا۔ اور بلا تصنع ہر دفعہ اس کے پڑھنے سے لطف تازہ حاصل ہوا۔

فالحمد للہ۔ اگر رتہ متضوع۔ اول تو مضمون ہی فی نفسہ موثر اور عبرت انگیز ہے اور پھر مناسب الفاظ اور خوبی بیان نے اس میں اور بھی جان ڈال دی ہے۔ مگر شاید کبر سن کا تقاضا ہے کہ جو اثر پہلے عمدہ نظم کے پڑھنے یا سننے سے دل پر ہوتا تھا۔ وہ بات اب نہیں رہی۔ اور یہی وجہ ہے کہ فکر شعر سے اب طبیعت سو سو کوس بھاگنے لگی ہے۔

لکچر جس وقت میرے پاس پہونچا۔ جب تک اس کو اول سے آخر تک نہیں دیکھ لیا اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ اگرچہ اس میں بعض خیالات ایسے ظاہر کئے گئے ہیں جن سے مجھ کو اتفاق نہیں ہے۔ لیکن اس بات کے خیال کرنے سے بے انتہا مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے سیکڑوں اور لکچراروں میں آپ کے سبب سے ایک معقول اور قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔

سب سے پہلے میں نے آپ کی وہ بے مثال تقریر سنی تھی جو حاذق الملک کی یادگار کے جلسہ میں بمقام علیگڈھ اسٹریچی ہال میں آپ نے کی تھی۔ اس کے بعد اخلاق اسلامی پر جو لکچر آپ کا انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپا ہے۔ اس کے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اب یہ لکچر جو حمایت اسلام پر آپ نے لاہور میں دیا تھا۔ میری نظر سے گزرا۔ مسلمانوں میں اول تو عموماً قحط الرجال ہے اور پھر خاص کر روساء طبقہ میں تو علمی مذاق بالکل مفقود ہو گیا ہے۔

پس یہ کچھ کم خوشی اور فخر کا مقام نہیں ہے کہ ہمارے رئیسوں میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو قطع نظر اعلیٰ درجہ کے علمی اور لٹریری مذاق کے مسلمان کا خیر خواہ اور اسلام کا حامی اور قومی کاموں میں بھی سرگرم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جملہ مکروہات سے محفوظ رکھے۔ اور اسلام کی خیر خواہی اور مسلمانوں کی ہمدردی سے آپ کو حظ وافر نصیب کرے۔

زیادہ نیاز

خاکسار۔ الطاف حسین حالی

پانی پت

۲۶ر جون ۱۹۰۲ء

مکرمی!

آپ نے شعر العجم[۱] کی وہ مدح سنجی کی کہ میں نے خود اس کو دوبارہ اس لحاظ سے نظر ڈالی کہ یہ خط و خال اس میں ہیں بھی یا چشم مجنوں کی قوت اختراع ہے۔

شعر العجم کا یہ کیا کم احسان ہے کہ اس کی بدولت آپ کی ادبی بارش فیض نصیب ہوئی۔ افسوس یہ دست و قلم زمینداری کے بدمزہ کاغذات پر صرف ہوں۔

لوگ اکبری یا عالمگیری ہیں۔ لیکن میں جہانگیری ہوں۔ آپ کی الندوہ کے آئینہ میں جہانگیر کی صورت دیکھے گا۔

جلسۂ دہلی نے بڑی مصیبت میں ڈالدیا ہے۔ ان ظالموں نے ہاتھ تو لگا دیا۔ لیکن بوجہ سنبھالا نہیں جاتا۔ تقاضا ہے کہ خود آؤ اور ہاتھ بٹاؤ۔ دو تین دن میں روانہ ہونگا علی گڑھ بھی راہ میں ہے۔ لیکن آپ اپنے دائرے سے کہاں نکلتے ہیں۔ وہاں تک آنے کی اب ہمت نہیں۔

مفرح الحرمین، حالات حرمین۔ میں ایک مثنوی ہے۔ مصنف کا نام محی ہے۔ لیکن کشف الظنون کے سوا اور کہیں تذکرہ کا پتہ نہیں لگتا۔ آپ اپنے دفتر میں تو دیکھئے۔

شبلی

۸ر فروری ۱۹۱۰ء

[۱] شعر العجم کے ریویو میں

جیسے آج معارف آیا۔ ریویو[۱] پڑھا اور بار بار پڑھا۔ خدا کی قسم دیر تک ایک کیفیت طاری رہی۔ اگر خودستائی کا پہلو نہ نکلتا۔ تو میں اس کو الفاروق کے ساتھ شامل کر کے شائع کرتا۔ زور قلم، ندرت استعارات و اقعہ طرازی کس کس چیز کی داد دوں۔ ہاں اب ایک بات سنیئے۔ یہ زور قلم مضمونوں اور رسالوں میں ہی ختم نہیں ہونا چاہیئے۔ وسعت خیال اب مستقل تصنیف کا میدان چاہتی ہے۔ متوجہ ہو جئے۔ اور کوئی مفید سلسلہ چھیڑ دیجئے۔

ہاں ایک اور بات ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس[۲] الٹی میں ہے۔ آزملہ ۲۶ر جولائی کو روانہ ہوں گے۔ مجھ کو بلاتے ہیں۔ میں ضعف کی وجہ سے رکتا ہوں۔ اگر آپ کی ہمسفری کی امید ہو تو میں تو ہی ہو جاؤں گا۔ کیا آپ قصد کر سکتے ہیں؟ اسی سیر میں ممالک اسلامیہ کو بھی پہنچتے آئیں گے۔ پانچ سات سو کا خرچ ہے آپ چاہیں تو ٹھہر کر بھی چل سکتے ہیں۔ والسلام۔

شبلی

۵ر جولائی ۱۸۹۹ء

نوید عیش!

حیات تازہ خیال لب تمنا را
نوید عیش بہار رخصت تماشا را
نگاہ گرم تنا بعذار گلگونش
بخواب ہیم اگر آں نگار رعنا را
بجان شوق زنی آتشے ز تابش حسن
بچشم مہر فزائی رواں تمنا را
ز تاب جلوہ کند تا نگاہ را مدہوش
بنور بادہ برافروخت روی زیبا را
کشیم منت بخت بلند خود روزی
کہ در کشیم بر آں بلند بالا را
دلم بہ ساغر و مینا تہی کند حسرت
کہ بردہ نرگس مستانہ زخود ما را

[۱] ریویو بر الفاروق نوشتہ مکتوب الیہ شائع شدہ رسالہ معارف [۲] اورینٹل کانفرنس

قطعات کا سرمایہ ان کو دکھایا۔ تو میرا شوق دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جو قطعے استادوں کی نشانی ان کے پاس تھے وہ مجھ کو عنایت کر دیئے۔ اب تک ان کی یادگار کی تصریح کے ساتھ کتاب خانہ میں محفوظ ہیں۔

آمدم برسر مطلب۔ جو قلمی چیز خریدی جاتی علامہ مرحوم کو دکھائی جاتی۔ جرح کرتے اور کوشش فرماتے کہ نگاہ بلند ہو۔ انہیں کے ذریعہ سے لکھنؤ کے قلمی کتاب فروشوں سے سابقہ ہوا۔ جن کو مولانا غارتگر کہتے تھے۔ وہ کتاب ایسی دکھاتے تھے کہ نہ لینا ممکن نہ ہوتا۔ قیمت ایسی طلب کرتے کہ دیوالیہ کر دیتے۔ اب بھی ان کی قیمت دیکھتا ہوں تو غارتگرانہ ہی محسوس ہوتی ہے۔

لکھنؤ کی مدد سے قلمی کتابوں کا سرمایہ بڑھتا رہا۔ دوسرے مقامات سے بھی کتابیں ملتی رہیں۔ اب اتنا سرمایہ ہو گیا تھا کہ رہنے کے کمرے میں چاروں طرف چھوٹی بڑی الماریاں کتابوں سے معمور پیش نظر رہتی تھیں۔ حفاظت سے رکھتا۔ تھوڑی بہت فہرست یہ سب اپنے ہی ہاتھ سے کرتا۔

ایک بار استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کی ایک صاحبزادی کی شادی مولانا کے وطن ملکھنے میں ہوئی۔ میں بھی حاضر ہوا۔ عجیب عالم تھا۔ تلامذہ کا کثیر مجمع تھا۔ جن میں نامور علما بھی شامل تھے۔ مثلاً مولانا سید محمد علی صاحب۔ مولانا احمد حسن صاحب۔ مولانا عبدالغنی خاں صاحب۔ مولانا عبدالجلیل صاحب۔ لطف یہ تھا کہ مہمانوں کے سامان پہنچانے پر ہر طرف مولوی ہی مولوی نظر آتے تھے۔ پلنگ۔ پانی۔ برتن۔ غرض کہ جملہ اشیا اہل علم ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی تھیں۔ میرے یہاں اجنبی سامان اٹھانے لگے تو میں نے معذرت کی کہ آپ نہ لائیں۔ ایک صاحب جو واقف تھے ہنس کر کہا۔ "یہاں مولویوں کے سوا اور ہے کون جو تمہارے لئے سامان لائے گا"

غرض ان حضرات میں سے بعض کو میں نے تکلیف دی کہ شادی کے بعد حبیب گنج تشریف لائیں۔ کرم فرمایا۔ کتاب خانہ دیکھا۔ مختلف فنون کا اتنا سرمایہ جمع ہو چکا تھا کہ قابل تحسین ٹھہرا۔

مولانا سید محمد علی صاحب اور علامہ شبلی کی تشویق سے بیرونی ممالک کی کتابوں کے خریدنے کا شوق ہوا۔ ندوۃ العلماء کے جلسوں کے سلسلے میں کانپور جانا ہوتا تو مولوی نور الدین مرحوم اور مولوی سلیمان صاحب تاجر کتب مصریہ کی فہرست دیکھ کر کتابیں خریدی جاتیں۔

قدم آگے بڑھا تو بمبئی۔ مصر، شام اور یورپ سے کتابیں آنے لگیں متفرق طور سے بھی کتابیں (اور نادر کتابیں) ہاتھ آتی رہیں۔ یہ ارزاں مل جاتیں۔ مثلاً مباحث مشرقیہ امام رازی کا نسخہ ایک بیوہ شریف زادی کے یہاں سے تین روپے کو ملا۔ الہ آباد سے ایک صاحب نے اپنے بیوہ کا مال گلستاں کا نادر مصور نسخہ بے طلب بھیج دیا۔ جب اوس کو ۹۲ روپے قیمت بھیجی تو دعا اور شکریہ بھی ملا۔ جو نادر کتاب ہاتھ آتی علامہ شبلی مرحوم کو مطلع کرتا۔ وہاں سے تحسین آتی۔ یاقوت مستعصمی کا لکھا ہوا کلام مجید کا نسخہ ہاتھ آیا۔ تو نیاز نامہ کے جواب میں فرمایا۔ "گاؤں میں بیٹھے ہوئے بغداد تک چھاپے مارتے ہو" اس کلام مجید کے دستیاب ہونے کا واقعہ بھی شنیدنی ہے۔

ایک علمی اور درویشی خاندان کے صاحبزادے نے روش خاندانی بدل کر باپ کی موجودگی میں سرمایہ علمی پر دست درازی شروع کر دی۔ ایک بار ایک نادر نسخہ معمولی داموں پر یہاں فروخت کر گئے۔ چلتے وقت کتاب دار سے کہا کہ یہ تو معمولی چیز ہے ہمت ہو تو ایک چیز لاؤں۔ کہا گیا ضرور۔ دوبارہ آئے تو یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف کا وہ نادر روزگار تحفہ لائے۔ کہ آنکھیں کھل گئیں۔ ظفر خاں (شاہ جہانی) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت اس پر تھی۔ "بقلم یاقوت مستعصمی کہ بہتر ازیں نوشتہ اند" ہدیہ چالیس روپے لے گئے۔ چند روز بعد اہل خاندان کو خبر ہوئی۔ وہ اس کے ذریعہ سے زیادہ نفع کے امیدوار تھے۔ بد مشورہ چالیس روپے دیکر صاحبزادے کے والد کو میرے پاس بھیجا۔ میں ایک جگہ زمینداری میں گیا ہوا تھا۔ وہاں ملے۔ تحفہ کی فرمائش کی۔ کھٹک گیا۔ تنہائی میں لڑکے کی نالائقی کا شکوہ فرمایا۔ دریافت کیا کہ آیا کلام مجید کا نسخہ حبیب گنج پہنچنے کی خبر صحیح ہے۔ مشکل کا سامنا ہوا۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ شوق کا تقاضا کیا ہوا ہوگا۔ دل نے کہا خطاب کرنے والے سید، معاملہ کلام مجید کا۔ جھوٹ بولنا روا نہیں۔ صاف واقعہ کہہ دیا۔ اور واپسی کا وعدہ کیا۔ سید صاحب یہاں تشریف لائے تو نسخہ واپس کر دیا۔ چلتے وقت فرمایا وقف ہے۔ حفاظت نہ ہو سکے گی تو تمہارے پاس امانتاً رکھوا دونگا۔"

آگے سنئے۔ صاحبزادے چالیس روپیہ میں ہدیہ کر گئے تھے خود بزرگوار نے بارہ روپیہ میں گروی رکھ دیا۔ مجھ کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوا تو زر رہن بھیج کر نسخہ اپنے پاس منگوا لیا۔ سید صاحب نے پھر کرم فرمایا۔ نسخہ پھر حوالے کر دیا گیا۔ اس مرتبہ ان کے زیر طلب عزیز ایک ریاست میں لے گئے۔ اور ساڑھے گیارہ سو روپے میں ہمیشہ کے لئے اپنے آپ سے اس عزیز کو جدا کر دیا۔ میں نے اس واقعہ کا پہلا حصہ علامہ شبلی سے بیان کیا تو فرمایا۔ "تمہاری شرافت تمہارے شوق پر غالب آئی"

جب حیدر آباد میں تعلق ہوا تو وہاں بھی عمدہ نسخے کتابوں کے حاصل کرنے کے ملے، خود اپنے بزرگوں کے کتاب خانوں کے سرمایہ سے بھی اضافہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے بعض نادر نسخے ہیں۔ مثلاً تفسیر جلالین کا ایک نسخہ عبدالغفور شاہی کا نفیس لکھا ہوا تانا شاہ کے بعض حاشیہ اس پر درج ہیں۔

داستان بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ میرا مختصر کتاب خانہ نصف صدی سے زیادہ کی تلاش کا سرمایہ ہے۔ الحمدللہ کہ اس میں ایک نسخہ بھی سرقہ یا ناجائز ذریعہ کا حاصل کیا ہوا نہیں ہے بلکہ ایسا ہوا ہے کہ فروشندہ نے ناواقفیت سے کم قیمت مانگی میں نے زیادہ دام دیئے۔ بہت سی کتابیں نقل کے ذریعہ سے بھی حاصل ہوئی ہیں۔ سفر حج میں حرمین شریفین میں بھی کتابیں ہاتھ آئیں۔ احباب اور اعزہ کے ہدایا نے بھی سرمایہ بڑھایا۔

تحفہ اثنا عشری کا نسخہ منشی احتشام علی صاحب کا عطیہ ہے۔ جو خوشاہ صاحب نے صحیح کرا دیا تھا۔ بعض دفعہ حماقتیں ہوئیں۔ جن پر اب تک افسوس ہے۔ ایک حماقت سن لیجئے۔ بوستان سعدی کا ایک نسخہ آیا مشہور خطاط (غالباً اسحق) کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ بغرض آرائش شاہی کئی مغل بادشاہوں کی مہریں اور دستی عبارتیں لکھی ہوئیں۔ جن میں جہانگیر اور شاہجہان شامل تھے۔ اس کی آراستگی قابل دید تھی۔ تین سو روپے قیمت تھی۔ ایک دوست نے بھیجا۔ چند روز رکھا رہا۔ نہ معلوم دماغ ان ایام میں نحت کے کس درجہ پر تھا کہ نہ لیا واپس کر دیا۔ خود ان دوست نے خرید لیا اب میں ہوں اور وہ دوست طرح طرح سے پھسلاتا ہوں مگر ان کا دل نہیں پسیجتا۔ اگر معارف کے قارئین میں سے کوئی صاحب میری مدد فرمائیں تو ان کا نام بھی بتا دوں۔

کتابوں کے جمع کرنے میں زیادہ اہتمام قلمی نسخوں کا رہا۔ مطبوعہ علمی اور فنی کتابیں جمع کی ہیں۔ معمولی کتابوں سے تعداد بڑھانا کبھی پیش نظر نہیں رہا۔

اس تمام تجربہ سے قدیم زمانے کے علمی و کتابی شوق کا جو اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں موجودہ عصر کی بے ذوقی بلکہ بد ذوقی دیکھ کر دل دکھتا ہے۔

اس وقت کتاب خانہ میں کل جلدیں ۳۷۹۱ ہیں۔ ان میں سے ۱۱[illegible] مطبوعہ ہیں۔ اور ۲۷۰ قلمی۔ اب ایک وسیع عمارت بھی اس سرمایہ کے لئے تنگی کر رہی ہے جو اوسط پیمانہ کے صندوق سے شروع ہوا تھا ترتیب فن وار ہے۔ کتابیں عربی۔ فارسی۔ اردو تینوں زبانوں کی ہیں۔ انگریزی کی بھی ۱۸۷ ہیں۔ جو فہرست بالا سے خارج ہیں۔ فہرستیں ایک سے زیادہ مرتب ہو چکی ہیں۔ اور بعض ہنوز زیر ترتیب ہیں۔ سرمایہ الحمدللہ برابر ترقی پذیر ہے۔ حال میں دہلی کے ایک کباڑی کے یہاں سے قدیم مطبوعات کے بہت سے نسخے ملے ہیں۔ [۵]

ہنوز آں ابر رحمت درفشانست
خم و خمخانہ با مہر و نشانست

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۴۱)

آج یہ مقالہ ارتجالاً پڑھا۔ اب کتابوں کی تعداد اس کتب خانہ میں ۶۰۹ مندرجہ فہرست ہے۔ تعداد مندرجہ مقالہ سے ۱۹۱۷ زائد یعنی ڈیوڑھی تعداد ہو گئی۔ فالحمدللہ تعالیٰ علیٰ ذالک۔ اور یہ بارہ سال میں ہوا ہے۔ اس طرح فی سال ڈیڑھ سو سے زائد کتابوں کا اضافہ ہوا۔ علاوہ فہرست بھی کتابیں ہیں۔ جو ہنوز درج فہرست نہیں ہوئی ہیں۔

حبیب الرحمٰن۔ ۹ رجمادی الاول ۱۳۶۳ھ
(۳ مئی ۱۹۴۴ء)

کتب خانہ حبیب گنج کی

فہرست کا گوشوارہ!

سابق میں اپنے کتاب خانہ کے قلمی سرمایہ کی فہرست مرتب کرنے کی اطلاع معارف کے ذریعہ سے اہل علم کو دی تھی۔ اس کے بعد ایک مرحلہ اور طے ہوا۔ اپنے ذوق کے مطابق ایک گوشوارہ تیار کیا ہے۔ اس کے عنوان بھی خود ہی تجویز کئے ہیں۔ قارئین معارف کی خدمت میں اصلاح و اطلاع کے لئے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے دوسرے کتاب خانے ان میں سے کسی عنوان کو اپنے لئے پسند فرمائیں۔ اس گوشوارے کا خیال یوں بھی ہوا کہ ایک انجمن خاتون یہاں صرف مثلاً مذہبی کتابیں دیکھنے آئی تھیں دکھائی گئیں۔ مگر فہرست جداگانہ نہ ہونے سے ملاحظہ تام نہ ہو سکا۔ گوشوارہ کے عنوان حسب ذیل ہیں۔

(عنوان چونکہ جدید ہیں اس لئے شاید نامانوس ہوں۔ یا ناموزوں۔ عدم موزونیت کی اصلاح کا ارباب ذوق سے آرزومند رہونگا۔)

(۱) **الٰہیات** } اس عنوان کے تحت صرف وہ کتابیں ہیں جو طلائی کلام کے لحاظ سے امتیاز رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کی مدد سے مختلف عہدوں اور ملکوں کے انداز اور

---

[۱] مولوی سید مولانا اسلام صاحب مظفر ۱۲ [۲] اس نسخہ پر سلاطین اودھ کی مہریں ہیں بہرہ سے ہدیہ ہونے پر معلوم ہوا کہ ان کے نانا غازی الدین حیدر بادشاہ کو ہدیہ کرتے تھے۔ [۳] بیدی کرامر حسین

کی۔ آخر میں شاہزادہ ممدوح کی مہر ہے جو بالآخر تخت پدری پر بیٹھے۔

(۷) کلام مجید۔ تقطیع اوسط دو صفحہ اول طلائی مینا کار۔ اعلیٰ نمونہ تذہیب، کاغذ گجراتی زرافشاں۔ سورتوں کے نام مطلا، بخط والا میتاء، کاتب ابوالفتح۔ فرخ سیر بادشاہ کے کتاب خانہ کا یہ نسخہ ہے۔

(۸) شرح قصیدہ لامیۃ العجم، بخط نسخ خفیر جید۔ بیت اللہ کے سامنے ۸۰۲ھ میں لکھی گئی۔ آخر میں عبارت درج ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ "بحکم خزانہ مولانا السید الجلیل الملک الاصیل مولانا سید ادریس (الفاظ بخط طلائی) بن حسین اعلیٰ اللہ کلمتہ یہ کتاب لکھی گئی۔ (اس کا تعلق خاندان شریف مکہ سے ہے) انقلاب زمانہ کے بعد یہ نسخہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے کتاب خانہ میں بھی رہا۔

(۹) دیوان خواجہ آصفی۔ خوشخط ایرانی قلم، جدول مطلا و مذہب، بین السطور مطلا کاغذ وصلی حنائی رنگ، دو صفحہ اول طلائی کار لاجورد۔ عبارت ذیل اس پر درج ہے "کتب خانہ مبارک سلطان محمد صفوی"، ملقب بہ سلطان محمد خدا بندہ دام ملکہم و حشمتہم در سنہ ۹۲۵ تحریر فقیر اسمٰعیل ترکان تحویلدار" اس کتاب پر سرگور اوسلے کے بخط انگریزی دستخط ہیں۔

(۱۰) صحیح بخاری، المجلد الاول، خط عرب کاغذ سمرقندی۔ سنہ کتابت درج نہیں۔ آخر میں دو تحریریں ۸۷۷ھ کی ہیں۔ لوح کتاب طلائی جس میں عبارت ذیل خط نسخ شنگرفی میں لکھی ہوئی ہے۔

"جلد اول صحیح بخاری بخط نسخ عرب بر آخر کتاب خط حضرت شیخ المحدثین عفیف الدین گازرونی ست جلد سیاہ ترنج سرخ، مجدول طلا نو بستہ باتہ فتح شیر محمد آباد المعروف بہ بیدر ثبت کتاب خانہ معمورہ عالم پناہ ابراہیم عادل شاہ خلد اللہ ملکہ شدہ در شعبان سنہ ۱۰۲۹ھ" شیخ عفیف الدین گازرونی شارحین صحیح بخاری میں سے ہیں۔ کشف الظنون میں ان کا اور ان کی شرح کا ذکر ہے۔

(۱۱) مشکوٰۃ المصابیح خط نسخ جید کاغذ باریک، چکنا، مطلا مذہب۔ فہرست بخط طلائی۔ لکھی۔ ۸۸۴ھ میں شہر بیدر میں لکھی گئی۔ کاتب ابوسعید بن حسین تاجر مشہور بہ مال امیری۔ عبارت لوح کا ایک حصہ محو شدہ ہے۔ تاہم اس قدر واضح ہے کہ یہ کتاب سلطان محمود شاہ بہمنی سلطان بیدر کی نذر کی گئی۔ وفات محمود شاہ بہمنی سنہ ۹۲۴ھ (فرشتہ)

(۱۲) تفسیر جلالین۔ تقطیع کلاں، مطلا و مذہب، خط کلام اللہ نسخ شنگرفی خط تفسیر شکستہ تعلیق سنہ ۱۰۷۹ھ میں رضی الدین محمد تفرشی نے دار السلطنت حیدر آباد میں بعہد تانا شاہ لکھی۔ اس تفسیر میں دو جگہ سلطان ابوالحسن قطب شاہ عرف تانا شاہ کے حاشیے ہیں۔

(۱۳) مثنوی مجمع البحرین قصہ ناظر و منظور کاتبی نیشاپوری، تقطیع خرد خوشخط، خط سمرقندی قدیم، کاغذ سمرقندی، اس پر تین سلاطین قطب شاہی کی مہریں ہیں۔ ایک سلطان محمد قطب شاہ کی ؎

مہر سلیماں ز حق گشتہ میسر مرا
نقش نگیں دل شدہ مہر حیدر مرا

مہر کے درمیان یہ الفاظ ہیں "العبد سلطان محمد قطب شاہ"

دوسری سلطان محمد ابراہیم قطب شاہ کی ؎

کسے کہ ساخت نقش نگیں مہر آل مقیم
بود سپہر کرم قطب شاہ ابراہیم

تیسری محمد قلی قطب شاہ کی اس میں درج ہے۔ "العبد محمد قلی قطب شاہ"

(۱۴) دیوان امیر شاہی سبزواری۔ خوشخط نستعلیق جلی قلم۔ کاغذ گلابی۔ تقطیع اوسط کاتب نتیج چند۔ بے تاریخ کتابت۔ اس پر تین مہریں ہیں۔ ایک مربع کلاں بخط سیاہ، نواب آصف الدولہ بہادر کی۔ دوسری مربع نصیر الدین حیدر کی۔ تیسری امجد علی شاہ کی۔ (دونوں خوشخط شنگرفی) نواب آصف الدولہ کی مہر کی عبارت یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ آصف الدولہ، شاہ نصیر الدین حیدر کی مہر کی عبارت ؎

خوش ست مہر کتب خانہ سلیماں جاہ
بر کتاب مزین چو نقش بسم اللہ

امجد علی شاہ کی مہر ؎

بسنخ بر مہر شد چوں شد مزین بر کتاب
خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب

(۱۵) بوستان شیخ سعدی شیرازی خوشخط جدول زرد و سرخ مورخہ ۱۲۰۶ھ بے اسم کاتب شاہان اودھ کی مہریں، ایک نصیر الدین حیدر کی۔ دوسری امجد علی شاہ کی۔ تیسری واجد علی شاہ کی۔ عبارت مہر واجد علی شاہ ؎

ثابت و پر نور بادا تا فروغ آفتاب
خاتم واجد علی سلطان عالم بر کتاب

اس پر جارج بیلی رزیڈنٹ لکھنؤ کے دستخط و مہر بھی ہے۔ دستخط انگریزی ۱۸۱۱ء مہر بخط نسخ طغرائی۔

(۱۶) تاریخ فارس۔ خط جلی صاف۔ کاتب خانہ زاد بارگاہ آسمان جاہ سلطانی حسین علی۔ تاریخ کتابت ۱۲۳۸ھ رائنسا پڑ نامی ایک سیاح پٹر برگ سے فتح علی شاہ قاچار کے عہد میں ایران گیا تین برس وہاں رہا۔ اس کا سفر نامہ ہے۔ اس میں علاوہ ایران کے روسی شہروں کا بیان بھی آگیا ہے۔

غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کے حکم سے محمد صالح نے کرشن موہن انگریزی داں کی مدد سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ:۔

"ہر روز جس قدر ترجمہ کیا جاتا شاہی ملاحظہ میں پیش ہوتا۔ خود بدولت کی اصلاح کے بعد درج کتاب ہوتا۔ اسی طرح ساری کتاب شاہی اصلاح سے مزین ہے"

اس نسخہ پر شاہان اودھ کی چار مہریں ہیں۔ ایک نصیر الدین حیدر کی۔ دو امجد علی شاہ کی ایک لوح پر ایک آخر میں، چوتھی واجد علی شاہ کی۔ متعدد جائزے ہیں۔

شاہی کتاب خانوں کا گوشوارہ جن میں مذکورہ بالا کتابیں رہیں

سلاطین تیموریہ ہندوستان (سات) شاہان صفویہ ایران (ایک) شریف مکہ مکرمہ (ایک) سلاطین بہمنیہ بیدر (دو) قطب شاہی (تین) عادل شاہی (ایک) بادشاہان اودھ (تین)

جملہ ۱۸ دو کتابیں شمار میں مکرر ہیں جو دو دو کتاب خانوں میں رہیں۔

اصلاح معاشرت

گزشتہ صدی کا ایک سبق آموز واقعہ

آج سے سو برس اُدھر کا زمانہ (جو تاریکی و جہالت کا دور مانا جاتا ہے) اس میں بھی ایک اجلاس شعبہ اصلاح معاشرت کا ہوا تھا۔ اسی علی گڑھ کے ضلع میں بھیکن پور کے قلعہ کے صحن میں ایک خیمے کھنچے تھے۔ اس کی روئداد خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔

محمد خان زماں خاں صاحب مرحوم

(میرے دادا مجید) شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی کے مرید تھے۔ ایک بار رسوم شادی و غم کے متعلق خان صاحب ممدوح نے ایک استفتاء مرتب فرمایا جس میں چھتیس (۳۶) سوال شادی و غم کی رسوم مروجہ خاندان شروانی کی بابت درج تھے۔ یہ استفتا جواب کے لئے شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں مولوی سید ابو محمد صاحب جلیسری کی معرفت (جو شاہ صاحب کے شاگرد تھے۔) پیش کیا گیا۔ شاہ صاحب نے چار سوال کا اضافہ کر کے جواب تحریر فرمایا۔

اب یہ فتویٰ بھیکن پور آیا۔ دادا صاحب نے اپنے بڑے بھائی حاجی محمد داؤد خاں صاحب مرحوم کو دکھایا۔ جو سردار خاندان تھے۔ بڑے بھائی نے دیکھ کر فرمایا مجھلے میاں فتویٰ آیا ہے تو اس پر عمل ہونا چاہیئے۔ خاندان کے سرگروہ بھائیوں کو طلب کرو ان کو دکھاؤ۔ چنانچہ اجلاس طلب ہوا بھائیوں نے فتویٰ سے اظہار عقیدت کیا۔ اس پر حاجی محمد داؤد خاں صاحب نے فرمایا کہ عقیدت ہے تو اس پر عمل کرو۔

اس زمانے میں خاندان شروانی میں مثل دیگر خاندانوں کے رسوم کا شادی و غمی میں ایک طوفان برپا تھا۔ مثلاً شادی میں ناچ رنگ۔ آتشبازی آرائش وغیرہ۔ ساری رسمیں جاری تھیں۔ علیٰ ہذا القیاس

عمل کا ارشاد سن کر مزید بحث ہوئی قرار یہ پایا کہ اس جلسہ کے بعد جو شادی ہو اس میں فتوے کے مطابق اصلاح جاری ہو جائے۔

معلوم ہوا ہے کہ اس کے بعد پہلی شادی الہ وردی خاں رئیس چھرہ کے یہاں ہونے والی تھی۔ ان سے فرمائش ہوئی کہ اصلاح پر پہلا قدم وہ اٹھائیں۔ اور خلاف شرع تمام رسوم ترک کر دیں۔ وہ سن کر گھبرا گئے اور کہا داؤد خاں جی سارا خاندان بگڑ جائے گا۔ اور مجھ کو چھوڑ دے گا۔ فرمایا ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اس سے ہمت ہوئی۔ اور کمر بستہ ہو گئے۔

چنانچہ شادی سے قبل اعلان کیا کہ میرے ہاں شادی میں کوئی رسم خلاف شرع نہ ہوگی۔ نہ ناچ رنگ نہ آتشبازی اور نہ کوئی اور رسم۔

اس پر سارا خاندان بگڑا۔ اور اعلان کیا کہ ہم اس شادی میں شریک نہ ہوں گے جو بزم ماتم بنے۔

حاجی محمد داؤد خاں صاحب نے اعلان کیا کہ ہم شریک ہوں گے۔ اس پر خاندان کی مخالفت کا جوش کم ہوا۔ شادی ہوئی رسوم موقوف ہوئیں اسی کا رواج سارے خاندان میں ہو گیا۔

اس واقعہ کو سو برس سے زائد زمانہ گذر چکا شروانی خاندان کی مردم شماری کم و بیش دو ہزار ہے۔ قریباً دو سو میل مربع کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔

اس تمام خاندان میں سو برس کے عرصہ دراز ایک شادی کا واقعہ بیان نہیں کیا جا سکتا، جس میں ناچ رنگ ہوا ہو۔ آتشبازی چلی ہو یا اور کوئی خلاف شرع رسم ہوئی ہو۔ آج تک سارے خاندان میں پیدائش سے لے کر وفات تک ساری رسمیں اسی طریقہ پر جاری ہیں۔ جو اس وقت اللہ کے بندوں نے جاری فرمایا تھا۔

یہ تھی اس زمانے کے شعبہ اصلاح کے ایک اجلاس کی روئداد اور اس کے نتائج

ذوق کا پتہ لگ سکتا ہے۔ ماوراء النہر، ایران، عرب، ترکی، کشمیر، ہندستان وغیرہ ممالک کا ہنر سامنے آجاتا ہے۔ مختلف ادوار کی ترقی و تنزل مذاق کا پتہ لگ سکتا ہے۔

(۲) **الخطاطیات** } اس عنوان کے تحت میں مسلّم خطاطوں کی کتابیں درج ہیں۔ مثلاً میر عماد، میر علی کاتب وغیرہا۔

(۳) **المخطیات** } یہ وہ کتابیں ہیں جو اعیان ملک کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ یا ان کے خط سے مزین ہیں۔ مثلاً ابوالحسن آصف خاں شاہ جہانی۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔

(۴) **المجلدات** } قدیم جلد سازی کے نمونے۔

(۵) **السلطانیات** } جن کتابوں کا سلاطین سے خاص تعلق ہے۔ وہ اس عنوان میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ابراہیم عادل شاہ کے کتاب خانہ کی صحیح بخاری، حصن حصین کا نسخہ پیش کش شاہزادہ عالی جاہ اعظم شاہ بحضرت عالمگیر بادشاہ در ۱۵ سنہ جلوس۔

(۶) **الفتوحیات** } وہ کتابیں جو سلاطین کے کتاب خانوں میں فتح کے مال غنیمت میں سے داخل ہوئیں مثلاً مثنوی گوئے چوگاں ملا عارفی نوشتہ میر علی کاتب جو عالمگیر بادشاہ کے کتاب خانہ میں گولکنڈہ کی فتح کے مال غنیمت میں سے داخل ہوئی۔

(۷) **المقامیات** } وہ کتابیں جن پر مقام تحریر وغیرہ درج ہے۔ مثلاً قسطنطنیہ، مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، بلخ، بخارا وغیرہ دارالسلطنتوں سے لے کر دیہات تک سو سوا دو سو کے نام اس فہرست میں ہیں۔ کبھی ہمارے علمی فیض سے ایک عالم منور تھا۔ اب یاد ہے اور حسرت ایک مقام تو سرون ہے۔ معجم البلدان میں اس کا پتہ نہیں۔ شاید اہل معارف پتا بتا سکیں۔

(۸) **الختمیات** } جن کتابوں پر مہریں ہیں۔ اس فہرست سے ذوق ادب کے سوا مہروں کی تاریخ عیاں ہو جاتی ہے بعض مہریں کس قدر دلگیر ہیں۔ نظام الدین بیچارہ نے اپنے نام "ایں نیز بگذرد" اس مہر کو بار بار پڑھا۔ کتاب کو دیکھا۔ دل نے کہا۔ ع آخر گزر ہی گیا جب سے اب تک خدا معلوم کیا کیا اور کون کون گزر گیا۔ ایک مہر عجیب ہے مدوّر ہے امراد شاہی کی شان کی۔ نہایت خوشخط واضح الحروف ہے۔ الفاظ بجنسہٖ نقل کئے جاتے ہیں شاید کسی طرف سے روشنی پڑے۔ کہ یہ کون امیر تھے کس نسل یا ملک کے۔ نقل یہ:-

{ محمد شاہ بادشاہ غازی[1]
{ دو بینک دیل دیر یانوں فدوی ۱۱۵۰

یہ مہر جس کتاب پر ہے وہ زلور کا ترجمہ ہے۔

[1] دار السلطنت دہلی میں ایک پرتگال خاندان تھا جس کو دربار بہادر شاہ اول سے بارہ گانوں کی جاگیر کا پروانہ عطا ہوا تھا۔ یہ جاگیر انگریزی عملداری میں بھی جاری رہی۔ اس خاندان کا ایک فرد جنرل انزل دیر یانوں ۱۸۲۹ء میں بمقام دہلی فوت ہوا جس کی قبر کشن گنج کے قبرستان عیسوی مدفن میں ہے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مہر اسی خاندان سے عہد محمد شاہی میں تھا۔ مہر کے الفاظ کو یوں پڑھنا چاہیئے۔
"دو بینک دیل دیر یانوں فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی ۱۱۵۰" اصل پرتگالی نام کا املا بخط انگریزی DOMINIC WAL DURMAO.
(ں نون غنہ کی دہری آواز پرتگالی زبان میں دیتا ہے۔ (اقتباس از خط مسٹر عبداللہ یوسف علی سابق سولین صوبہ متحدہ بحوالہ پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل بابتہ دسمبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۵۵ - ۱۶۰)

(۹) **الاقاربیات** } یہ وہ کتابیں ہیں جن کا میرے رشتہ داروں سے تعلق ہے۔ ان کی تالیف ہیں یا حاشی سے مزین ہیں۔ زر اُن کے لکھی گئی ہیں۔ یا ان کے کتاب خانوں سے ملیں۔ وغیر ذالک۔

(۱۰) **الاستاذیات** } اس عنوان میں وہ کتابیں رکھی گئی ہیں جو میرے استادوں کے سلسلے میں سے کسی بزرگ کی لکھی ہوئی ہیں۔ یا محشی بقلم خاص ہیں۔ یا ان کے خط سے کسی دوسرے عنوان سے مزین ہیں۔ وغیر ذالک۔

(۱۱) **الحسنیات** } ان میں وہ کتابیں ہیں جو بلحاظ خط نادر ہیں۔ (غیر خطاطیات)

(۱۲) **القرطاسیات** } اس میں کاغذوں کے اقسام دکھائے گئے ہیں۔ مثلاً گجراتی۔ سمرقندی وغیرہ۔ وغیرہ۔

(۱۳) **العتیقات** } نویں صدی ہجری یا اس سے قبل کی کتابیں۔ سب سے قدیم نسخہ پانچویں صدی کا ہے۔

(۱۴) **الخطوط** } اس میں مختلف خطوں کی تشریح ہے۔ مثلاً خط نسخ بغدادی، عربی، ایرانی، کشمیری، ہندی، بہاری وغیرہ۔

(۱۵) **المصنفیات** } بخط مصنف۔ یا نسخہ مصنف سے منقول یا مقابلہ شدہ وغیرہ۔ مثلاً الاجوبہ والاسولہ للامام القشیری رح خود امام کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ارتیاح الاکباد بارباح فقد الاولاد للحافظ شمس الدین سخاوی رح ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی۔ (تبعض حصے) فقط

شاہی کتاب خانوں کی کتابیں

(کتاب خانہ حبیب گنج میں)

(۱) کلام اللہ المجید کے پانچ ورق بخط کوفی ۱۸۴۲ء میں جب لارڈ ایلنبرا کے عہد میں ملک سندھ کا الحاق ہوا تو وہاں کے کتاب خانہ سے ایک کلام مجید کے نسخہ کے پچاس ۵۰ یا ساٹھ ۶۰ ورق مال غنیمت میں کلکتہ آئے۔ یہ نسخہ مختلف بادشاہوں کے کتاب خانوں میں رہ چکا تھا۔ جن کی مہریں اور دستخط اس پر ثبت تھے۔ منجملہ ان کے شاہ جہاں بادشاہ کے قلم کی یہ عبارت درج تھی:-
"بخط شاہ مرداں رض یک ہزار مہر طلائی ہدیہ نمودہ شد"
شاہ جہاں کی مہر بھی تھی۔ مولوی مسیح الدین خاں صاحب علوی رئیس کاکوری اس زمانے میں نواب گورنر جنرل کے میر منشی تھے۔ مولوی صاحب موصوف نے گورنر جنرل کی اجازت سے یہ پانچ ورق بطور تبرک اپنے جد امجد کے واسطے لئے۔ مولوی صاحب کے خاندان سے حبیب گنج پہنچے۔ حالات بالا کی تصدیق بقلم مولوی صاحب موصوف ان اوراق کے ہمراہ داخل کتاب خانہ حبیب گنج ہوئی ہے۔

(۲) حصن حصین امام جزری ۸۹۰ھ کا لکھا ہوا نسخہ وفات مصنف کے ستاون ۵۷ برس بعد کا لکھا ہوا میرک شاہ مرحوم محدث مشہور کے قلم کے حواشی خط نسخ جید۔ مطلا۔ کاغذ سمرقندی۔ شاہزادہ اعظم شاہ کی پیش کش عالمگیر بادشاہ کے حضور میں۔ ۱۱۱۷ھ م ۵۰ سنہ جلوس میں عالمگیر بادشاہ کے قلم کا صاد ثبت ہے۔ شاہی امراء تجو یلدار ان کتاب خانہ کی مہریں ہیں۔ جائزے ہیں۔

(۳) مثنوی گوئے وچوگاں ملا عارفی، پوری کتاب استاد مشہور ملا میر علی کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی۔ خط نستعلیق نہایت کمال خطاطی کا۔ بمقام ہراۃ ۹۲۶ھ میں لکھی گئی۔ اول یہ کتاب قطب شاہیوں کے کتاب خانہ میں رہی۔ جب عالمگیر بادشاہ نے گولکنڈہ فتح کیا تو تیموری کتاب خانہ میں داخل ہوئی۔ کتاب پر شاہی کتاب خانہ کی جو عبارت درج ہے وہ ان بیانات کی شاہد ہے۔ گردش زمانہ سے قیمت، کتاب میں جو تغیرات ہیں، وہ عبرت افزا ہیں۔
عالمگیری کتاب خانہ کا اندراج قیمت دو ہزار روپیہ ہے۔ ۱۱۹۷ھ میں دو سو روپیہ میں فروخت ہوئی۔ اس کے بعد ۱۲۹۷ھ میں قطب الدولہ نے ڈھائی سو روپیہ میں خریدی یہاں ۱۳۲۱ھ میں ایک سو روپے میں آئی۔

(۴) مثنوی مولانا روم ۷۱۲ھ کا لکھا ہوا نسخہ۔ مولانا روم کی وفات ۶۷۲ھ میں ہوئی اس طرح یہ نسخہ وفات مولانا کے چالیس برس بعد لکھا گیا۔ جہاں تک علم ہے اس سے زیادہ قدیم نسخہ موئخ کے کتاب خانہ میں ہے۔ جو ۶۷۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔
برٹش میوزیم کا نسخہ ۷۱۸ھ کا ہے۔ کتاب خانہ حبیب گنج کا نسخہ عالمگیر بادشاہ کے کتاب خانہ کا ہے۔ اس پر چار مہریں بادشاہ ممدوح کی ہیں۔ جن میں الفاظ "محمد اورنگ زیب بادشاہ" ثبت ہیں۔ یہ مہریں مدور ہیں۔

(۵) لوائح مولانا جامی رح، عنوان طلائی لاجوردی، مطلا و مذہب۔ کاغذ وصلی زرافشاں حاشیہ زر افشاں، مختلف رنگ، خط استادانہ، کاتب محمد محسن الہروی، محررہ ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ لوح کتاب پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔
"لوائح بابتہ گذرانیدہ میر معز، چہاردہم ربیع الثانی ۱۰۹۶ھ داخل کتاب خانہ سرکار عالی شد"
اس عبارت کے اوپر قابل خان زاد عالمگیر بادشاہ کی مہر ہے۔ ایک اور اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر الامراء شائستہ خاں کے اموال کی بابتہ ۱۱ سنہ جلوس میں داخل ہوکر محمد باقر کی تحویل میں سپرد کی گئی۔ اس کے بعد متعدد تحویلوں اور جائزوں کی عبارتیں درج ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۹۶ھ (مطابق ۲۷ سنہ جلوس) میں امیر الامرا شائستہ خاں کو رحلت ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد ۲۸ سنہ جلوس میں مکرر داخل کتاب خانہ شاہی ہوئی ایک اور اندراج سے ۳۲ سنہ جلوس میں بھی داخل کتاب خانہ شاہی ہونا واضح ہوتا ہے۔

(۶) منہاج العابدین امام غزالی رح چھوٹی تقطیع۔ متن منزوش بہ طلا۔ خوشخط نسخ کاغذ باریک حلبیا۔ شاہزادہ محمد معظم شاہ عالمگیر بن عالمگیر بادشاہ غازی کے کتاب خانہ

لیا وہاں سے جا کر عم محترم سے کہا کہ "لڑکا سمجھتا ہے۔"

(۶) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی کے بعد مولوی عبد الغنی خاں صاحب (جو اجلۂ تلامذہ مولانا لطف اللہ صاحب سے تھے) تشریف لائے قطبی سے پڑھانا شروع کیا۔ قطبی، میر قطبی، مختصر المعانی، ہدیہ سعیدیہ پورے اہتمام و کاوش سے پڑھائیں۔ مطالعہ کی سخت تاکید تھی۔ اس کی خامی پر تنبیہ فرماتے۔

فقہ میں ہدایہ اخیرین کتاب الرہن تک منطق ملا حسن تک پڑھائی۔ اصول فقہ میں نور الانوار اور توضیح تلویح مقدمات اربعہ تک پڑھی۔ حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین تفسیر بیضاوی (سورۂ بقر تک) اسی کے ساتھ انگریزی کی تعلیم ہوتی رہی۔

(۷) اس زمانے کے بعد ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ حاضر ہوا۔ مولوی لطف اللہ صاحب کی خدمت میں زانوئے تلمذ ادب سے تہ کیا۔ حمد اللہ، قاضی مبارک، میر زاہد رسالہ (مع غلام یحییٰ) مولانا سے پڑھا۔

(۸) شمائل ترمذی، سارے نو پارے صحیح بخاری کے شیخ حسین صاحب عرب بھوپالی سے پڑھے۔ باقی روایات کی سند عطا ہوئی۔

(۹) حدیث المتحابان فی اللہ الخ کی روایت حضرت پیر و مرشد مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی قدس سرہٗ نے (جو موصوف کو شاہ عبد العزیز صاحب سے پہونچی تھی) عطا فرمائی۔

(۱۰) چہل حدیث شاہ ولی اللہ صاحب کی قاری عبد الرحمٰن صاحب پانی پتی (تلمیذ شاہ اسحٰق صاحب مرحوم) سے پڑھی۔ باقی روایات کی سند دی۔

(۱۱) مکہ مکرمہ میں قاری سید عبد الرحیم صاحب کو (جو مصر اور قراء کے دور سابق کی یادگار تھے) کلام مجید پورا سنایا۔

(۱۲) مدینہ طیبہ میں قاری حسن شاعر سے ایک رسالہ قرأت پڑھا۔ آخری سبق مسجد نبوی میں پڑھایا اور سند قرأت عطا فرمائی۔

(۱۳) شیخ حبیب اللہ الشنقیطی سے حدیث مصافحہ و مشابکہ کی نیز دیگر مرویات کی سند حرم شریف میں حاصل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

انگریزی

(۱) مولوی غلام محمد صاحب کی تعلیم عربی کے زمانے میں ۱۸۸۳ء میں ماسٹر عبد الرشید خاں صاحب ساکن علی گڑھ تعلیم یافتہ محمڈن کالج سے انگریزی شروع کی۔ جو ۱۸۸۶ء تک جاری رہی۔

(۲) ۱۸۸۶ء میں آگرہ جا کر باقاعدہ آگرہ کالج کے ہائی اسکول میں درجہ ہشتم میں داخل ہوا۔ ۱۸۸۸ء تک یہ تعلیم جاری رہی۔

(۳) علاوہ اسکول کی تعلیم کے مسٹر ڈرمن ہیڈ ماسٹر اور (۴) مسٹر کالی سکینڈ ماسٹر سے انگریزی ادب حاصل کیا۔ وہاں سے علی گڑھ آکر (۵) مسٹر ہورسٹ ہیڈ ماسٹر محمڈن کالج ہائی اسکول اور (۶) مسٹر ڈیبے بن ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ سے انگریزی ادب پڑھنے اور لکھنے کی مشق کی تعلیم انگریزی کے دوران میں الحمد للہ کبھی تعلیم مذکور کر تعلیم عربی پر غلبہ نہیں ہوا۔ بلکہ تعلیم عربی پوری توجہ کے ساتھ جاری رہی۔ اسی وجہ سے انگریزی میں زیادہ ترقی نہ ہو سکی۔

طریقۂ حساب کاغذات ریاست (جس کو اصطلاحاً سیاق کہتے ہیں) حبیب اللہ خاں ساکن بھیکن پور و حبیب گنج سے سیکھا۔ جو اس فن کے ماہر تھے۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی کنارہ کشی پر میرے سپرد فرمائی گئی ہے۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو اس بار گراں کے تحمل کا اہل نہیں سمجھا اس لئے میرے حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہ تھا۔ کہ قرعۂ فال "میرے نام نکلے گا۔" لیکن اب کہ انتخاب ہو چکا۔ تو میں صداقت اور اعتراف بے مائگی کے ساتھ اپنی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔

سب سے اول میں نے بارگاہِ ربانی میں عاجزانہ دعا کہ مجھ کو امت کی خدمت گذاری کی توفیق اور قوت عطا فرمائی جائے۔ وما توفیقی الا باللہ

کام جس قدر اہم اور وسیع ہے اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ "عیاں راچہ بیاں" اسی کے ساتھ مسئلہ تعلیم اس قدر نازک اور غور طلب ہے کہ اس کے ہر ایک شعبہ اور پہلو کا حل صرف ماہرانہ نظر اور رائے کا محتاج ہے۔ مجھ کو اولاً تو ہم میں بے مائگی کا اعتراف ہے اس طرح آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ میں قدم قدم پر کس قدر مشورہ ہمدردی اور امداد کا محتاج ہوں۔ یقین ہے کہ بزرگان ملت ہمدردی اور مشورہ میں کبھی ذرہ دریغ نہ فرمائیں گے۔

مجھ کو حاضر خدمت ہوئے ابھی چند ہفتے ہوئے ہیں اسلئے ظاہر ہے کہ آئندہ کی کارروائیوں کا کوئی نظام پیش کرنا یا اپنے ارادے کا اظہار بالکل قبل از وقت ہے لیکن اتنی گذارش کی جسارت کرتا ہوں کہ کوئی فرقہ وارانہ اصول یا خیال میرا نصب العین نہیں ہے۔ اور میں صدق دل سے بدون شائبہ کسی ذاتی غرض کے ادائے خدمت اور کار آمد و مفید مشورے کے قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کیلئے تیار ہوں

بایداں منزل عالی نتوانیم رسید
ہاں اگر پیش نہد لطف شما گامے چند

۹ ستمبر ۱۹۱۷ء

صدر یار جنگ عالی مرتبت والا صفات

(از حضرت برق زیدی)

صدر یار جنگ عالی مرتبت والا صفات
آپ اپنی شان کے تھے ایک انساں لاجواب

عزت و دولت شجاعت آپ کے تھی ہمرکاب
زندگانی کی ہر اک منزل میں پایا کامیاب

قوم شروانی کے چہروں سے اٹھا دی یوں نقاب
مصحفِ رخ بن گیا ہر فرد کا ام الکتاب

میکدہ میں آپ کے ہر بادہ کش ہے باریاب
حافظ و جامی بنا ہے پی کے روحانی شراب

آپ افغانی مجالس کے رہے صدر الصدور
ہیں ستارے ان میں گر آپ شکِ مہتاب

آپ نے زہاد میں پایا وہ عالی مرتبہ
قدسیانِ عرش لا سکتے نہیں جس کا جواب

آپ کا ایمان حبِ اہل بیتِ مصطفیٰ
آپ کے دامن میں لاکھوں نیکیاں بیحد ثواب

وجہ تخلیق دو عالم آدمیت آپ تھے
آپ ہی کی ذات سے ہے آدمیت مستجاب

آپ کی پاکیزگی پر ہے فرشتوں کو بھی رشک
آپ نے جنت میں پایا وہ مقام لاجواب

خانداں کے ہر بشر نے پائی راہِ مستقیم،
ہے چراغ علم روشن گھر میں مثلِ آفتاب

آپ کی خدماتِ علمی، دین و دنیا بیکراں
آپ کے احسان ملک و قوم پر ہیں بیحساب

برق کے اجداد سے تھا عالمانہ ارتباط
آپ کھل جاتے تھے ان کو دیکھ کر مثلِ گلاب

گنج مراد آباد ضلع اناؤ

مجھ کو ایک زمانہ سے مراد آباد کی حاضری کی آرزو تھی۔ اور باعث آرزو اشتیاق قدم بوسی حضرت شیخ علیہ الرحمۃ تھا۔ مولانا فضل الرحمن صاحب مدظلہم تھا۔ چند بار قصد کیا لیکن محروم رہا۔ بارے اب کے آرزو پوری ہوئی۔ اور شرف پابوسی موجب سربلندی ہوا۔ جمعہ ۲۰ رجب ۱۳۰۸ھ کو قصبہ مراد آباد بیاں سے روانہ ہوکر کانپور پہونچا۔ استاذی مولانا عبدالغنی خاں صاحب (مرید حضرت شیخ) کی معیت تھی۔ وہاں ایک وجہ خاص سے ایک روز توقف کرنا پڑا۔ دوسرے دن کانپور سے قصبہ بلہور میں آیا۔ یہاں سے پالکی میں سوار ہوکر مراد آباد کو چلا۔

راستہ میں تھوڑی دیر میں ایک ندی السین نامی پڑی۔ پھر کچھ دور جاکر گنگا تھی۔ صبح کا وقت ابر گھرا ہوا گنگا پر عجیب لطف دیتا ہوا تھا۔ دس بجے مراد آباد پہونچا۔ دریافت ہوا کہ اس وقت حضرت درس حدیث میں مشغول ہیں۔ اس لئے بازار کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مسجد کے اندر ایک مقبرہ میں جا بیٹھا۔ یہ مقبرہ خدا جانے کس زمانہ کا ہے۔ بیچ میں ایک قبر بنی ہوئی ہے وہ برش کے سبب سیاہ ہو رہا ہے۔ ایک طرف ستیل پانی کا فرش پڑا تھا۔ اس پر اور چند آدمی (جو حصول زیارت کے واسطے آئے تھے) بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی جا بیٹھا۔ مولانا اگرچہ فاصلہ پر تشریف رکھتے تھے مگر یہاں اور مسجد سے باہر وہ رعب طاری تھا کہ کوئی فرد بشر باآواز بلند بات کرنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ اور بے تکلف یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی زبردست حاکم کے باہر آنے کے منتظر ہیں۔

ایک گھنٹے کے بعد شرف حضوری حاصل ہوا۔ حضرت چارپائی پر تشریف رکھتے تھے میں زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ تھوڑے سے دریافت حال کے بعد اشعار نعتیہ بکمال شوق دو دو لہ پڑھنے لگے۔ چند منٹ کے بعد حجرے میں تشریف لے گئے۔ مجھ کو بھی اندر آنے کے لئے ارشاد فرمایا بزرگوں کے حالات بیان فرمائے۔ مثنوی شریف کے شعر پڑھے۔ الحق کہ مثنوی شریف کے شعر عجیب درد سے پڑھتے تھے۔ منجملہ اور اشعار کے یہ شعر بھی تھا۔

صحبت مردان گرت یک ساعت است
بہتر از صد خلوت و صد طاعت است

کچھ عرصہ کے بعد استراحت کے واسطے رخصت فرمایا۔ حضرت کا قامت بلند، بدن دوہرا۔ رنگ گورا۔ ڈاڑھی چھوٹی۔ نہایت سفید، آواز بھاری۔ اور باطنی کیفیت میں ڈوبی ہوئی۔ حضرت کا لباس ڈھیلا انگرکھا ڈھیلا پاجامہ۔ دو پلڑی ٹوپی تمام سرکو ڈھکے ہوئے تھی۔ کمنت کا جوتا جس کی ایڑی بیٹھی ہوئی۔ حضرت کا حجرہ پرانا اور تنگ، ایک طرف چارپائی اس پر زرد اور دری پڑی ہوئی۔ (زرد اور دری دونوں نئے شاید پندرہ روز کے ہوں گے) ایک طرف چوکی اس پر کچھ مٹی کے برتن اور قلمدان۔ باقی جگہ میں شکستہ و کہنہ بوریا بس۔ بعد ظہر مسجد میں تشریف لاکر حدیث شریف کا درس فرمایا جس میں حاضر ہونے کی مجھ کو بھی عزت حاصل ہوئی۔

ایک گھنٹے کے بعد حجرہ میں رخصت کے واسطے طلب فرمایا۔ اور دعائے خیر کے بعد اجازت فرمائی۔ یہ مسجد (جس میں حضرت کا قیام ہے) نہایت پرانی اور مرمت طلب ہو رہی ہے مسجد کے دروازے میں داخل ہونے پر جانب راست ایک مقبرہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے اس کے سامنے مغربی جانب کو چند قبریں، ایک کنواں اور کچھ دور حجرہ مبارک ہے۔ گرد کے مکان بھی کہنہ و ویران ہیں۔ غرض کوئی چیز اہل دنیا کی دلچسپی کی نہیں ہے۔ مگر صد ہا امیر و غریب تونگر و مفلس آتے ہیں۔ اور جاتے ہیں۔ ایک کشش ہے کہ سب کو کھینچتی ہے۔ کسی فن کا آدمی ہو۔ جب تک خود ہم کو اس میں مداخلت نہ ہو ہم نہیں جانتے کہ وہ کیسا ہے۔ کامل یا ناقص۔ استاد یا اناڑی اگر ہم اصول اقلیدس سے واقف نہیں تو اگر ایک شخص کسی شکل مشق کو حل کرے تو ہم یہی کہیں گے۔ کہ کچھ لکیریں کھینچتا ہے۔ اس کا کیا نفع ہے۔ یا اس کا حل کس ذہن و دماغ کا کام ہے۔ یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے ایسا ہی کچھ تصوف کا حال ہے۔ جب تک ہم صاحب حال نہ ہوئے یہ مراحل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ مطلب صاف ہونا ممکن نہیں ہے۔ عوام کرامات کو دیکھتے ہیں مگر صوفیائے کرام نے کرامت کو حیض کہا ہے۔ حضرت کی خدمت میں پہونچ کر دو زبردست خیال میرے دل پر طاری ہوئے جن کے سبب یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے حضرت کا مرتبہ پہچان لیا۔ لیکن یہ جانا کہ ہم میں اور ان میں سوائے ظاہری مشابہت کے اور کوئی مشابہت نہیں۔ ہمارے خیال سے ان کے خیال الگ اور ہمارے ارادوں سے ان کے ارادے جدا ہمارے مشاغل سے ان کے مشاغل علیحدہ ان کی امیدیں اور خوشیاں اور خوف اور مقصود اور۔ آگ لکڑی کو جلاتی ہے ہم بھی دیکھتے ہیں۔ اور ان کے بھی پیش نظر ہے لیکن ہم کیا سمجھتے ہیں اور ان کے ذہن میں کیا آتا ہے۔

اول خیال تو یہ تھا کہ مراد آباد دنیا میں ہے اور گاؤں نہیں قصبہ ہے لیکن حضرت کی مسجد میں ایک دوسرا عالم نظر آتا تھا دنیاوی معاملات کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ خود حضرت کی گفتار و کردار اور وہاں کے اہل قیام کے احوال سے (عام اس سے کہ وہ چند گھنٹے کے آئے ہوں یا دو چار برس سے رہتے ہیں) یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ایسے لوگ ہیں جو تعلقات دنیا سے کنارہ کر آئے ہیں۔

حیدر آباد کے امیر کبیر نواب خورشید جاہ بہادر جو ۵۲ لاکھ کے جاگیردار ہیں۔ میرے پہنچنے سے صرف ایک روز پہلے وہاں آئے تھے۔ مگر ان کا ذکر بھی نہ تھا اور نہ کوئی وقعت ان کی کسی کے ذہن میں معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ کانپور اور بلہور ان کے تذکروں کی صدا گونج رہے تھے۔ اور ہر ایک سوسائٹی (خواہ وہ اعلیٰ ہو یا ادنےٰ) ان کے تذکرہ کو اپنے جلسوں کا دلچسپ مبحث بنائے ہوئے تھی پھر یہ کس کا اثر تھا۔؟ آیا مراد آباد کے پانی کا؟ ہرگز نہیں۔ وہاں کی خاک کا؟ ہرگز نہیں۔ وہاں کے در و دیوار کا؟ ہرگز نہیں حضرت کے ہاتھ پاؤں کا؟ ہرگز نہیں۔ حضرت کے بالوں کا؟ ہرگز نہیں۔ البتہ اس کیفیت کا اثر تھا جو حضرت کے قلب میں تھی۔ وہ کیفیت کیا تھی۔؟ اس سے کون واقف ہے۔ اور کوئی کیا جانے مریض کا بدن بخار کیسے جلتا ہے۔ مگر وہ سوائے اثر کے مؤثر کو نہیں جانتا۔ سبب کو متحقق کرنا طبیب کا کام ہے۔ ہم بلغم یا تھوک گر کر بھی مرض کو معلوم کر سکتے ہیں۔ مریض کو اپنا جسم گرم اور منہ کا مزہ تلخ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ جاننا کہ یہ غلبہ صفرا کا نتیجہ ہے طبیب کا کام ہے۔

دوسرا خیال یہ تھا۔ کہ خود میرا ذہن مجھ کو ذلیل سمجھتا تھا۔ اور ہر چند حیرت سے غور کرتا تھا۔ لیکن کوئی وقعت اپنی میرے ذہن میں نہیں آتی تھی۔ دنیاوی جلسوں میں لفٹنٹ کے دربار دیکھے، رؤسا کے مجمعے دیکھے، اہل علم کی مجلسیں دیکھیں مگر کہیں اپنے نفس کو ایسا بے حقیقت نہیں پایا۔ اپنے اعمال ذمیمہ ماضیہ پر خود نفس سخت ملامت کرتا تھا۔ اور اپنی بے مائگی پر خود نفریں کن تھا۔ ہر شخص سے خواہ وہ کوئی ہو اپنے تئیں کم رتبہ تصور کرتا تھا۔ غرض کہ ایک عجیب خیال تھا کہ پورا بیان میں آنا مشکل ہے۔ وہاں سے آنے پر یہ خیال ایسے۔ جیسے کہ کسی دلچسپ خواب کا صبح کو خیال اور لطف ہوتا ہے رفتہ رفتہ یہ کیفیت زائل ہوگئی۔ اور چند لمحہ کے بعد پھر نفس امارہ "انا و لا غیری" اور "ہیچو ما دیگرے نیست" کے پھندے میں جا پھنسا۔ یہ خیال میرے نزدیک مخصوص نئے اور نرالے تھے۔ جو مدت العمر میں کسی جگہ اور کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس سے قیاس چاہیے کہ وہ جگہ بھی کچھ اور جگہوں سے نرالی تھی۔ اللہ بس باقی ہوس! فقط۔

اساتذہ کرام

فارسی و عربی

(۱) بسم اللہ مولوی سید حسن شاہ صاحب رام پوری نے پڑھائی۔ موصوف کا ذکر تذکرہ کاملان رام پور مولفہ حافظ احمد علی خاں شوق اور انتخاب یادگار مولفہ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی میں ہے۔

بسم اللہ کے چند روز کے بعد قطع تعلق ہوگیا اور رام پور چلے گئے۔

(۲) ان کے بعد میر فرزند علی صاحب متوطن مارہرہ نے پڑھایا۔ مولوی حسن شاہ صاحب نے صرف پارہ عم پڑھایا تھا۔ باقی قرآن مجید میر صاحب نے پڑھایا۔ فارسی بہار دانش تک پڑھائی خط کی مشق کرائی۔

(۳) میر صاحب کے بعد حکیم سلیم اللہ صاحب ساکن محلہ اسرائیل کول (علی گڑھ) نے پڑھایا سہ نثر ظہوری تک۔

(۴) میر فرزند علی صاحب کے پڑھانے کے زمانے میں عربی کا آغاز ہوا۔ مولوی سید اکبر صاحب سے (جو کانوخان ضلع پشاور کے متوطن اور سادات ترمذی سے تھے مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد تھے۔ حدیث مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری سے پڑھی تھی۔ باوجود ولایتی ہونے کے اردو صاف صحیح بولتے تھے۔ تذکرہ تاثیر کی صحبت کا پورا اہتمام تھا مولانا سہارنپوری کے درس میں افغانوں کو بوجہ ان کی اردو زبان صاف نہ ہونے کے قرأت کی اجازت نہ تھی۔ مگر مولوی صاحب اس سے مستثنےٰ تھے۔)

صحت موصوف کی اچھی نہ تھی۔ اس لئے تعلیم کم حاصل ہوسکی۔ صرف کے فارسی رسالے۔ صرف میر۔ زبدہ تک پڑھائے۔ اس کے بعد

(۵) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی مقرر ہوئے جو شاگرد تھے مولوی لطف اللہ صاحب کے۔ نحو اپنے وطن میں اس اہتمام سے پڑھی تھی جو اہل پنجاب کا اس فن کے پڑھانے میں ہے۔ مولوی صاحب نے شرح جامی تک نحو، شرح تہذیب اور بدیع المیزان تک منطق پڑھائی۔ فقہ میں مالابدمنہ۔ منیۃ المصلی۔ قدوری۔ کنز الدقائق پڑھیں۔ شرح جامی کی تعلیم کا پورا اہتمام کیا۔ ایک بار رامپور سے ایک مولوی صاحب آئے جو شرح جامی کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ عم محترم مولوی عبدالشکور خاں صاحب مرحوم نے ان کو مکتب میں میرا امتحان لینے کے واسطے بھیجا۔ "حاصل محصول" کی بحث میں امتحان

(۳) سڈنی ورلیسی لفٹنٹ - (۴) جوزف بیرٹ (۵) رابرٹ چیپین (۶) میٹر کوسر (۷) الن الیٹ وڈ - (پرائیوٹ) یہ سب یانچ سپاہی کا چھیاڈونگوں گارڈ۔ اور بیٹیز اور (۸) جان وِلسن - پرائیوٹ تھے

چونکہ یہ واقعہ گنوری سے بالکل متصل ہوا تھا اس لئے اس کی آبادی پر قدرتی طور پر اثر پڑا اور یہ پرا گاؤں آنا فاناً اجڑ گیا۔ اور ایسا اجڑا کہ آج تک پورے طور پر آباد نہ ہو سکا۔ اس موضع میں ایک بہت پرانی مسجد، کنواں اور پختہ قبریں ہیں جس سے اس کی قدامت کا پتہ چلتا ہے۔ موضع مذکور میں ایک گنجان جنگل ہے جسے گھنا کہتے ہیں۔ اس میں جھاڑیاں اور بڑے بڑے درخت دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ اس کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ بھاموں میں بھی آبادی سے متصل ہی کچھ درخت کچھ دن پہلے تک موجود تھے جن کی پختہ قبریں اب بھی ہیں اور کہ وہیں تو گھنا گنج شہیداں بنا ہوا ہے بیسیوں قدیم پختہ قبریں ہیں۔

سننے میں آیا ہے کہ یہ سب شہاب الدین غوری اور سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھی مجاہدین شہدا کے مزارات ہیں انہیں میں سے حضرت ملک پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے۔ جن کا مزار بھیکن پور کے [illegible] کے قریب زیارت گاہ خاص و عام ہے [illegible] بزرگ [illegible] نواب صدر یار جنگ بہادر [illegible] تحریر فرماتے ہیں۔

"مولانا غلام علی صاحب مرحوم گوردشت [illegible] عبد الشکور خان صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا تھا۔ ملک پیر صاحب کا نام مولانا منہاج الدین شہید ہے شہاب الدین غوری کے لشکر کا مردر عبور گنگا کے لئے بھیکن پور کے متصل ہو کر ہوا۔ [illegible] شہید ہوئے مزار کی مرمت کی خواہش جناب عم محترم حاجی غلام احمد خان صاحب مرحوم نے فرمائی تھی۔ ملک پیر صاحب نے مولانا مرحوم کی وساطت سے ناراضامندی کا اظہار فرمایا۔ مولانا نے اپنے مرید میاں جی صدر مرحوم کی نسبت فرمادیا تھا کہ جب مولانا کی غیبت میں ان کو وحشت ہو تو توجہ فرمائیں۔ چنانچہ جب مزار پر حاضر ہوتے تو تسکین پاتے "

ان آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خطہ مجاہدین اور غازیوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں اس شرف سے کیسے محروم رہتا۔

یہ دیہات - بھاموں - باونہ وغیرہ شیروانی خاندان کی آبادی کے لحاظ سے مرکز کی حیثیت رکھتی ہیں تحصیل کاسگنج ضلع ایٹہ اور تحصیل اترولی ضلع علی گڑھ میں یہ خاندان زیادہ تر آباد ہے - ان دیہات سے مشرقی سمت پر قصبہ سہاور ضلع ایٹہ تقریباً ۲۰ میل ہے۔ اور ریاست بوڑھانسی ضلع علی گڑھ بجانب مغرب اتنی ہی مسافت پر ہے اس چالیس میل کے رقبہ میں یہ شیروانی خاندان آباد ہے۔ اسی لئے اسے خطہ افغانستان بھی کہدیا جاتا ہے۔ جہاں جہاں اس نسل کے افراد سکونت پذیر ہیں وہ قصبات و دیہات اب تک مشرقی تہذیب کے حامل ہیں۔ مساجد پختہ اور آباد ہیں۔ جس جس موضع میں آباد ہیں وہاں انھیں کی زمینداری و عملداری ہے۔ گرد و نواح کے دیہات بھی انھیں کی جاگیر میں شامل ہیں۔ خاندان میں تعلیم کی کمی ہے۔ مگر جو ادھر متوجہ ہو گیا اس نے ملک میں اپنی جگہ بنالی۔ علما - پروفیسر - وکیل و بیرسٹر - مصنف و مقرر اطبا - ڈاکٹر - نثر نگار و شاعر - تحصیلدار - ڈپٹی کلکٹر - وزیر و ہوم ممبر - لیڈر و پلیڈر ان میں مختلف میدان کے مرد ملیں گے - دوسری طرف بہت سے خان صاحب - خان بہادر سر - نواب - اور نواب بہادر بھی نظر آئیں گے۔

اس خاندان کو ملک اور بیرون ملک تک شہرت دینے والے دو بزرگ ہیں۔ ایک مسٹر تصدق احمد خان شیروانی مرحوم بیرسٹر اور دوسرے نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خان شیروانی مرحوم سابق صدر الصدور مملکت دکن۔ اول الذکر نے اپنے قومی و وطنی جذبات کی بنا پر ملک بھر میں شیروانی خاندان کو روشناس کیا۔ اور آخر الذکر نے اپنی تصنیفات و تالیفات علمی فضل و کمال اور تاسیس نادر الوجود کتب خانہ کی بدولت سارے ملک میں خاندانی وقار کو دوبالا کر دیا۔

فاضل مصنفین مصری مطبوعات کے دیباچہ میں بھی نواب صدر یار جنگ بہادر اور ان کے کتب خانہ کا تذکرہ اور شکریہ ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ جرمنی اور بغداد وغیرہ کو اس شیروانی کتب خانہ کی کتابیں مقابلہ کے لئے جاتی رہتی ہیں - یورپین اور غیر ملکی سیاح و اہل علم اس کی زیارت کو آتے رہتے ہیں اور ہندوستان بھر میں تنہا آپ ہی کی ذات گرامی تھی جسے امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد سابق مدیر الہلال جیسا یگانہ روزگار ادیب و انشا پرداز اپنی علمی و ادبی و تاریخی مراسلت و مکاتبت کے لئے منتخب کر چکا تھا۔ "غبار خاطر" اور "کاروان خیال" دونوں مجموعہ مکاتیب اس کے شاہد ہیں۔

مجھے فخر ہے کہ اگر ایک طرف دادھیالی سلسلہ اول الذکر جیسے نامور فرد سے چند پشتوں میں مل جاتا ہے۔ تو ننھیالی سلسلہ چند پشت پر آخر الذکر جیسی ہستی گرامی قدر سے ملتا ہے۔ ایک طرف اگر آبائی مسکن اول الذکر کے مسکن سے ملا ہوا ہے تو دوسری جانب دری وطن خاص بھیکن پور ہے - اور وہی مولد و منشا طفولیت بھی، یہیں ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں مجھ سے نصف صدی قبل یہ مخزن فضل و کمال (نواب صدر یار جنگ بہادر) منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکا تھا۔

ان دو نوادر گرامی قدر ہستیوں کے بعد پروفیسر ہارون خان شیروانی استاذ تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کا نام بھی خاندان کو اجاگر کرنے والوں میں ملتا ہے۔ موصوف نے مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی قابلیت سے کافی متاثر کیا ہے۔ موصوف زیورچ کانفرنس ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اور بعض بعض اجلاسوں کی صدارت بھی کی۔ تمام دنیا کے تاریخ دانوں کا اجتماع ہوا تھا۔ موصوف نے اسی سلسلہ میں دوسرے ممالک کا بھی سفر کیا۔ تمام حالات سفر کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپکی پیدائش ۲۰ مارچ ۱۸۹[illegible]

نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خان صاحب شیروانی مرحوم آف بھیکم پور بھی اپنی ریاست و وجاہت کے لحاظ سے اس آخری دور میں بڑی ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ مرحوم نے اپنی خداداد ذہانت و قابلیت سے ترکہ پدری میں ملی ہوئی ۱۶ ہزار روپے سالانہ کے منافع کی جائداد کو کئی لاکھ تک پہونچایا۔ انگریزی سرکار سے (والیان ملک کے بعد) جتنے خطابات بھی ہو سکتے ہیں سب حاصل کئے تھے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین، کونسل کے ممبر - یو۔ پی حکومت کے ہوم ممبر - اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے تھے۔

آپ نے صنعت و تجارت کی طرف بھی خاص طور سے توجہ کی تھی۔ قصبہ چھرہ کا روئی کا کارخانہ ۱۹۴۶ء تک مرحوم کے انتقال کے بعد بھی ۸ سال تک چلتا رہا۔ علی گڑھ میں جالسین کا مشہور کارخانہ اب تک جاری ہے۔ آپ نے انتقال کے وقت (۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں) ۱۴ لاکھ روپیہ نقد اور کروڑوں روپیہ کی مالیت کی جائداد چھوڑی۔ جب کہ تعلیمی و مذہبی (بلا تفریق مذہب و ملت) اداروں کی امداد پر پچاس لاکھ روپیہ سے زیادہ کی بارش الطاف کرم و عنایات کی۔ آپ نے ایک بجلی کا انجن حرم پاک کی نذر بھی کیا۔ آپ کی جائداد اب تک کورٹ آف وارڈس کے چکر میں ہے۔ حالانکہ مرحوم کے خلف الرشید نواب رحمت اللہ خان شیروانی کئی سال سے قانونی طور پر بھی واگزاشت جائداد کے مستحق ہو چکے ہیں۔

نواب مولوی ابوبکر خان صاحب شیروانی مرحوم آف داددوں اپنے بعض خصائص اور فیاضانہ طبیعت کی بنا پر بڑا اونچا مقام رکھتے تھے، ان کا دبدبہ، سطوت، جود و سخا۔ اور شاہانہ تمکنت و مزاج اب تک زبان زد خاص و عام ہے آپ کا تاریخی نام مظفر جنگ تھا (۱۲۹۳ھ) ۱۳۵۴ھ و ۱۹۳۵ء میں ۱۳ رمضان المبارک کو افطار کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۶۱ سال کی عمر پائی مرحوم نے اپنے علاقہ میں سے ۱۹۲۳ء میں بارہ ہزار چھ سو باسٹھ روپیہ کے منافع کی جائداد وقف کی۔ اس میں اعراس - مساجد وظائف - مسافر اور فاتحہ بزرگان دین کے ساتھ ساتھ ساڑھے تین ہزار روپے سالانہ مدرسہ عربیہ کے لئے وقف کئے اور اس میں یہ شرط بھی رکھی کہ آفات ارضی و سماوی سے اس رقم وقف میں کمی آنے پر پہلے مدرسہ کی رقم کا لحاظ رکھا جائے گا اس کے بعد تمام موقوف علیہم پر حصہ رسدی تقسیم ہوگا۔

منشی قاضی سید نجم الدین حسین صاحب منصرم ریاست داددوں کا اس کار خیر میں بڑا حصہ رہا۔ اور آج تک آپ ہی اس کے روح رواں ہیں۔

۲۴ نومبر ۱۹۲۴ء کو مدرسہ عربیہ حافظیہ سعیدیہ کے نام سے مدرسہ عربیہ کا افتتاح ہوا پہلے صدر المدرسین مولانا حافظ وجیہ الدین احمد خان صاحب رامپوری اول مدرس اول مدرسہ عالیہ رامپور ہوئے۔ راقم الحروف نے ۱۹۲۵ء میں اسی مدرسہ میں مولانا مرحوم اور مولوی امین الدین صاحب چھبروی مرحوم سے عربی کی ابتدا کی۔ یہ مدرسہ خدا کے فضل سے آج بھی جاری ہے۔ مرحوم کے عمزاد بھائی مولوی محمد جان خان صاحب شیروانی اس کے متولی ہیں۔ راقم الحروف کو فرائض نگرانی و اہتمام کئی سال سے سپرد کر رکھے ہیں۔ مدرسہ میں درس نظامیہ کے ساتھ الہ آباد بورڈ کے امتحانات کا سلسلہ بھی عرصہ سے جاری ہے۔ اب ہندی اور انگریزی کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے۔ اس وقت مدرسہ کی سالانہ آمدنی آٹھ ہزار روپیہ سے زیادہ ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

وقف داددوں ۳۵۰۰ — وقف بی بی عائشہ خاتون وغیرہ تقریباً ۳۵۰۰

واپسی از وثائق وظائف داددوں اقرارنامہ ۲۳۰

واپسی از وظائف داددوں وقف نامہ ۶

از بورڈ الہ آباد (حکومت اتر پردیش) ۱۸۰

میزان الکل ۸۱۸۵

نواب صاحب مرحوم کی داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ آپ کو حاتم خاندان کہا جاتا تھا۔ تعریف کر دینے پر موٹر تک نذر کر دیتے تھے۔ حکام و حکومت سے کبھی غرض سے نہ ملے۔ سر ولیم میرس گورنر یو۔ پی آپکا بڑا دوست تھا اکثر آپ کی شکارگاہ خاص (ساتکرہ) میں

(۴) ہری فریمین پرائیویٹ - جیمز فشی کے زیر لافسر تھے۔ (۵) یہ مسجد بی بی مدینہ دختر شاہ محمد خان بلوتوی زوجہ عظمت خان ولد رفعت خان نے اپنے اکلوتے بیٹے بہادر خان کی موت پر ایصال ثواب کے لئے بنوائی ہے۔ متصل مدفن بہادر خان ۔ غفر اللہ مسجد سے ستامکاں ۔ سال تاریخ سہم از ہاتف ۔ گفت - آرامست از مدفن نشاں

شروانی خاندان

(محمد عبدالشاہد خاں شروانی مولف "باغی ہندوستان" مرتب "کاروان خیال")

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمن خاں شروانی رئیس حبیب گنج (علی گڑھ) و صدر الصدور مملکت حیدر آباد دکن ۲۸ شعبان المعظم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء کو اپنے آبائی قلعہ بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں بوقت صبح کتم عدم سے عالم شہود میں آئے۔ اور ۲۶ شوال المکرم ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء بروز جمعہ بوقت صبح ۶ بجکر ۱۰ منٹ پر ۸۶ سال کی عمر میں اپنی کوٹھی حبیب منزل (میرس روڈ علی گڑھ) میں سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف روانہ ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

مرحوم جس ذاتی عظمت و وقار اور خاندانی عزت و وجاہت کے مالک تھے وہ اکابر اہل قلم کے ان جذبات قلبیہ سے ظاہر و باہر ہے جو اس صدر یار جنگ نمبر کے صفحات کو مزین کئے ہوئے ہیں۔

میں نے جہاں تک خاندانی اکابر کے حالات کا مطالعہ کیا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ شروانی خاندان کی تقریباً ۶۰۰ سالہ تاریخ ہندوستان میں مجموعی طور پر ان جیسا فخر خاندان نہیں گذرا! نواب صاحب مرحوم کے متعلق رسالہ معنف (علی گڑھ) جنوری ۱۹۲۶ء "تقریب و تذکرہ دیوان اردو کاروان حسرت" مقدمہ کاروان خیال اور سلسلہ تعزیت اخبار جمہور (مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۵۱ء) میں کافی لکھ چکا ہوں۔ اس وقت خاندان شروانی پر مختصراً کچھ لکھنے کی جراٴت کر رہا ہوں۔

اس خاندان کا سلسلہ نسب ملک طالوت سے جا کر ملتا ہے جن کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ پارہ ۲ سیقول رکوع ۳۲

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

بخت نصر کی فلسطین و بابل پر فوج کشی کے موقع پر طالوتی نسل کو منتشر ہونا پڑا تھا۔ کچھ لوگ افغانستان آکر بھی آباد ہو گئے تھے۔ انھیں میں قیس ابن عیص بھی تھے، جو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار گہر بار میں حاضر ہو کر مشرف با اسلام ہوئے۔ اسلامی نام عبدالرشید رکھا گیا۔

صاحب "حیات افغانی" نے لکھا ہے۔ کہ عبدالرشید کا عقد نکاح خالد بن ولید کی صاحبزادی سے ہوا۔ جن سے تین صاحبزادے متولد ہوئے۔ سربن۔ غورغشت۔ بتکین۔ اس نسل میں سے پہلے ہندوستان میں تین حقیقی بھائی غلزئی لودی۔ اور سروانی پہنچے۔ آخر الذکر ہی کی طرف اس خاندان کی نسبت ہے کثرت استعمال سے "سروانی" کا شروانی ہو گیا۔

شروانی خاندان ہندوستان میں کب سے آباد ہے اس کی صحیح تاریخ تو ملنا مشکل ہے؛ البتہ لودھی سلاطین کے زمانہ میں اس کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ بہلول لودھی ۸۵۵ھ میں بادشاہ بنا ۸۹۳ھ میں وفات پائی۔ عمر خاں شروانی اس کے زمانے میں با اقتدار تھے۔

بہلول کے بعد سکندر لودھی کو تخت سلطنت پر عمر خاں شروانی ہی نے بٹھایا تھا۔ اور پھر اس کے وزیر بھی ہوئے۔ عمر خاں شروانی کے علاوہ اعظم خاں شروانی۔ بابو خاں شروانی۔ ابراہیم خاں شروانی۔ جبار خاں شروانی۔ ہیبت خاں شروانی۔ احمد خاں شروانی۔ اور سعید خاں شروانی۔ کا بھی تاریخ فرشتہ وغیرہ میں ذکر موجود ہے۔

لودھیوں کے زمانہ میں اعظم ہمایوں سپہ سالار افواج کا لقب ہوا کرتا تھا۔ ابراہیم لودی کے زمانہ میں اعظم ہمایوں ایک شروانی ہی تھے۔ بابر نے شہزادہ ہمایوں کے ولیعہد ہونے کے بعد اس لقب کو موقوف کیا تھا۔ اکبر کے عہد میں خان زماں خاں لودھی حاکم جونپور کی شکست کے بعد پیر محمد خاں شروانی جونپور کے صوبیدار مقرر ہوئے

علی گڑھ کا مشہور و معروف قلعہ جو اب مرٹ کرجلد بالائے قلعہ کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے۔ عمر خاں شروانی وزیر سکندر لودی کے لڑکے محمد خاں شروانی نے ۱۵۲۵ء میں ابراہیم لودھی کے زمانے میں تعمیر کرایا۔ اور اپنے نام پر محمد گڑھ نام رکھا۔ اسی قلعہ کو نواب ثابت خاں نے (جنھوں نے موجودہ جامع مسجد علی گڑھ ۱۱۴۱ھ میں تعمیر کرائی ہے) ۱۷۱۵ء عہد فرخ سیر میں دوبارہ تعمیر ارمرمت کرا کے "ثابت گڑھ" اپنے نام سے موسوم کر دیا۔

۱۷۵۰ء و ۱۷۵۳ء سے میاں سورج مل جاٹ نے اگرہ و کول پر قبضہ کر کے قلعہ ثابت گڑھ کو رام گڑھ بنا دیا۔ ۱۷۷۵ء میں نواب مرزا نجف خاں کے دور وزارت اور شجاع الدولہ کے اس عہد میں اس رام گڑھ کو علی گڑھ کر دیا گیا۔ اور اب قلعہ کے بجائے شہر کا نام ہو گیا۔

شیر شاہ کی چیرہ دستی اور بنگال میں سلیمان خاں اور داؤد خاں کے مقابلوں نے سلاطین مغلیہ کا طرز عمل شروانیوں کی طرف سے بدل دیا۔ ان کو فوج سے الگ کر دیا۔ شروانیوں نے مضافات کا رخ کیا۔

عہد اکبری و شاہجہانی میں کچھ لوگ اضلاع علیگڑھ اور ایٹہ میں آکر آباد ہوئے۔ کچھ سرحد و پنجاب چلے گئے۔ ریاست مالیر کوٹلہ (پنجاب) کے فرمانروا شروانی ہی ہیں۔

نواب والا جاہ کی رفاقت میں کچھ لوگ مدراس پہنچ گئے۔ جن کا سلسلہ اب تک وہاں جاری ہے علی گڑھ اور ایٹہ کے نواح میں آباد ہونے والے سب سے پہلے عہد اکبری ۹۶۳ھ مطابق ۱۵۹۶ء میں موضع رہجوئی میں آباد ہوئے۔ (جو اب ویران کھیڑا ہے متصل جنوبی موضع بہادر گڑھ حال زمینداری ریاست بودہ گاؤں علاقہ احمد کامل مصطفےٰ خاں شروانی قریب نیم ندی، ندی سے غربا واقع ہے) رہجوئی سے یہ لوگ بھجوئی آئے۔ یہاں زمینداریاں پیدا کیں۔

سب سے پہلے ہندوستان میں تین بھائی غلزئی۔ لودھی۔ اور سروانی آئے۔ جب لودھیوں کو سلطنت مل گئی۔ تو سروانیوں کو بھی عروج ہوا۔ نواح علیگڑھ و ایٹہ میں آنے والوں میں محمد میر اور محمد مغیث دو بھائیوں کا نام معلوم ہو سکا ہے محمد میر کی اولاد پیرورہ جا کر رہی۔ وہاں سے دتاولی برلہ۔ سیادلی۔ سنبرہ۔ دہناری اور پرمائی میں پھیل گئی۔

محمد مغیث کے تین لڑکے ہوئے۔ سالار دین۔ رکن الدین۔ اور بہاؤ الدین۔ سالار دین کی اولاد بھیکم پوری۔ تھیکن پور۔ منڈولی۔ کنوبی بھاموں۔ کنڈوہ۔ ڈھولنہ۔ دادوں۔ اکورہ بودہ گاؤں حسن پور۔ وغیرہ میں آباد ہوئی۔ اور ساڑھول کہلائی۔ ساڑھول سلسلہ میں بارہ گاؤں آتے ہیں۔ گھترنہ۔ بھرسولی۔ وغیرہ میں بقیہ دونوں بھائیوں کی نسل کا سلسلہ جاری ہوا۔ بہاؤ الدین کی اولاد کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ رکن الدین کی نسل برہرہ۔ علی پور۔ عنایتی۔ طالب پور وغیرہ میں پھیلی جو رکھنڈی کہلاتی موجودہ خاندانی دیہات میں بھمورا کنڈوہ وغیرہ کو تقدامت حاصل ہے۔

جالوں اور گسائیوں وغیرہم سے زور آزمائی کر کے یہیں سے زمینداریوں پر شروانیوں نے قبضہ کیا ہے۔

اس ساڑھول خاندان میں نواب محمد یوسف خاں شروانی کا محمد باز خاں شروانی مورث اعلیٰ نواب صدر یار جنگ بہادر کی طرح اپنے وقت میں بڑے دبدبہ و سطوت کے بزرگ گذرے ہیں۔ راجپور ضلع علی گڑھ (جو اب علاقہ نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں شروانی مرحوم میں شامل ہے اور جس میں اب خاندان کا کوئی فرد زمانہ دراز سے سکونت پذیر نہیں ہے۔) ان کا مستقر تھا۔ ان کا انتقال ۱۶۹۳ء میں ہوا۔ قبر کنڈوہ کے گھنے میں ہے۔ اور ان کی والدہ بیبی وغیرہا کی قبریں راجپور ہی میں ہیں۔ ان کے چار بیٹے تھے رستم خاں۔ کی نسل منقطع ہو گئی۔ حسن خاں سے کنوبی۔ کنڈوہ۔ اور بودہ گاؤں کا سلسلہ چلا۔ محمود خاں سے سلسلہ بلونا انھیں کی نسل سے فخر خاندان نصف احمد خاں شروانی مرحوم۔ اور شمار احمد خاں شروانی سابق وزیر زراعت یو۔ پی ہیں۔ چوتھے لڑکے محمد خاں تھے جو بلونا کا سلسلہ چلا جس کا ایک گمنام فرد یہ راقم السطور ہے۔ اس نسل میں مورث اعلیٰ داؤد خاں ہوئے۔ انھوں نے بھاموں سے متصل ایک موضع داؤد پور بھی اپنے نام سے آباد کیا۔ اس موضع کی کئی سو بیگھہ زمین ۱۹۴۷ء تک اہل خاندان بھاموں کے پاس شاہی زمانے سے معافی کے طور پر رہی۔

بھاموں سے ایک میل کے فاصلہ پر انقلاب ۱۸۵۷ء کا وہ مشہور مقام ہے جو سید ان کا لاڑا کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ اور انگریزی اصطلاح میں اسے "کالا جار" کہا جاتا ہے۔ یہاں انگریزی فوجوں اور مسلمانوں میں معرکہ ہوا تھا۔ دونوں مقابل جماعتوں نے خوب خوب داد شجاعت دی۔ قسمت کی بدنصیبی سے بڑے زور کی آندھی آئی۔ جس کا رخ مسلمانوں کی جماعت کی طرف تھا۔ ان کی گولیاں بے اثر اور ان کی جماعت منتشر ہو گئی۔ ادھر گوروں کی تازہ دم فوج بھی آندھی کے ساتھ ساتھ پہنچ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے مسلمان چاروں طرف سے گھیر کر تہ تیغ کر دیئے گئے یہیں لڑائی کا خاتمہ ہوا۔ جو انگریز افسر یہاں مارے گئے ان کے نام ایک پتھر پر کندہ ہیں۔ اور وہ پتھر وہیں اب تک نصب ہے۔ اس پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔ " ان بہادروں کی یاد میں جو بمقام گنگیری بتاریخ ۱۴ دسمبر ۱۸۵۷ء بروقت فتح کام آئے اور جن کی ارواح بیادگار ان کے یہیں آرام فرما ہیں ۱۔ جارج واردلا۔ کپتان۔ (۲) جون ہنری تفنٹ

عہ۔ عباس خاں شروانی نے عہد اکبری میں شروانیوں کی مکمل تاریخ لکھی ہے نام "تحفۂ اکبر شاہی" ہے۔

سلسلہ بھموری

آیدل خاں[1] (مورث اعلیٰ)

نامعلوم

مصاحب خاں (مسافر خاں)

یحییٰ خاں

قطب خاں

خان جہاں خاں

اصالت خاں (سلسلۂ بندولی دیکھو صفحہ آئندہ) — شادل خاں (سلسلۂ بھموری دیکھو صفحہ آئندہ) — جہاں خاں — دلیل خاں (سلسلۂ بھموری دیکھو صفحہ آئندہ) — محمد رشید خاں (سلسلۂ بھیم پور دیکھو صفحہ آئندہ)

سرفراز خاں — دختر — تاج خاں لاولد

محمد باز خاں[2]
(مورث اعلیٰ بھیکم پور)

حاجی غلام محمد خاں (مورث اعلیٰ دادوں) — خان زماں خاں — حاجی محمد داؤد خاں

حاجی محمد ہدایت اللہ خاں — محمد تقی خاں (مورث حبیب گنج) — حاجی محمد عبد الشکور خاں — دختر ۲

محمد حبیب الرحمن خاں
(نواب صدر یار جنگ بہادر)

محمد مسعود الرحمن خاں — محمد عزیز خاں — محمد عبید الرحمن خاں — دختر ۳ — محمد محبوب الرحمن خاں

دختر — محمد حبیب الرحمن خاں — محمد ریاض الرحمن خاں

حاجی غلام احمد خاں — نواب بہادر حاجی محمد مزمل اللہ خاں (مورث اعلیٰ ظفر منزل) — محمد رحمت اللہ خاں — عطاء اللہ خاں

عبد الغفور خاں — حاجی محمد صالح خاں لاولد — دختر ۳ — محمد عمر خاں — عبد الصبور خاں — فضل الصبور خاں (۱۲ سال)

عبد الروف خاں — حاجی محمد جان خاں — غلام جیلانی خاں — غلام السبطین خاں — غلام الرحمن خاں — دختر (زندہ خاتون) — اصطفا علی خاں

نوٹ [1]: عبدل یا عبد اللہ خاں شیروانی نے جہانگیری عہد میں شاہی ملازمت اختیار کی۔ پھر تارک الدنیا حضرت منعم شیخ ثنائی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار واقع گنگیری ضلع علیگڈھ پر گوشہ نشین ہو گئے۔ وہیں سپرد خاک ہوئے ان کی قبر اب تک وہاں موجود ہے۔ (معارف دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء صفحہ ۴۸۵)

[2] - باز خاں شیروانی خدا ترس بزرگ تھے اپنے پیر کے بڑے عقیدتمند تھے۔ سنہ ۱۷۴۱ء میں انھوں نے اپنے پیر کے حکم سے بھیکم پور کو دوبارہ آباد کیا۔ اور خود مع اہل و عیال بھموری سے وہاں منتقل ہو گئے۔ باز خاں کی شادی دور ئی میں بھوگی خاں ولد نصیب خاں کی لڑکی مدینہ بی بی سے ہوئی تھی۔ بھموری کے قیام کے زمانے میں سنہ ۱۷۸۹ء میں ان کو چھٹے ابیر سے دادوں کے مقام پر ایک معرکہ پیش آیا جس میں خاندان کے لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اس معرکے میں آپ کے تلوار اور برچھے وغیرہ کے کئی زخم آئے تھے۔

سنہ ۱۸۳۰ء میں حج کو جاتے ہوئے بمقام بڑودہ انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت ۴۵ گاؤں تعلقہ بھموری بزرگ میں اور ۲۰ گاؤں تعلقہ بردوئی ۱۲ گاؤں کنکتہ میں چھوڑے۔ حج کے سفر میں آپ کی اہلیہ مدینہ بی بی بھی ساتھ تھیں۔ شوہر (باز خاں) کو بڑودہ میں دفن کر کے حج کو گئیں واپسی پر بچی ہوئی رقم سے بھموری کی مسجد بنوائی جس کی تاریخ

وعقیدت کے دم بھرنے والے بعض اچھے اچھے بزرگوار نکل گئے۔ شروانی کے عزیز ترین دوست ڈاکٹر سید محمود نے ان کا نام بھی رکھا تھا میں کہتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ لیکن الٰہ آباد میں ایک بار جب جی کڑا کر کے تذکرہ کیا تو مرحوم نے اس فراخدلی اور خندہ جبینی کے ساتھ لبیک کہا۔ کہ میں حیرت کے مارے حیرت ہو کر رہ گئی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اپنے کسی سیاسی حریف کا ذکر کر رہے ہیں۔

خیر! وہ تجویز تو عمل میں کبھی بھی نہ آسکی زیادہ تر مولانا ہی کے انکار و استغنا کی بنا پر لیکن شروانی کی اس شرافت کا نقش دل پر بیٹھ گیا۔

اللہ مغفرت فرمائے اور درجات بلند سے بلند تر کرے۔ خوبیاں بہت تھیں بہت تھیں۔ اس محبت و اخلاص، اس سیر چشمی، اس اخلاق و فراخدلی۔ اس ذوق خدمت - تحمل و مصائب کی مثالیں کمتر دیکھنے میں آئی ہیں۔

جمعہ کے دن کی موت۔ عین نماز فجر کے وقت ہر ایک کے نصیب میں آتی بھی تو نہیں ہے اور پھر ہزارہا مسلمانوں کی دعائیں۔ ! خوش نصیب کتنا کیسا! دنیا اور آخرت دونوں جگہ بازی لے گیا۔ !

یعنی بیسویں صدی کی چند مشہور خاندانی شخصیتوں کی روداد۔

مولوی ذوالفقار حسن خاں صاحب بلونوی مرحوم نے ۲۰ - ۲۵ سال قبل خاندانی دیہات کا دورہ کر کے شجروں کی فراہمی کی کوشش کی تھی اسی کے ساتھ آپ نے ہر موضع کے حالات و خصوصیات اور خاندان کے اکابر کے احوال قلمبند کئے تھے۔ مرحوم کی کرسے وفات کی۔ اور یہ مسودات دو رجسٹروں کی شکل میں کتابخانہ حبیب گنج میں محفوظ کر لیے گئے۔

میں جب "باغی ہندوستان" مرتب کر رہا تھا۔ تو اپنے تذکرہ کے ضمن میں خاندانی حالات کی ترتیب میں ان رجسٹروں سے کافی مدد ملی تھی۔

اس موقع پر بھی میں نے مناسب سمجھا کہ دیہات کے شجرے شائع ہو جائیں تو یہ خاندان کی ایک اچھی خدمت ہوگی۔

دھرم دھنا اور ایلم پور، گھونہ اور عنایتی کے شجروں کے علاوہ باقی سب شجرے انھیں رجسٹروں سے حاصل کئے گئے ہیں۔

افسوس ہے کہ اتنا وقت نہ مل سکا کہ دوسرے دیہات کے سلاسل مہیا کئے جا سکتے۔ یا مندرجہ ذیل شجروں کی مزید خانہ پری کی جا سکتی۔ ہر وقت جو معلومات ہو سکیں ان کا اندراج کر دیا گیا۔ شاہد شروانی

نوٹ: - ڈپٹی محمد عباس علی خاں صاحب شروانی برتولی کا مرتب کردہ "شروانی نامہ" عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ دیہات کے شجرے جن بھائیوں کے پاس ہوں وہ بھیجکر شکر گذار فرمائیں تاکہ اس کتاب میں درج کر دیے جائیں۔ شاہد شروانی

بڑے دن پر شکار کھیلنے آتا۔ اصطفاب خاں بڑے شان و اہتمام سے مہمان نوازی کرتے۔ آپ نے صرف ایک صاحبزادی چھوڑیں جو مولوی احمد رؤف خاں صاحب شروانی خلف الرشید مولوی محمد جان خاں صاحب شروانی آف داد کے حبالۂ عقد میں ہیں۔ اور آجکل حیدر آباد سندھ میں ۴ سال سے مقیم ہیں۔

حافظ محمد اسلم صاحب خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو اور آپ کے اعزا کو بیعت و ارادت حاصل تھی۔ آپ کے چھوٹے بھائی حاجی غلام محمد خاں صاحب حافظی رئیس موہن پور ۱۳۲۵ھ سے خیر آباد ہی میں آستانۂ مرشد پر اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ اور وہیں ربیع الاول ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں وفات پا کر مدفون ہوئے آپ بھی اپنے بھائی کی طرح بڑے سخی اور غریب پرور تھے۔

اس نسل کے مشہور بزرگ باز خاں صاحب کے تین بیٹے تھے۔ خان زماں خاں صاحب کی شاخ میں نواب صدر یار جنگ بہادر، حاجی محمود داؤد خاں صاحب کی شاخ میں نواب بہادر سر مزمل اللہ خاں صاحب اور حاجی غلام محمد خاں کی شاخ میں نواب ابوبکر خاں صاحب تھے، آخر الذکر کے تیسرے بیٹے تقسیم جائداد کے بعد ۱۸۳۶ء میں بھیکم پور سے داددوں منتقل ہو گئے تھے۔ باز خاں کی نسل کے ان تینوں اخلاف نے اپنے جد اعلیٰ کے نام کو چار چاند لگا دئے۔ خاندان شروانی میں باز خاں کی طرح سطوت و جبروت کی دوسری ذات گرامی نواب محمد یوسف خاں آف کناوہ کی گزری ہے۔ ان کی نسل میں مسٹر تصدق احمد خاں شروانی کی شخصیت سب سے ممتاز ہوئی ہے۔

جس طرح نواب بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب شروانی آف بھیکم پور حکومت دوستی میں خاندان میں سب سے زیادہ امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح اس کے برعکس مسٹر تصدق احمد خاں برطانیہ دشمنی میں شروانیوں کے کلاہ افتخار کے طلبدار ہیرا تھے۔

ابتدائی تعلیم شروانی اسکول چھرہ میں ہوئی۔ اس کے بعد علیگڑھ کالج میں داخل ہوئے وہاں یونین کے نائب صدر بھی رہے علیگڑھ سے ولایت گئے وہاں سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر ہندوستان آکر علیگڑھ میں پریکٹس شروع کی۔

اس کے بعد الہ آباد میں کامیاب بیرسٹر رہے ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت اور اس کے بعد کانگریس کے لیڈر بنے۔ صوبہ کی کانگریس کمیٹی کے بھی مدتوں صدر رہے ۱۹۳۴ء میں اسمبلی کی صدارت کے لئے کانگریس کی طرف سے کھڑے کئے گئے۔

۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء مطابق ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ کو جمعہ کے دن نمونیہ اور گردن توڑ بخار میں مبتلا ہو کر جان جان آفریں کو سپرد کی۔ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے آپ کی وفات پر جو نوحۂ ماتم سپرد قلم کیا تھا۔ اس کا اقتباس دے دینا نامناسب نہ ہوگا۔

خوش نصیب گول کیپر!

تاریخ اور مہینہ تو بھلا کسے یاد، سنہ غالباً ۱۹۰۷ تھا اور جاڑوں کا زمانہ۔ علیگڈھ کی فٹ بال ٹیم لکھنؤ میچ کھیلنے کو آئی۔ ادھر علی گڈھ کے کھلاڑی گیند بلے میں اپنا سکہ جمائے ہوئے۔ ادھر لکھنؤ کی خلقت کھیل تماشہ کے شوق میں نام اچھالے ہوئے، شہر میں ایک دھوم مچ گئی۔ میچ کیننگ کالج گراؤنڈ پر تھا۔ تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ امیر غریب، جوان بوڑھے طالب علم اور سودے والے سبھی، اور اسی مجمع میں ان سطور کا راقم ایک اسکول کا گمنام طالب علم بھی، علی گڈھ کے کھلنڈرے ایسے ایسے اکسا برد کر۔ لیکن تماشائیوں کی نظریں بس علی گڈھ کے گول کیپر پر جمی ہوئیں۔ ایک ... تنومند۔ خوش رو نوجوان۔ پہاڑ کی طرح اٹل اور چٹان کی طرح مضبوط۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپری ہی کے فرائض کے لئے خلق ہوا ہے۔ لکھنؤ کی ٹیم بے طرح جوش اور ولولہ کے ساتھ بپھر بپھر کر کیسے کیسے حملے کرتی اور ہر بار ہی گول کیپر کے "تصدق" میں ناکام!

بس یوں سمجھئے کہ سمندر کی غضبناک موجیں اپنی سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں اور پتھر کی چٹان سے ٹکرا کر پھر واپس چلی جاتیں۔!

یہ تھا کالج کا ہونہار نوجوان۔ اور شروانی خاندان کا چشم و چراغ۔ "تصدق" کون کہہ سکتا تھا۔ کہ اسے جلد ہی رند بعد کھیل کود میں نہیں نٹ بال کے فیلڈ کے سو پچاس گز کے محدود رقبہ کے اندر نہیں، سیاسیات و قومیات کی سنجیدہ اور خشک دنیا میں ہندوستان بھر کے طویل و عریض رقبہ میں بڑی بڑی زبردستیوں کے مقابلہ میں ملک و ملت کی گول کیپری کے فرائض انجام دینے ہوں گے۔

سب سے پہلی زیارت یوں ہوئی۔ کچھ ہی دنوں میں سننے میں آیا۔ کہ یہ کھیل کا مرد میدان یونین کا وائس پریسیڈنٹ ہے۔ اور اچھا جید مقرر بھی۔ یونین کے وائس پریسیڈنٹ کے مرتبہ کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو علیگڈھ سے واقف ہیں۔ دل خوش ہو گیا۔ کہ جو جسم کا دھنی تھا اس کا دماغ بھی کورا نہ نکلا۔ ......

چار پانچ برس کی درمیانی مدت چھوڑ جائیے ...... اب ۱۹۱۳ء آتا ہے اور اس کے دسمبر کا آخری عشرہ لکھنؤ کی سرزمین رعشہ میں ہے۔ اور پرانے قومی لیڈروں کے قلوب لرزہ میں۔ ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی، افادۂ مد ظلشین کمیٹی، ہر قومی جلسہ اور ہر قومی ادارہ میں کامریڈ اور الہلال کی مجرانہ تحریروں کے اثرات رونما ہو رہے ہیں۔ آزادی کی تحریک کا بگل بج چکا ہے۔ "وفاداری حکومت" اور "مطالبۂ حقوق" کے درمیان پوری شد و مد کے ساتھ یہی! طاقت آزمائی ہو رہی ہے۔ ایک طرف سب کے سب پرانے لیڈر ہیں۔ یعنی وہ آقا جن کی زبانیں اس وقت تک قانون کا حکم رکھتی ہیں۔ اور دوسری طرف باغی" ابو الکلام اور شوریدہ سر محمد علی مع اپنے چند نو عمر رفیقوں کے ان گنے چنے چند رفیقوں میں آپ کو باعتبار ظاہر جو سب سے زیادہ بلند نظر آ رہا ہے۔ اور بلحاظ باطن وہ وہی پرانا گول کیپر ہے۔ تصدق احمد خاں شروانی علیگڈھ کا گریجویٹ اور لندن سے ڈبا ہوا تازہ وارد بیرسٹر۔!

آج سے محمد علی "جو تحریک اٹھاتے چاہے وہ کالج اور یونیورسٹی کی اصلاح کی ہو۔ یا جنگ بلقان کے چندہ کی۔ یا قوم و ملت کی آزادی کی۔ تصدق شروانی سب میں سب سے پیش پیش۔ شیر دل جنرل کا ایک شیر دل لفٹنٹ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء کا وہ ہنگامہ خیز تحریک خلافت و ترک موالات شروع ہوتی ہے جس نے سارے ملک کو اس سرے سے اس سرے تک ہلا ڈالا! تصدق اس وقت تک اچھا خاصا بیرسٹر ہو چکے تھے۔ اور اپنے پیشہ میں نامور اور کے خوشحال بیشتر ہی سے تھے۔ اور اب نوابی شان کی رئیسانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ قوم کے سرداروں کا حکم ہوا۔ کہ پریکٹس چھوڑ دو۔ بڑھتی ہوئی آمدنی لیے موالات ترک کر دو۔ جو سر اس حکم کے آگے سب سے پہلے جھکے ان سرفروشوں میں ایک یہ بھی تھے۔

غالباً ۱۹۲۲ء تھا۔ کہ علی گڈھ میں عدالت کے سامنے ایک بڑا ہجوم ہوا۔ شروانی ہنگامہ فرو کرنے گئے۔ پولیس اور مقامی حکام کو دل کے بخار نکالنے کا موقع ہاتھ لگا۔ دھر پکڑے گئے۔ الٹا الزام اشتعال انگیزی لگا۔ گئے تھے آگ بجھانے مجرم آگ کے قرار پائے۔ اور وہ جس کا کام قصور واروں کو چھڑانا اور خطا کاروں کو رہائی دلانا تھا۔ اب خود بے جرم و بے خطا قید فرنگ میں اسیر محبوس تھا! ــــــــ قید اور پھر سخت غالباً کچھ روز کے لئے قید تنہائی تھی۔

چھوٹے اور پھر پکڑے گئے۔ آزاد ہوئے اور پھر جکڑے گئے۔ وہ زندگی کتنی کٹھی جو نے کر آئے تھے۔ لیکن بہر حال جو کچھ بھی لکھا کر لائے تھے بس سب اسی الٹ پھیر میں گزاری۔ اکثر دیکھئے تو علی گڈھ میں ضلع کی عدالتوں میں ہیں۔ الہ آباد میں صوبہ کی عدالت العالیہ کے نامور ایڈووکیٹ ہیں۔ اور دوسروں کی بگڑی ہوئی بنا رہے ہیں۔ موتی لال کے ہمسر اور جواہر لال کے شریک و رفیق ہیں۔ کانگریس کو اپنے اشاروں پر چلا رہے ہیں۔ اور کبھی معلوم ہوا کہ بس دل کو کچھ بھی بھائی۔ موٹر کار، نفیس مہری اور دلکشا پائیں باغ سب چھوڑ چھاڑ چوروں اور اٹھائی گیروں کی صف میں ملی کھپی جانگیا پہنے کھڑے ہیں۔ نقب زنوں اور گرہ کٹوں کی صف میں چکی پیس رہی ہے اوڑھے پہنے جیل کی کوری زمین پر پڑے ہوئے ہیں۔ بلند ہوا اقبال سرکار تاجدار کا! جوہر شناسی اسے کہتے ہیں۔ اقدر دانی اس کا نام ہے ہندوستان کی سرزمین کو کبھی کیوں ایسی خوش مذاق نکتہ نواز۔ قدر شناس۔ اور ... سے واسطہ پڑا ہوگا!

مرنے والا مر چکا۔ ... والے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ کتنے ایسے ہوں گے جو ایسے امتحان میں ثابت قدم نکلیں۔ یہاں باپ نے تعلیم میں ہزارہا روپیہ بے دریغ اسی دن کے لئے اٹھائے تھے۔ کالج میں ارمان دل ہی میں تھے۔ ولایت اسی کی خاطر گئے تھے بچپن کے ساتھی، اور نوجوانی کے دوستوں میں آج کوئی جج تھا۔ کوئی ہائی کورٹ کا جج۔ کوئی ہزاروں روپیہ کا، یہ نہ تھا کہ ہزاروں لٹا رہا تھا۔ کوئی صوبہ کا منسٹر، کوئی ایگزیکٹو کونسلر۔ کیا اس غریب کی قسمت میں یہی دن کاٹنے تھے۔ اور دنیا نے ... عمر تیر کر دی تھی۔ اس کے پہلو میں دل کی جگہ کوئی لوہے کا ٹکڑا تھا۔ اس کے دل میں امنگیں باقی نہ رہی تھیں۔ کیا وہ بھی کوئی ہندو سنیاسی یا مسیحی راہب بن چکا تھا۔ کیا اس کی بیوی بچے دوست عزیز بھائی بند نہ تھے۔ کیا ان سب کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے سہنے۔ دنیا کا چین عیش اور زندگی کے سکھ اٹھانے کی آرزوئیں دل میں مردہ ہو چکی تھیں۔؟ کیا اس کے بشری جذبات کا سر چشمہ خشک ہو چکا تھا۔ تکلیف اس کے لئے تکلیف اور راحت اس کے لئے راحت رہ ہی نہیں گئی تھی۔؟ ہو سکے تو سوچنے والے سوچیں۔

شرافت کے امتحان کا اصلی وقت اختلاف و مخالفت کے موقع پر آتا ہے۔ یوں تو جب تک دوستی و یک دلی ہے سبھی اچھے نظر آتے ہیں۔ محمد علی سے شروانی کا سیاسی اختلاف ۱۹۲۸ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ روز بروز بڑھتا گیا۔ ادھر آغاز ۱۹۲۸ء میں مولانا کی مالی حالت اس درجہ ابتر ہو گئی کہ دیکھنے والے کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ صبح کی شام اور شام کی صبح کیونکر ہوگی۔ مولانا کی لاعلمی میں دو چار نیاز مندوں نے سر جوڑ کر یہ طے کیا کہ مخصوص مخلصوں سے کچھ ماہوار رقمیں جمع کر دی جایا کریں۔ نام پیش ہوئے۔ [illegible]

سلسلہ کناوہ
نواب محمد یوسف خاں (آف راجپور)
حسن خاں
محمود خاں (سلسلہ بلونہ)
محمد خاں
رحمت خاں (سلسلہ منقطع)
عبداللہ خاں (مورث اعلیٰ)
ننھے خاں
مبارز خاں (مبارک خاں)
شاہ محمد خاں
آزاد خاں
الہ داد خاں
دلیل خاں
اعظم خاں
رشید خاں
نصرت خاں لاولد
نجیب خاں
خدا بخش خاں
حسن علی خاں
غلام مرتضیٰ خاں
نواب صدر یار جنگ
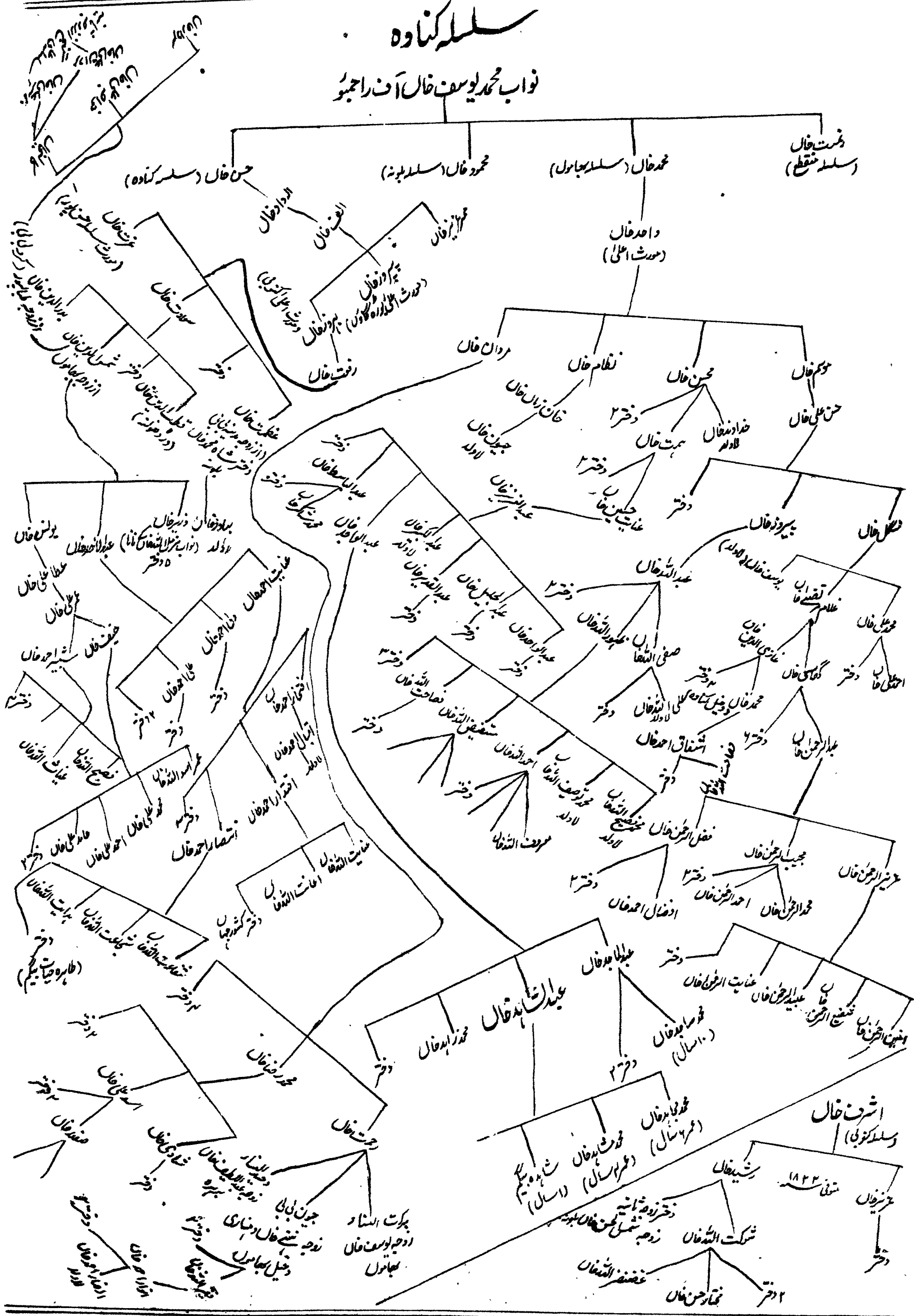
نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم کی ذاتی حالات
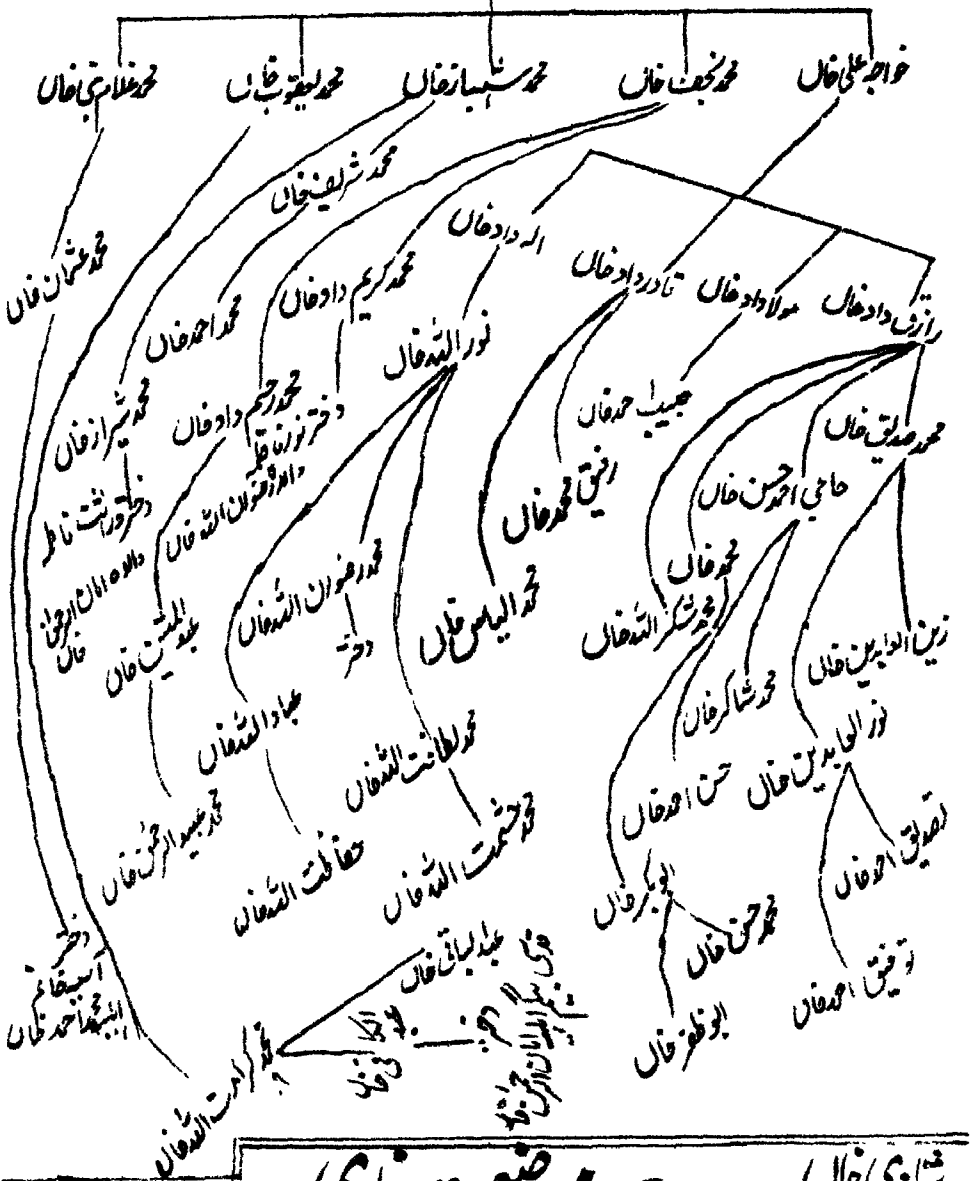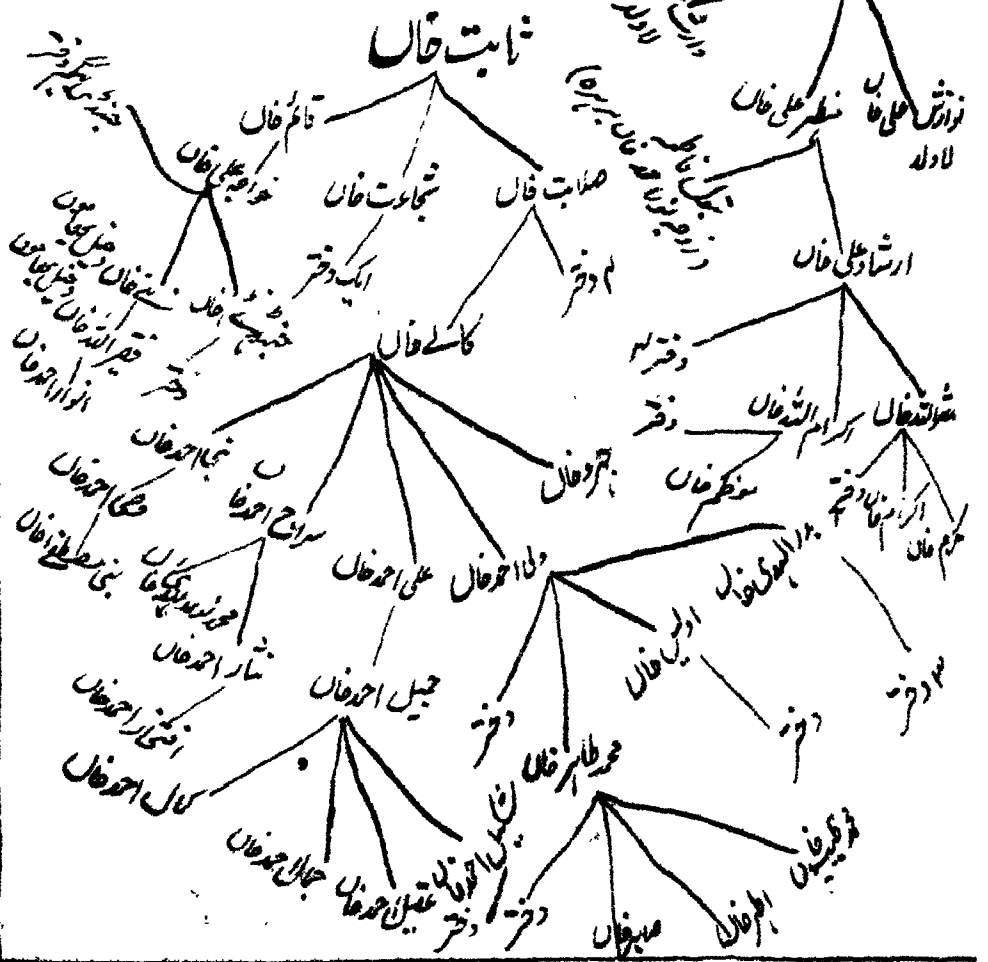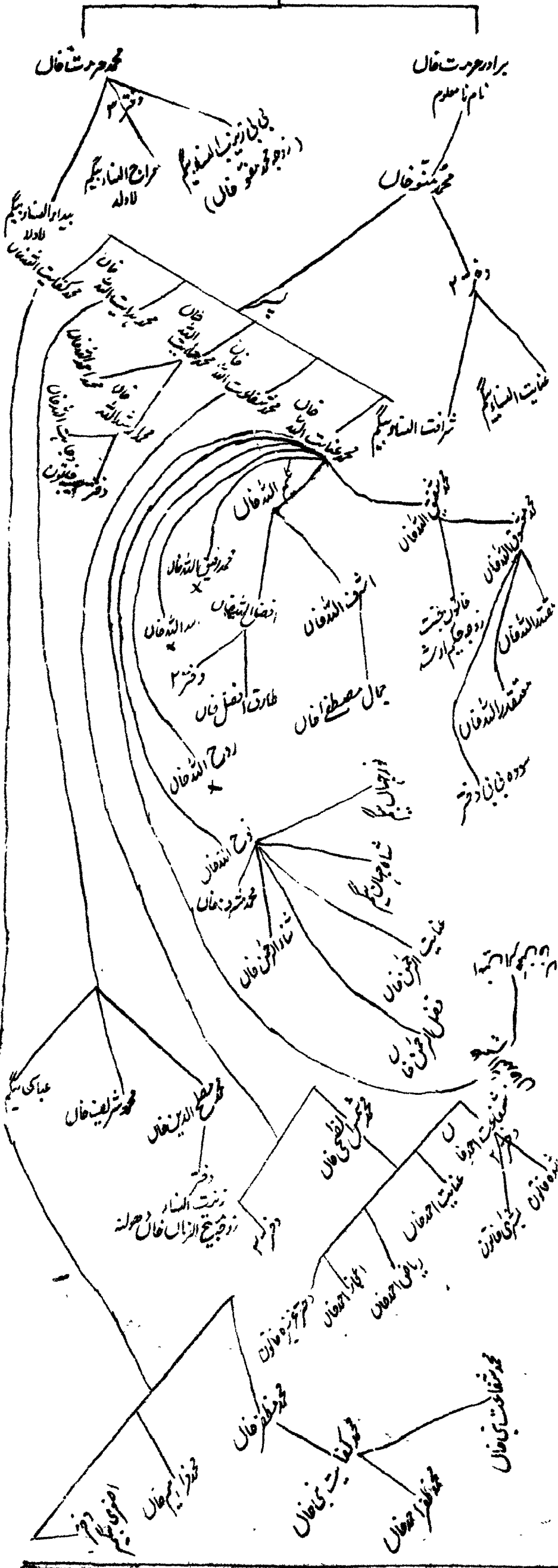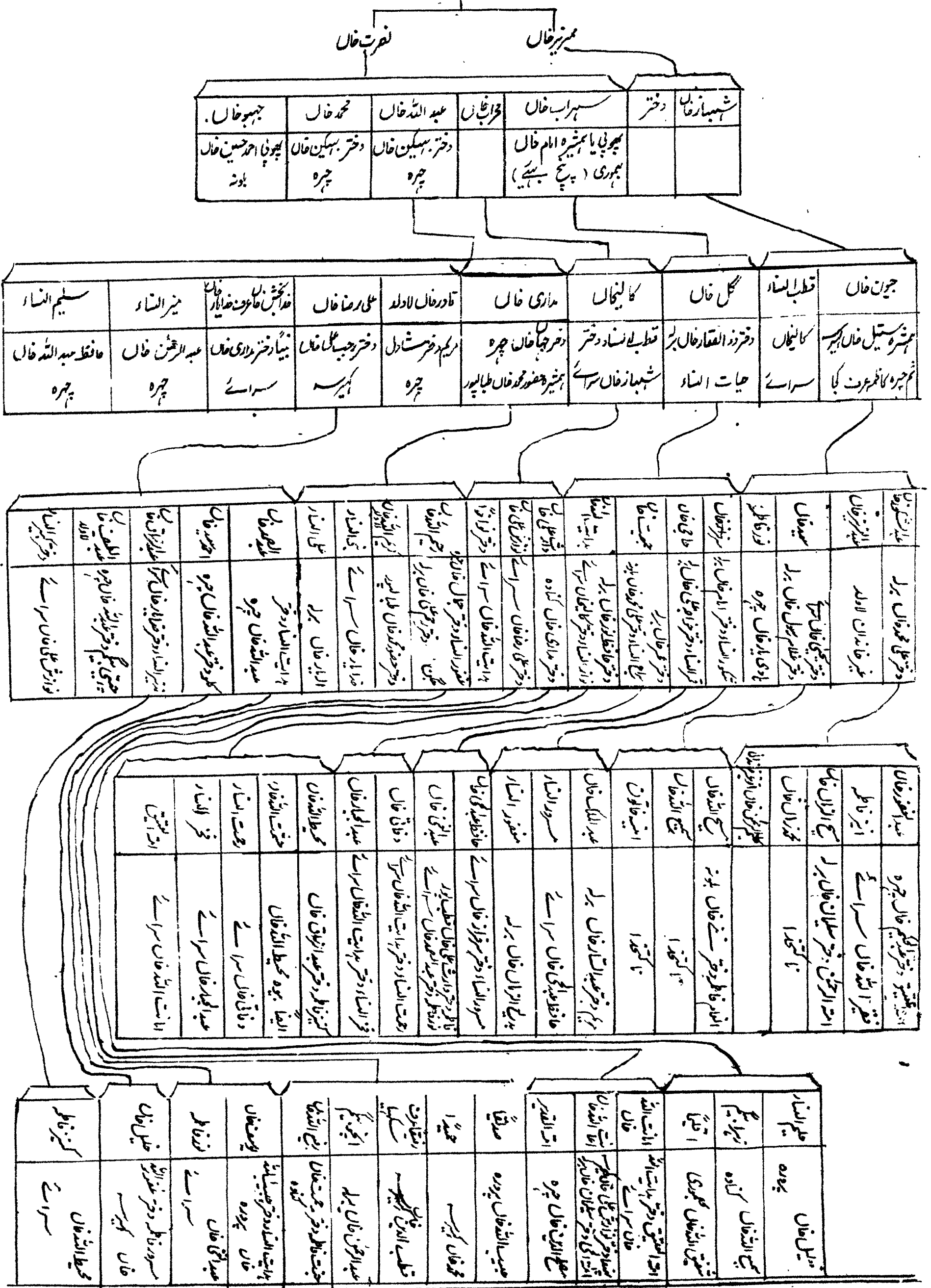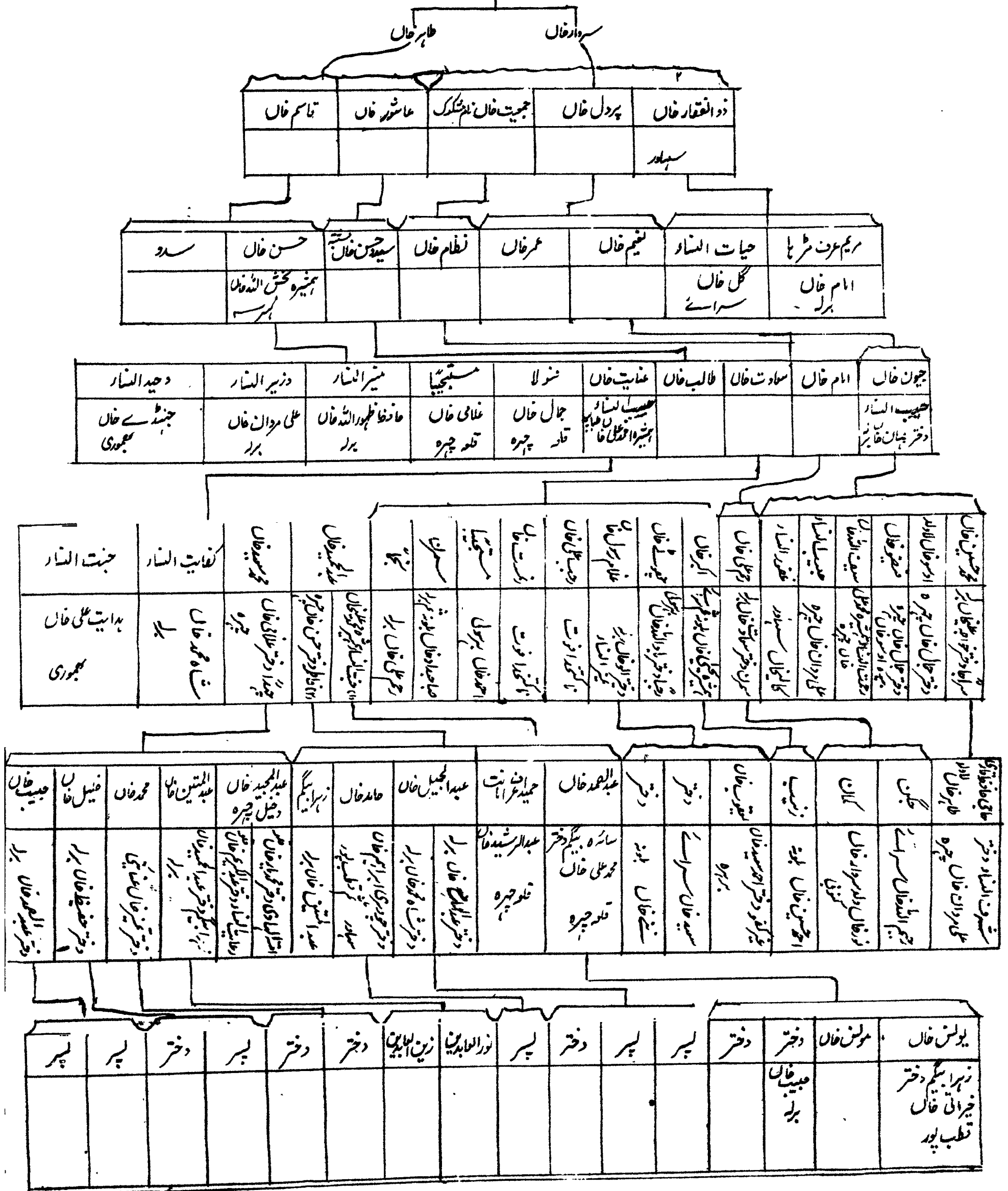
(ایم۔ بی شروانیہ۔ مالکہ اخبار جمہور علی گڑھ)

خیال ہی نہیں بلکہ پوری توقع تھی کہ محترمہ رحیلہ خاتون شروانیہ اپنے اس عظیم المرتبہ خاندانی بزرگ کے متعلق خیالات کا اظہار کر کے صنف نازک کی طرف سے حق نمائندگی ادا کریں گی۔ مگر موصوفہ نے پاکستانی ہو کر ہندوستان سے متعلق اپنے علمی فرائض کو بھی فراموش کر دیا مجبوراً یہ فرض میں خود ادا کر رہی ہوں۔

نواب صاحب مرحوم کے ذاتی حالات ضمنی طور پر تو مختلف مضامین میں آ گئے تھے تفصیلی حالات کسی نے نہیں لکھے تھے۔ میں نے مختلف مقامات سے ان کو جمع کر کے یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیادہ حصہ مولانا عبد الشاہد خاں شروانی کے اس مقالہ سے لیا گیا ہے جو مجلہ "مصنف" علی گڑھ (جنوری ۱۹۴۶ء) میں شائع ہوا ہے۔ کہیں کہیں محو و اثبات اور حذف و اضافہ سے بھی کام لینا پڑا ہے۔

پیدائش و تربیت و تعلیم

یوں تو اس نسل میں ہر دور میں ایک سے بڑھ کر ایک جوہر قابل ہوتا رہا۔ لیکن نواب صدر یار جنگ بہادر ڈاکٹر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی ذات گرامی سب پر فوقیت لے گئی۔ باز خاں کا تہور و تدبر، داؤد خاں کی دیانت و صداقت، عنایت اللہ خاں کی علم دوستی و دوست نوازی، عبد الشکور خاں کی شفقت و سخاوت، قدرت نے ایک ذات میں جمع کر کے

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کا مصداق بنا دیا تھا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ ۲۸ شعبان المعظم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء [illegible] اپنے آبائی قلعہ بھیکن پور میں بوقت صبح پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد محمد تقی خاں صاحب اپنے عم زاد بھائی حاجی غلام احمد خاں پدر بزرگوار نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں کی طرح کاروبار ریاست سے بے تعلق رہتے تھے۔

اپنی دلچسپی کے لئے آپ نے بھیکن پور سے چار فرلانگ کے فاصلہ پر جانب شرق موضع کھلاولی میں بلند مقام پر ایک قلعہ بنوایا جس کا نام ہونہار بلند اقبال صاحبزادے کے نام پر حبیب گنج رکھا۔ جو اب سارے ہندوستان میں اسی نام سے مشہور ہے۔ قلعہ کے متصل ہی وسیع و عریض باغ لگایا۔ اس کے دیکھنے سے موصوف کے سلیقہ اور نفاست پسندی کا پتہ چلتا ہے۔ دو چار قلعوں میں اس زیب و زینت اور شان و شوکت کا چمن نظر نہیں آتا۔ اس میں پہنچنے کے بعد انسان کچھ دیر کے لئے دنیا و مافیہا سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ روشوں پر دو رویہ رنگا رنگ پھولوں کے گملے گلاب و بیلا وغیرہ کے جدا جدا تختے کچھ عجیب بہار پیدا کئے ہوئے ہیں۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم کی خوش ذوقی نے اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ اس چمن کے وسط میں وسیع حوض اور اس کے کنارے پر خوبصورت بارہ دری دلکش مناظر پیش کرتے ہیں۔

حسب دستور شرفائے قدیم پانچویں سال میں آپ کی بسم اللہ ہوئی۔ حضرت مولانا عبد الغنی خاں صاحب فرخ آبادی، استاذ العلماء حضرت مولانا لطف اللہ صاحب علیگڑھی، حضرت مولانا شیخ حسین عرب محدث بھوپالی جیسے اکابر علماء و اعاظم فضلاء سے کسب علم و استفادہ کا موقع ملا۔

انہیں بزرگوں کی توجہ اور دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ نصف صدی سے مشاہیر ہند کی پہلی صف میں آپ کا نام نامی نظر آتا تھا۔

انگریزی تعلیم بھی انٹرنس تک تھی پہلے حاجی عبد الرشید خاں مرحوم علیگ سے پھر سینٹ جانس کالجیٹ اسکول آگرہ میں انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ورزش اور کھیلوں میں ڈنڈ۔ مگدر، لکڑی، بنوٹ، شہسواری، تفنگ اندازی سے شوق رہا۔

ذوق ادب و مطالعہ کتب

بچپن ہی سے مطالعہ کتب اور شعر و سخن کا شوق رہا۔ مطالعہ کتب کی وجہ سے کتابوں کے جمع کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ جس نے بڑھ کر کتب خانے کی شکل اختیار کر لی۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر فرماتے تھے، امیر احمد صاحب امیر مینائی سے مشورۂ سخن اردو فرماتے رہے حسرت تخلص فرماتے تھے۔

کتب خانہ!

علم و ادب کے ذوق نے کتب خانہ کی شکل اختیار کی۔ حبیب گنج میں ایک مستقل وسیع عمارت کتب خانے کے لئے علیحدہ ہے اس وقت سات ہزار سے زائد کتابیں ہیں تعداد کتب کے اعتبار سے تو کتب خانہ کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ البتہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان میں اپنا جواب آپ ہے مخطوطات میں بعض ایسے نادرات ہیں جو سوائے حبیب گنج کے اس وقت تک کی تحقیقات کے مطابق ساری دنیا میں کہیں نہیں پائے جاتے۔ انہیں میں سے "مونس الاحرار" کتاب بھی ہے۔ جو صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کتاب خانہ کی کتابیں برلن (جرمنی) اور بغداد وغیرہ مقابلہ کے لئے جاتی رہی ہیں خدا کا شکر ہے کہ یہاں کا نسخہ بہتر ثابت ہوتا تھا۔ اس وقت میرے سامنے فہرست کتب نہیں ہے ورنہ نادرات اور خاص خصوصیات نسخے پیش کر کے ان کے متعلق لکھتی۔

کتب خانہ کے نوادر میں محی الدین اورنگ زیب بادشاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ کا خنجر بھی ہے۔ جسے "طرز تکیہ" کہا جاتا ہے۔ اس کی سند بھی کتاب خانہ میں موجود ہے۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے نوادر ہیں۔ اس کتاب خانہ کے متعلق مہمان خانہ بھی ہے۔ اکثر ہندوستان اور بیرون ہند کے محقق آ آ کر تحقیقات کرتے تھے۔ دنوں بلکہ مہینوں رہتے تھے۔ ان کی آسائش و آرام کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔

۱۲۹۹ھ کا اخبار "اسلام میرٹھ" کا فائل بھی مجلد ہو کر کتب خانہ میں موجود ہے۔ جس پر [illegible] مرحوم کے نوٹ بھی ہیں۔ اس اخبار کی تاریخ اجراء "منظر اسلام" ۱۲۹۹ھ ہے۔

شادیاں اور اولاد

آپ کی پہلی شادی ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۱۰ھ میں عم بزرگ حاجی محمد عبد الشکور خاں صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جن سے تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ جن میں سے تین خدا کے فضل سے بقید حیات اور صاحب اولاد ہیں۔

دوسری شادی محمد عابد خاں صاحب شروانی مرحوم رئیس بھیکن پور کی ہمشیرہ سے ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ کو ہوئی۔ جلد داغ مفارقت دے گئیں۔ ان سے صرف ایک صاحبزادے ہوئے مولوی مسعود الرحمٰن خاں شروانی۔

تیسری شادی استاذ مرحوم مولانا عبد الغنی خاں صاحب فرخ آبادی کی صاحبزادی زینب بیگم دردانہ عرف نفیس دلہن صاحبہ سے ۲۸ شعبان ۱۳۲۱ھ کو ہوئی۔ جو خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں۔ اور اپنی علمی و ادبی قابلیت کی بنا پر طبقۂ نسواں میں ایک مخصوص امتیازی جگہ کی مالک ہیں۔ علمی و ادبی مضامین معیاری رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ سے سلسلہ توالد جاری نہ ہوا۔

بڑی صاحبزادی [illegible] صاحبہ چودھری احمد اللہ خاں صاحب رئیس سہادر ضلع ایٹہ اور چھوٹی خانم خان بہادر حاجی مولوی یونس خاں صاحب مرحوم شروانی رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ سے منسوب ہیں دونوں ماشاء اللہ کثیر الاولاد ہیں۔

بڑے صاحبزادے خان بہادر حاجی محمد عبید الرحمٰن خاں شروانی ایم۔ ایل۔ اے سابق ٹریژرر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ہیں۔ جن کی خوش خلقی و بذلہ سنجی قابل تعریف ہے۔ انتظام ریاست حبیب گنج بھی زمانہ دراز سے آپ ہی کے سپرد ہے۔ ہر کام خودداری اور محنت سے کرتے ہیں۔ آج کا کام کل پر چھوڑنے کی بہت کم عادت ہے۔

چھوٹے صاحبزادے مولوی مسعود الرحمٰن خاں صاحب شروانی ہیں۔ حضرت مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم و مغفور کے شاگرد ہیں۔ تقریر شستہ اور جوش و خروش سے کرتے ہیں۔

خان بہادر صاحب کے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔ تینوں ناکتخدا ہیں۔ بڑے صاحبزادے کا نام ریاض الرحمٰن خاں ہے اور چھوٹے کا محب الرحمٰن خاں۔ ایک صاحبزادی کا [illegible]

یہ پورا خاندان مشرقی تہذیب معاشرت کے سلسلے میں ایک نمونہ ہے۔ پردے کا سختی کے ساتھ لحاظ۔ لباس و وضع میں قدیم روش۔ نماز و حیا کی حتی المقدور پابندی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

اخلاق و عادات!

آپ کے اخلاق و عادات کے بارے میں جی چاہتا ہے کہ صرف یہ شعر لکھ کر چھوڑ دوں؎

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھے

بزرگوں کی حکایتیں اسلاف کی داستانیں صحابہ کرام کے حالات۔ اسوۂ حسنہ کی تعلیمات لسان الغیب حافظ کے دیوان کے اشعار یہی مجلس کی گفتگو اور یہی محفل کی باتیں۔

کبھی کسی کو تعظیم کے لئے کھڑا نہ ہونے دیتے۔ اکثر و بیشتر سلام میں تقدیم کرتے۔ کوئی ملنے پہنچتا تو اس کی خیریت۔ گھر کی خیریت دوسرے حالات دریافت کرتے۔ مفید مشورے بھی دیتے۔ بہر حال جب آدمی مجلس سے اٹھ کر جاتا تو یہ حسرت ضرور ساتھ لے جاتا کہ [illegible] کچھ دیر گفتگو کا موقع اور ملتا۔

عقیدہ و بیعت

عقیدہ کے اعتبار سے سنی حنفی تھے حتی المقدور سنت پر عمل اور بدعات سے مجتنب رہتے نماز پنجگانہ جماعت سے مسجد میں ادا کرتے۔ حضرت شاہ مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت و ارادت تھی

نسب نامہ کہیرسہ
مورثان مختلف جنکا باہمی رشتہ معلوم نہیں ہے
بادل خاں
شادی خاں
عادل خاں
امیر خاں
بخش اللہ خاں
ننے خاں
کالیخاں
دختر داؤد خاں
الوا
سہاور
سلسلہ نسب نامعلوم
عیوض خاں
اکبر خاں
بدر الدین خاں
علی رضا خاں
حمق خاں
ظہور اللہ خاں
ارادت خاں
ہدایت اللہ خاں
کفایت اللہ خاں
دختر پردل خاں
دختر اکبر خاں
دختر بخش اللہ خاں
دختر منگل خاں
ناکتخدا فوت
کہیرسہ
حضور محمد خاں
احمد رضا خاں
قطب علیخاں
افضل خاں
رجب علی خاں
دختر
بی بی کمان
دختر
شمس الدین خاں
قطب الدین خاں
احمد سعید خاں
نفقور اللہ خاں
نور اللہ خاں
دختر
دختر کالیخاں
دختر صاحبداد خاں
دختر عیوض خاں
غیر خاندان
حسین خاں
یحییٰ خاں
علی رضا خاں
دختر علی اران خاں
دختر چاند خاں
دختر رحیم اللہ خاں
عبدالعزیز خاں سرائے
دختر وزیر محمد خاں
وزیر محمد خاں عرف بہتیو خاں
دخیل چہرہ
سہاور
سرائے
برلہ
شیر زند خاں
محمد خاں
عبدالستار خاں
عبدالرشید خاں
پسر
پسر
دختر
پسر
محمد شریف خاں
دختر
دختر
دختر
دختر
پسر
حکیم اللہ خاں
نصیر اللہ خاں
دختر علی مردان خاں
دختر رحیم اللہ خاں
دختر بادی یار خاں دخیل
دختر علی مردان خاں
محمود خاں
تراب خاں
سلیم اللہ خاں
احمد یار خاں
دختر قطب علی خاں
دختر محمد خان
شاہجہاں آباد
بہرام پور
چہرہ
سرائے

کچھ دیر ٹہل کر وظیفہ پڑھتے۔ سب سے والپی پر باغ میں جاکر بیٹھتے۔ باغ سے واپسی پر ناشتہ سارے متعلقین کے ساتھ کرتے اس درمیان میں گھوڑوں کو دانہ بھی سامنے کھلواتے۔ کبوتروں کی خاص تعداد جمع ہو جاتی ان کو باسی روٹی ڈالی جاتی۔

کوئی ملاقات کے لئے آجاتا تو ناشتہ کے بعد ایک گھنٹہ تک ملاقاتوں کا سلسلہ رہتا اس کے بعد کتب خانے تشریف لے جاتے، وہاں ڈھائی تین گھنٹے تحریر و مطالعہ میں صرف ہوتے۔ ریاستی کام یا کتب خانہ سے غیر متعلق کام وہاں نہیں کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی غیر متعلق معاملہ پہنچ جاتا تو ناخوشی کا باعث ہوتا۔ اور بنتا کام بگڑ جاتا۔ کبھی کتب خانہ جانے سے قبل اور کبھی بعد حویلی بھی جاتے۔

کتب خانہ سے واپسی پر کچہری کرتے جس میں ریاستی معاملات طے ہوتے کہ اس کرسی پر پہنچ کر وہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نہیں ہوتے بلکہ رئیس اعظم حبیب گنج ہوتے جو اجنبی شخص کتاب کنندہ فی الکتب منشرح الشان سے مل کر آیا ہے اب کچہری میں آکر یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی ذات گرامی تھی جس سے ابھی مل چکا ہوں اس کرسی پر "الناس علی دین ملوکہم" کا پورا مظاہرہ ہوتا۔ حکومت مسلط کے رائج نظام کی مجبوراً آپ کو پیروی کرنا پڑتی۔

کچہری سے فارغ ہو کر کھانا تناول فرماکر قیلولہ فرماتے۔ اس کے بعد نماز ظہر مسجد میں ادا کر کے تلاوت قرآن پاک کرتے۔ تلاوت کے بعد چائے نوشی اور مطالعہ ڈاک، پھر نماز عصر اس کے بعد کچہری۔ پھر حویلی جاکر باغ میں مغرب تک نشست رہتی۔ مغرب کی نماز ادا کر کے ہم جلیسوں کی صحبت گرم ہوتی۔ پھر کھانا تناول کر کے نماز عشاء ادا ہوتی۔ عشاء کے بعد کچھ دیر کے لئے محفل جمتی جس میں دیوان حافظ کے اشعار کا دور یا کوئی دوسرا علمی مکالمہ رہتا۔ اس کے بعد آخر شب تک استراحت۔

خیرات و مبرات

ماہانہ وظائف۔ یتامیٰ و بیوگان، مسافران و مساکین اور فروخت شدہ [illegible] پر ایک مستقل رقم صرف فرماتے۔ مہمانوں کی خاطر الگ تھی۔ اور صبح کی نماز کے بعد مسجد سے نکل کر ہر مسافر کو حسب مراتب کچھ رقم دے کر رخصت کرتے۔ اس کے لئے ایک مخصوص رقم مؤذن مسجد کے پاس رہتی۔ حیدرآباد سے جو سات سو روپے پنشن کے آتے وہ صرف مصارف خیر پر [illegible] خرچ کئے جاتے۔ مقامی [illegible]

سپاہیوں کے ذریعہ تقسیم کئے جاتے۔ آپ نے اپنی ساری جائداد وقف علی الاولاد کر دی اس میں بارہ فیصدی مصارف خیر اور چھ فیصدی مصارف کتب خانہ کے لئے وقف کر کے زاد آخرت مہیا کر لیا۔ غرض آپ کی ذات گرامی خاندان اور ملک و ملت کے لئے باعث فخر و قابل تقلید ہے۔

نواب صاحب مرحوم کی وفات پر حبیب گنج ۲۴ اگست ۱۹۵۰ء میں اداریہ تعزیت مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی نے لکھ کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا تھا۔ "حادثۂ فاجعہ" کے زیر عنوان خبر وفات دی گئی تھی۔ وہ نقل کی جاتی ہے تاکہ ناظرین کرام بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

حادثۂ فاجعہ!

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمن خاں شروانی ایک ہفتہ کی شدید علالت کے بعد ۱۱ اگست سنہ ۱۹۵۰ء مطابق ۲۶ شوال المکرم سنہ ۱۳۶۹ھ بروز جمعہ صبح ۷ بجکر ۴۰ منٹ پر ۸۴ سال کی عمر میں سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف روانہ ہوئے

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

معالجین میں حکیم شبیر احمد خاں شروانی، حکیم عبداللطیف اور ڈاکٹر حفیظ الرحمن میڈیکل افسر مسلم یونیورسٹی تھے بعد دیگرے حکیم ظفر احمد خاں دہلی سے اور ڈاکٹر عبدالحمید لکھنؤ سے آکر معائنہ کر گئے تھے۔ امراض میں افاقہ تو ہوتا تھا لیکن کمزوری میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا تاآنکہ وہ سبب موت بن گئی۔ انتقال سے ۵ منٹ پہلے تک باتیں کرتے رہے منہ دھلوایا مسواک خود کیا۔ بڑے صاحبزادے مولوی محمد عبیدالرحمن خاں شروانی نے زمزم لگایا یا پلائی۔ ان سب مراحل کے بعد باتیں کرتے کرتے روح جسد عنصری سے پرواز کر گئی۔ ایک ہفتہ سے زیادہ علالت کا سلسلہ رہا بعض وقت شدت کے ساتھ بے ہوشی بھی ہوتی تھی لیکن انگلیوں میں پڑی ہوئی تسبیح کی وجہ سے غفلت نہ تھی باتوں میں بھی زیادہ تر خدا اور رسول کا ذکر رہتا تھا دوران علالت میں ایک دن دریافت کیا کہ آج کون دن ہے بتایا گیا منگل اس پر اظہار افسوس کرتے رہے کہ افسوس جمعہ نکل گیا۔ اس کے تین دن کے بعد جمعہ کا سورج طلوع ہوتے ہی پایا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ غفلت کے اوقات کے سوا عبادت کا پورا خیال رکھا جب تک بیٹھنے کی طاقت رہی لیٹ کر کچھ کھانا نہ دوا استعمال کی بے بھی پلنگ پر بیٹھے رہے جب طاقت نے جواب دیا اور مجبور لیٹ کر فرمایا کہ سے عزاء اقتدا کی۔

آپ کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں ایک

بیوہ پسماندگان میں چھوڑے ہیں پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں اور پرنواسے نواسیوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ درجن ہے آپ کے جلیس صاحب ملا محمد جو عمر میں مرحوم سے چند سال بڑے ہیں اور جو زندگی کے تمام دوروں میں مرحوم کے رفیق تھے آج سوگوار ہیں۔ بڑے صاحبزادے مولوی حاجی محمد عبیدالرحمن خاں شروانی ایم۔ ایل۔ اے اور دونوں صاحبزادیوں نے خدمت کی ساری سعادتیں حاصل کیں۔ چھوٹے صاحبزادے مولوی مسعود الرحمن خاں شروانی صدر سے اپنی اہلیہ کے ساتھ کچھوچھہ ضلع فیض آباد میں درگاہ میں مقیم ہیں اور جن کو کئی تار اور خطوط بھی روانہ کئے تھے پدر بزرگوار کی آخری دعاؤں اور خدمت کی سعادت مندی سے محروم رہے۔ انتقال کی خبر آگ کی طرح شہر و مضافات میں پھیل گئی۔ اور نصف گھنٹہ کے بعد تعزیت کرنے والوں کی آمد کا سلسلہ حبیب منزل پر شروع ہو گیا۔ حکام ضلع رؤسا و عمائد شہر اکابر و پروفیسران مسلم یونیورسٹی غربا اور عام لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی خصوصیت سے بہت متاثر نظر آتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی میں مکمل تعطیل ہوئی۔ ۱۲ بجکر ۵ منٹ پر جنازہ فوجی کارمیں سٹی سے روانہ ہوا کہ برات کا گمان ہوتا تھا۔ آگے آگے بھی موٹر تھے اور پیچھے پیچھے بھی موٹروں کی قطار تھی ۱½ بجے نماز جمعہ کے بعد مسلم یونیورسٹی کرکٹ لان پر ہزاروں آدمیوں نے نماز جنازہ پڑھی اکابر یونیورسٹی، اساتذہ، طلبہ بہت بڑی تعداد میں شریک تھے۔ اہالیان شہر بھی کافی تعداد میں پہنچے تھے۔ نماز کے بعد پونے دو بجے جنازہ اسی شان کے ساتھ علی گڑھ سے ۲۶ میل دور خاندانی قبرستان موضع بھوری بزرگ متصل حبیب گنج کے لئے روانہ ہوا۔ ۲¾ بجے پہنچا ہوا معلوم ہوا کہ قبر کی تیاری میں ابھی دیر ہے۔ عیدگاہ کے صحن میں جنازہ رکھ دیا گیا۔ اور قرآن خوانی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

گرد و نواح کے دیہات سے افراد و متعلقین غربا و وابستگان، کاشتکاران و ملازمان ریاست باوجود موسم کی ناخوشگواری اور بروقت اطلاع پانے کے کافی تعداد میں جمع ہو چکے تھے۔

۵ بجکر ۴۰ منٹ پر پورے ساڑھے گھنٹے کے بعد تحسین و تبریک کے ساتھ یہ آفتاب علم و عمل بھی زمین میں غروب ہوا۔ اور اس طرح ہزاروں من مٹی کے نیچے لاکھوں من وزنی خزانۂ علم کو دفن کر دیا گیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی جنازہ کے پاس ہی بیٹھے ہوئے سید محمد حسن ایڈیشنل رجسٹرار، قاضی عزیز الدین احمد سرشتہ دار، مفتی عبداللطیف اور مولانا بدر الدین علوی بھی آخری منزل تک شریک رہے آخر الذکر دونوں حضرات قدیم رفقاء میں سے

تھے۔ اور آخری منزل تک حق رفاقت ادا کرتے رہے۔

دوسرے روز ۱۲ اگست سنہ ۱۹۵۰ء کو ۱۲½ بجے اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وائس چانسلر کی صدارت میں تعزیتی جلسہ ہوا۔

تلاوت قرآن کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پندرہ منٹ تقریر کی۔ جس میں نواب صاحب مرحوم کے فضائل علم و عمل بیان کرتے ہوئے مرحوم کو ایک بڑی شخصیت بتایا۔ اور اساتذہ و طلبا کو اپنی شخصیت بنانے کے لئے نواب صاحب کا عزم و حوصلہ پیدا کرنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ نواب صاحب کا اس یونیورسٹی سے بڑا پرانا تعلق تھا۔ اس تعلق کی بنا پر پرانے رفیق کی جدائی کا جتنا بھی ہمیں غم ہو کم ہے۔ لیکن یہ غم ایسا ہے جس میں مسرت بھی پنہاں ہے ہمیں ان کی یاد اپنی شخصیت بنانے میں مدد دیتی رہے گی۔

مرحوم نے اپنے ماحول کے خلاف اپنے لئے ایک راہ متعین کی اور اس پر چل پڑے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ان کی شخصیت دوسروں کے لئے مشعل راہ بن گئی۔ انھوں نے اپنے لئے ایک راہ تجویز کر لی تھی۔ لیکن وہ دوسروں کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔ بلکہ مدد پہونچاتے تھے۔ تقریر کے بعد حسب ذیل تجویز پاس ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اساتذہ طلبہ اور اسٹاف کا یہ اجلاس متفقہ طریقہ سے نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمن خاں شروانی کی رحلت پر اظہار افسوس اور پسماندگان کے لئے دعائے صبر کرتا ہے۔

مرحوم دینیات کے ڈین اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے۔ اور یونیورسٹی کے بانیوں میں سے تھے۔ آپ سابق ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے ٹرسٹی اور مسلم یونیورسٹی کے بنیادی ممبر تھے۔ مرحوم مشرقی علوم کے بڑے ماہر اور موجودہ زمانہ کے ممتاز علماء میں سے تھے۔

یہ اجلاس دست بدعا ہے کہ خدا ئے بزرگ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔

آخر میں کھڑے ہو کر سب نے فاتحہ پڑھی ۱۳ اگست سنہ ۱۹۵۰ء کو دارالریاست حبیب گنج بھیکم پور۔ کرلس کالج علی گڑھ۔ جامع مسجد علی گڑھ مسجد راحت منزل میرس روڈ اور جامع مسجد مسلم یونیورسٹی میں فاتحہ سوم ہوا۔

[illegible]

آپ کے پیر و مرشد بڑے پایہ کے بزرگ اور قطب وقت تھے۔ علم و فضل میں بھی یگانہ تھے۔

مضمون نگاری و تصانیف

عنفوان شباب ہی سے فطری صلاحیتوں کی وجہ سے ملک کے مشہور معیاری اخبارات و رسائل میں مضمون نگاری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ سنہ ۱۸۸۳-۸۴ء میں مولوی غلام محمد خاں تپش کے اخبار "مشیر قیصر لکھنؤ" سے ابتدا ہوئی۔ مسٹر بانٹ کی کتاب فیوچر آف اسلام (مستقبل اسلام) مترجمہ لسان العصر اکبر الہ آبادی پر تبصرہ شائع ہوا۔

اسی طرح "الندوہ" "اودھ اخبار" "آزاد" "دلگداز لکھنؤ" "شحنہ اخبار آگرہ" "البشیر اٹاوہ" "سہ روزہ گزٹ" "اکمل اخبار نظام المشائخ دہلی" "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" "معارف" "علی گڑھ میگزین" "خاتون" "اردوئے معلیٰ" "علی گڑھ" "مخزن لاہور" "زمانہ کانپور" "معارف اعظم گڑھ" "اردو اورنگ آباد" وغیرہ میں مسلسل مضامین شائع ہوتے رہے۔ رسالہ حسن حیدرآباد میں سنہ ۱۸۹۱-۹۲ء میں شاہ بابر پر مضمون شائع ہونے پر اشرفی کا انعام بھی حاصل کیا۔ آخر میں معارف اعظم گڑھ اور مصنف علی گڑھ جیسے معیاری رسائل میں کبھی کبھی رشحات قلم شائع ہوتے رہتے تھے۔

عرصہ تک الندوہ لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے اور کانفرنس گزٹ علی گڑھ کے مستقل نگراں تھے۔ تقریباً دو درجن تصانیف ہیں۔ جن میں علمائے سلف اور نابینا علما تبری کامیاب کوشش ہے۔ ملک میں ان دونوں کا پورے طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ تقریباً سب تصانیف دو دو مرتبہ شائع ہو چکی ہیں۔ اہل علم اور قدردان حضرات کو مفت عنایت فرماتے تھے باہر بھیجنے میں مصارف ڈاک بھی خود برداشت کرتے تھے۔

مضمون نگاری کا شوق انگریزی کے استاد حاجی عبدالرشید خاں علیگ مرحوم کی بہتر تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہوا۔ اردوئے معلیٰ اور گلزار داغ سے مطالعہ کی ابتدا ہوئی۔

علمی و تعلیمی خدمات

ادبیوں علمی و تعلیمی اداروں کے نہ صرف رکن و سرپرست رہے بلکہ دامے درمے سخنے ہر طرح حصہ بھی لیا ہے جس کی شہادت ان اداروں کی رودادیں دیتی ہیں۔

(۱) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔ (۲) الہ آباد یونیورسٹی۔ (۳) یو۔ پی ہسٹاریکل سوسائٹی (۴) انجمن ترقی اردو (۵) مسلم گرلز کالج علی گڑھ (۶) وقف کرنال۔ (۷) وقف دادوں (۸) اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ۔ (۹) انجمن حمایت اسلام لاہور (۱۰) طبیہ کالج دہلی (۱۱) دار المصنفین اعظم گڑھ۔ (۱۲) ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ (۱۳) دار العلوم دیوبند۔ (۱۴) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ۔ (۱۵) جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ (۱۶) دائرۃ المعارف حیدرآباد۔ (۱۷) مدرسہ نظامیہ حیدرآباد۔ (۱۸) مجلس اشاعت العلوم و خزانہ حیدرآباد (۱۹) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ (۲۰) کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد۔

جہاں تک میرے حافظہ اور معلومات نے کام کیا یہ وہ ہندوستان کے مشہور و معروف ادارے ہیں جن سے نواب صدر یار جنگ بہادر کا قدیمی تعلق تھا۔ اکثر اداروں کے صدر و سکریٹری بھی رہے تھے۔

جامعہ عثمانیہ کے پہلے وائس چانسلر سنہ ۱۹۱۷ء میں ندوۃ العلماء کے جوائنٹ سکریٹری نیز نواب محسن الملک محمڈن کالج کے ٹرسٹی۔ کمیٹی تعلیم دینیات کے اہل السنۃ الجماعۃ کے سکریٹری بھی رہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس امراوتی (برار) میں سکریٹری منتخب ہوئے اور جون سنہ ۱۹۴۹ء تک برابر رہے۔ ان اداروں کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے سے کیسی کیسی اہم خدمات انجام دلائیں۔

لیس للّٰہ بمستنکر !
ان یجمع العالم فی واحد

حقیقت یہ ہے کہ خاندان شروانی میں ایسی جامع صفات ہستی آج تک پیدا نہ ہو سکی اور نہ آئندہ ہی کوئی توقع ہے۔ ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مشاہیر ہند کی صف اول میں نواب صدر یار جنگ کا نام نامی جلی حرفوں میں نظر آ رہا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے خاندان نے صرف رئیس کی حیثیت سے دیکھا۔ اور بہتر تھا کاش وہ اس نوعیت سے دیکھتا جس کے وہ مستحق تھے۔ انھیں خدمات علمی کو دیکھ کر مسلم یونیورسٹی نے سنہ ۱۹۴۳ء میں دینیات کی اعلیٰ اعزازی ڈاکٹری کی ڈگری عطا کی۔

شروانی اسکول چھرہ کے ۹ سال تک سکریٹری رہے۔ اس اسکول نے کیسے کیسے نامور افراد پیدا کئے۔ شروانی برادران کو کون نہیں جانتا۔ ہندوستان کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کے چمکے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند بھی شروانیوں کو روشناس کیا۔ اس خاندان کا ہر فرد آج اپنے آپ کو شروانی کہنے اور لکھنے میں اس لئے فخر محسوس کرتا ہے کہ ان میں کا ایک فرد لتصدق احمد خاں شروانی بھی تھا۔ جو شروانی بن گیا۔

وہ بھی دل سے چاہتا ہے کہ نام کے آگے یہ نسبت تو کسی طرح لگ ہی جائے۔

انتظام ریاست

۲۴ ربیع الثانی سنہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۸ جون سنہ ۱۹۰۵ء کو نواب صدر یار جنگ بہادر کے والد ماجد حاجی محمد تقی خاں صاحب نے رحلت فرمائی دو سال بعد عم بزرگوار حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب نے بھی ۷ جمادی الآخر سنہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹ جولائی سنہ ۱۹۰۷ء داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اب تک جائداد مشترک ہی تھی۔ منجھلے خاں صاحب ہی انتظام و انصرام فرماتے تھے۔ ان کے بعد ظاہر ہے کہ اس بار کو آپ ہی اٹھا سکتے تھے چنانچہ کچھ دن تک یہ فرض انجام دیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۰ء میں ریاست تقسیم ہوئی۔ اور اپنے حصے پر قابض و متصرف ہوئے۔ والد ماجد کے انتقال کے تین ہفتہ بعد ہی گڑھی سے باہر ۸ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۲۳ھ کو مسجد کی بنیاد قائم کی گئی جس کی تعمیر کا سلسلہ چند سال جاری رہا مسجد اپنی خوشنمائی۔ خوبصورتی۔ نفاست۔ لطافت میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اور اپنے بانی کی خوش ذوقی کا ثبوت دے رہی ہے۔

قیام حیدرآباد

نواب فضیلت جنگ کی رحلت کے بعد صدارت امارت شرعیہ حیدرآباد کے لئے سرکار نظام کی نگاہ انتخاب اس وقت کے مولوی حبیب الرحمن خاں پر پڑی۔ اس عہدہ کے لئے ایسے فاضل کی ضرورت تھی جو سیر چشم، بے لوث۔ نڈر اصول پرست اور واقف صاحب علم باعمل و باتدبر ہو۔ ان صفات کا کامل آپ کے سوا اور دوسرا کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ۲۲ سنہ ۱۹۱۸ء مطابق سنہ ۱۳۳۶ھ میں حیدرآباد جا کر صدر الصدور بنے اور جو اعزاز آپ کے دادا حاجی محمد داؤد خاں نے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کے زمانے میں حاصل کیا تھا۔ وہی دور آصفی میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی سلطنت حیدرآباد سے آپ کو بھی ملا۔ اور ۱۲ سال تک مسلسل خدمات شرعی و اسلامی بڑے دبدبہ اور قابلیت کے ساتھ انجام دیں۔ ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کو سبکدوشی ہوئی۔ ۱۴ جمادی الآخری سنہ ۱۳۴۱ھ مطابق سنہ ۱۹۲۲ء کو نواب صدر یار جنگ بہادر کا خطاب سرکار نظام کی طرف سے ملا۔

حیدرآباد کے اکثر علمی و تعلیمی اداروں کے صدر بنے۔ جاہل قاضیوں اور نااہل میلاد خوانوں کی بڑی سختی سے اصلاح کی۔ خود مجھ سے ایک بار فرمایا کہ قاضیوں کا یہ حالت تھی کہ صحیح طور پر ایجاب و قبول نہیں کرا سکتے تھے۔ جب مسائل نکاح میں امتحان لیا گیا تو کورے نکلے۔ جاہل میلاد خوانوں کا یہ عالم تھا کہ رات بھر گا گا کر اور جھوٹی روایتیں سنا سنا کر وقت ضائع کرتے۔ تاریخ کا دور اعتبار نہ تھا۔ بڑی انتھک کوشش کے بعد صحیح ذوق مسلمانوں میں پیدا کیا۔ محافل میلاد کے طریقے بتائے سینکڑوں مقامات پر مجالس میں اسوۂ حسنہ پر تقریریں کیں۔ لوگوں کو طرز عمل سے ادب ذکر میلاد مبارک اور طریقۂ انعقاد مجلس پاک بتایا۔

اعزا و احباب کو ساتھ لے کر بعض کثیر سنہ ۱۳۴۴ھ میں فریضہ حج ادا کیا۔ حجاز و ممالک اسلامیہ کے علما و صلحا سے ملاقاتیں ہوئیں علمی مجالس میں شرکت رہی۔

نظام الاوقات

انسان و حیوان میں دوسرے فرقوں کے ساتھ پابندی اوقات کا بھی فرق ہوا کرتا ہے اگر اوقات کی پابندی نہ ہو تو انسان و حیوان میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ جانور کے چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہو سکتا۔ اسے کھانے گوبر بیٹ پیشاب کرنے کے سوا اور کام ہی کیا ہے بخلاف انسان کے اس پر کچھ ذمہ داریاں ہیں اسے رات میں آرام بھی کرنا ہے تاکہ صبح کو تازہ دم ہو کر کام پر جا سکے۔ اسے اہل و عیال کی خبر گیری کرنا ہے۔ اس لئے سویرے اٹھنا ہے تاکہ کام پر جانے سے پہلے ضروری اشیاء فراہم کر دے۔ اور پھر مسلمان کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھی ہوئی ہیں۔ اسے ایک طرف مخلوق سے واسطہ رکھنا ہے تو دوسری طرف خالق سے علاقہ کی بھی ضرورت ہے۔

اگر ایک جانب اہل و عیال کی خبر گیری ضروری ہے تو دوسری جانب عبادت مولیٰ بھی فرض ہے حدیث شریف میں آتا ہے۔

"الدنیا سجن المؤمن و جنۃ الکافر" (دنیا مسلمان کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے)

جس طرح قید خانے میں قدم قدم پر پابندیاں ہوتی ہیں کھانا ہو تو گھنٹی پر۔ قضائے حاجت گھنٹی پر۔ سونا گھنٹی پر۔ باہر نکلنا گھنٹی پر اسی طرح اسلام کی طرف سے مسلمان پر پابندیاں ہیں۔ اور ہر عبادت و طاعت کے لئے اوقات مقرر ہیں۔

ضعیفی اور پیرانہ سالی کے باوجود نظام اوقات کی مستقل پابندی قابل ستائش و لائق داد ہے۔ کسی دعوت یا جلسہ میں وقت مقررہ سے دس پانچ منٹ قبل ہی پہنچتے حتی الامکان کبھی وقت سے تاخیر نہیں کرتے تھے۔ فجر کی نماز با جماعت مسجد میں ادا کر کے

نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم

حاجی محمد عبدالشکور خاں رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ

(عم محترم نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم)

(والد ماجد نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم)

بائیں سے دائیں کو :—

(۱) مولوی عبدالوحید خاں برادر نسبتی نواب صاحب مرحوم

(۲) نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم

(۳) مولوی مختار الدین احمد آرزو ایم-اے (علیگ) ریسرچ اسکالر عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

حاجی عبدالکفیل خاں مرحوم

رئیس بلونہ

(تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے صفحہ ۹۳)

خاندانی گروپ

(ناموں کی تفصیل کے لئے دیکھئے صفحہ ۹۳)